

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے ایک سہولت مند کاغذی رسالہ

# رضا ایجنسی

JULY  
2017

ماڈل: فرینہ اعجاز  
میک اپ: روز بیوٹی پارلر  
فوٹو گرافی: موسیٰ رضا



چیف ایڈیٹر

مسالہ محمود

ایڈیٹرز

سعدی محمود جعفری، بلال جعفری

ناشنہ امریکہ، کراچی جعفری

E-Mail: brazeahri@pol.com

ناشنہ UAE، عمیر علی جعفری

E-Mail: saqrabhi@comirates.net.ae

ناشنہ لندن، شہزاد آصف خان

آرٹسٹ: جنید انصار

رداء الجحش

خداوند کائنات

رداء الجحش

پیشہ: ڈی. جی. پی

پیشہ: ڈی. جی. پی

چھاپا



## سلسلے وار ناول

زندگی، پھول، محبت، خوشبو شازیہ مصطفیٰ ۱۶۴  
عشق کی داستاں جدا ریحانہ آفتاب ۱۰  
ستارے ایقان علی

## افسانے

## مکمل ناول

۸۷ جہانہ آفتاب دو دلوں کی عید  
۱۰۰ مصباح مسکان برف ہے  
۱۱۰ شیریں تبسم ۳۲ کرچیاں قمر و شہک نیلما ستارہ  
۱۱۸ آسیہ مظہر چوہدری ۱۲۲ دل کے کھلے گلاب مریم شیراز رمک عید حقیقی خوشیوں  
سباس گل صبح عید

## ناولٹ

۷۰ میری مسکراہٹ ہو تم سعدیہ عابد  
۱۵۰ میرے بخت کا روشن انیتا اختر

جولائی 2017ء

جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 7

قیمت 60 روپے

www.facebook.com/rida.digest

زرگالائے ہند یکتہ رجسٹری

720 روپے

34535726

پبلشر وائیٹر صالی محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔  
مقام اشاعت: ۱۲۹/ ڈی بلاک - 2 - پی - ای - سی - ایچ - سوسائٹی، کراچی

انتباہ:-

ماہنامہ "ردائے اجت" میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فی وی چینل یا ڈراما یا ٹیلی ویژن پر منسلک ادارے کی بھی ناول کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ایلف آئی آر درج کرلوے گا اس لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ "ردائے اجت"۔

## مستقل سلسلے

۲۲۲ ثریا اقبال  
۲۲۵ شہلا مشائق  
۲۰۳ نورین ملک  
۲۱۸ ادارہ

۷ بچن  
۲۰۲ سنگھار  
۲۱۳ اشعار  
۲۰۹ دوستوں کے نام پیغام  
۲۰۶ نورین ملک

ردائے جنت  
ردا کی ڈائری  
ذرا پھر سے کہنا  
خوشبو  
اس ماہ میں





خوشیوں اور محبتوں بھرا امت مسلمہ کا تہوار عید الفطر خوشیوں و محبتوں اور چاہتوں کا پیغام پورے ماہ دین حق پر چلنے والوں کے لیے خوشی کا دن رضائے الہی کی طرف سے رحمتوں کا ایک حسین تقہ۔

زندگی یونہی رحمتوں اور برکتوں میں ہماری بسر ہوتی رہے۔ سب خوش اور آباد رہیں اور تمام راسخ زو قار زمین خدا کرے پھولوں کی طرح سدا بہار رہیں۔ ماہ رمضان گزرتو گیا مگر ابھی ان پر لطف لمحوں کا تاثر باقی ہے۔ یوں تو موسم زرت بدل گئی ہے، جگہ جگہ بادلوں کی ٹولیاں رقص کرتی ہوئی ہوائیں کراچی میں نہ سہی دور دراز شہروں میں جھومتے ہوئے درخت حسین نظارے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کراچی کے اس صحرا میں بھی ابر رحمت برے گا اللہ خبر کرے ہمارے ندی نالوں کی جو طفیانی بڑھی تو شہر کو لے ڈوبے گی۔ حکمران! بانسری بجا رہے ہوں گے۔ خواب غفلت سے جب جھنکیں گے تو شہر ڈوب چکا ہوگا۔ کراچی اور صاحب اختیاران کے دروازے پر بحر کی کا ڈھول پیٹ رہے ہوں گے اور حکمران خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔ سو آپ جاگتے رہیے گا۔ اتنی بے خبری شہر کو لے نہ ڈوبے۔

بجلی پانی گیس نہیں.....! خلق خدا چیخ رہی ہے مگر کان نہیں.....! غلامتوں کے ڈھیر لگ چکے ہیں مگر آنکھ بے بہرہ.....! بصیرت سے محروم حکومت جیسا کیوں پر چلنے والی حکومت ہمیشہ بے بسی کا شکار ہوتی ہے۔ خزانوں کے انبار تلے غربت سسک رہی ہے۔ گاؤں، گٹھوں میں عید کا تصور کیسا دہاں تو ہر دن بھوک اور افلاس کے ڈھیرے ہیں۔ بستی بستی قریہ قریہ ہر سوا اختیار کا عالم! کیا ایسے میں عید منائے کوئی۔ سادوں رت کی بہار دیکھے آنکھ نہ ہاتھوں کی چوڑیاں، ہر دکھ پر آنکھ روئے چھم چھم، جب بادل برسیں کچی منڈیوں پر اور پتے دریالے جائیں انسانوں کو اپنی آغوش میں۔

ہم بہت روئے جب یہ منظر یاد آئے۔ کیسی عید، کیسا سکھ، امیر باراں برساتو اتنا کہ دھل جائیں۔ سارے دکھ اور بہہ جائیں اقتدار کے بھوکے لوگ اور قریہ قریہ بستی بستی، جن کا بول بالا ہو، یارب! بس ایک دن تو اتر کر آدیکھ زمین پر ان بھڑیانا انسانوں کو جن لوگوں نے لوٹ لیا ہے میری بستی کو۔

عید نمبر آپ کو کیسا لگا، سند یہ ضرور لکھیے۔ نئے لکھنے والے ہم سے رابطہ رکھیں۔ ہم انہیں ردا گائیڈ کارنر میں گائیڈ کرتے ہیں کہ افسانہ، ناولت کیسے لکھتے ہیں، جون کی چلا پاتی ہوئی دھوپ میں عید نمبر 2 کی تیاری کس مشکل سے کی گئی ہوگی۔ اس کا تصور صرف وہی کر سکتے ہیں جنہوں نے اسے ترتیب دیا ہوگا۔

آپی



# صالو محمد روايتون

میں پڑھتا ہے تو اس کی مثال اس تحلی کی مانند ہے جو کستوری سے بھرا ہوا ہے۔ اس کا منہ کھلا ہوا ہو اور اس کی خوشبو ہر جگہ مہک رہی ہو اور اس آدمی کی مثال جس نے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی پھر وہ (غافل ہو کر) سوتا رہا تو قرآن کریم اس کے دل میں اس تحلی کی مانند ہے جس میں کستوری بھری ہے (لیکن) اس کا منہ (رسی کے ساتھ) باندھا گیا ہو۔“

(ترمذی، نسائی، ابن ماجہ۔ عن ابی ہریرہ)  
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب تحریر کی اس میں سے سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں مجھ پر نازل فرمائیں جب کسی گھر میں یہ دو آیتیں رات کو تلاوت کی جائیں گی تو شیطان اس گھر کے قریب بھی نہیں آئے گا۔“

(ترمذی۔ عن نعمان بن بشیر)  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس آدمی نے (روزانہ) سورہ کیف (سورہ نمبر 18) کی شروع کی تین آیات کی تلاوت کی وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔“ (ترمذی۔ عن ابی الدرداء)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قرآن کریم میں ایک ایسی سورت ہے جس کی 30 آیات ہیں وہ اس آدمی کے حق میں سفارش کرے گی (جو اس کی تلاوت کرتا ہو) یہاں تک کہ اس کو معاف کر دیا جائے گا۔ وہ سورہ ملک (سورہ نمبر 67) ہے۔“ (ابو داؤد۔ عن ابی ہریرہ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قرآن کریم کے ساتھ وابستگی رکھنے والے سے کہا جائے گا کہ تم قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے جنت کے درجات پر چڑھتے جاؤ اور قرآن کریم کی تلاوت آہستہ آہستہ کرنا جیسا کہ تم دنیا میں آہستہ آہستہ کرتے تھے۔ تمہارا مقام وہ ہے جہاں تم اپنی آخری آیت کی تلاوت کرو گے۔“

(ترمذی، ابو داؤد۔ عن عبد اللہ بن عمرو)  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس آدمی کے دل میں قرآن مجید سے کچھ حصہ نہیں ہے۔ وہ بے آباد گھر کی طرح ہے۔“

(ترمذی۔ عن ابن عباس)  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب سے کہا۔ ”تم نماز میں کیا تلاوت کرتے ہو؟“ تو انہوں نے سورہ فاتحہ کی تلاوت فرمائی (اس پر) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میری جان ہے تو رات، انجیل، زبور اور قرآن مجید میں اس جیسی کوئی اور سورت نازل نہیں ہوئی ہے بلاشبہ اس سورت کی 7 آیت ہیں جس کی بار بار تلاوت ہوتی ہے اور یہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے۔“ (ترمذی۔ عن ابی ہریرہ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرو (اس کے بعد) اس کی تلاوت کرتے رہو۔ یاد رکھو جب کوئی آدمی اس کی تعلیم حاصل کرتا ہے پھر تلاوت کرتا ہے اور اس کو نماز

کفایت کریں گی۔“

(ترمذی، ابوداؤد، نسائی، عن عبد اللہ بن ضعیف)  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس آدمی نے کتاب اللہ سے ایک حرف کی تلاوت کی اس کو اس کے بدلے میں ایک نیکی ملے گی اور ایک نیکی کا ثواب 10 گنا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا اہم ایک حرف سے بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم بھی ایک حرف ہے۔“

(ترمذی، دارامی، عن ابن مسعود)  
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی نے حاضر ہو کر عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تعلیم دیجیے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جن سورتوں کے شروع میں الہ ہے ان میں سے 3 سورتیں تلاوت کرو۔“ اس نے عرض کیا: ”میری عمر زیادہ ہو چکی ہے اور میرے دل پر بھول کا غلبہ ہے اور میری زبان سخت ہو چکی ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”پھر جن سورتوں کے شروع میں حم ہے ان میں سے 3 سورتوں کی تلاوت کرو۔“ اس پر اس آدمی نے پھر وہی بات کہی اور اس آدمی نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کسی جامع سورت کی تعلیم دیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سورۃ اِذَا زُلْزِلَتْ کی تلاوت کا حکم دیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کو ختم کیا (یہ سن کر) اس آدمی نے عرض کیا: ”اس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق و صداقت کے ساتھ معبود فرمایا ہے۔ میں اس میں کچھ زیادہ نہیں کروں گا۔“ اس کے بعد وہ آدمی چلا گیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا: ”یہ آدمی کامیاب ہے۔“

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے صبح کے وقت تین بار اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ پڑھ کر سورہ مشرکی آخری تین آیات تلاوت کیں تو اللہ رب العزت اس کے لیے ستر ہزار فرشتے مقرر فرماتے ہیں جو شام تک اس کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں اگر وہ اسی دن فوت ہوا تو اسے شہداء کی صف میں شامل کیا جائے گا اور جس نے شام کے وقت یہ کلمات پڑھے تو اسے بھی یہی اجر ملے گا۔“

(ترمذی، دارمی، عن معقل بن یسار)  
ایک صحابی سورۃ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَخَذَ کی تلاوت کر رہے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا اور فرمایا: ”(تم پر) واجب ہوگئی۔“ میں نے پوچھا: ”کیا واجب ہوگئی؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جنت واجب ہوگئی۔“

(ترمذی، نسائی، عن ابی ہریرہ)  
میں ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محفہ اور ابواء مقام کے درمیان جا رہا تھا ناگہاں ہمیں سخت آندھی نے گھیر لیا اور اندھیرا ہو گیا۔ اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھنا شروع کر دیا اور فرمایا: ”اے عقبہ تم بھی ان دونوں سورتوں کے ساتھ پناہ طلب کرو۔ کسی پناہ طلب کرنے والے کے ان دو سورتوں جیسی اور کوئی چیز نہیں۔“

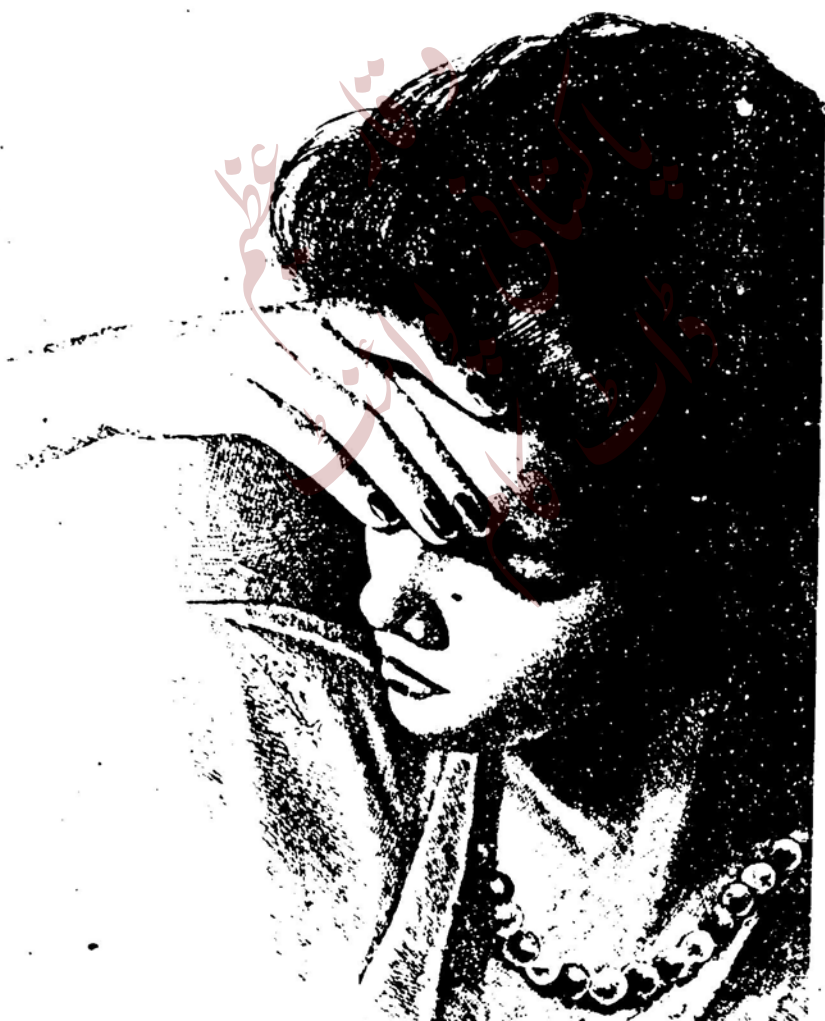
(ابوداؤد، عن عقبہ بن عامر)  
ہم بارش اور سخت آندھی والی رات میں باہر نکل کر ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کر رہے تھے آخر کار ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم پڑھو۔“ میں نے عرض کیا: ”کیا پڑھوں؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَخَذَ اور معوذتین (سورتیں) صبح و شام 3 بار پڑھو۔ تمہیں ہر چیز سے

ریحانہ آفتاب

# عشق کی دوا استاد ہیرا پوری

گزشتہ اقساط کا خلاصہ:

آنسو غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ چار بہنوں میں اس کا نمبر دوسرا تھا۔ وہ سب میں حسین تھی۔ خود سے پہلے اپنے والدین اور بہنوں کی خوشی کا سوچتی تھی۔ کم عمری میں ہی اس نے گھر کی تنگدستی دور کرنے کے لیے





محنت کرنا شروع کر دی تھی۔ اپنے لیے خریدی چیزیں بہنوں کے پسند آ جانے پر انہیں دے دیتی تھی۔ وہ اپنی روٹی  
 بلکتی زندگی سے عاجز تھی اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ کسی امیر کبیر بندے سے شادی کر کے اپنے گھر والوں کی زندگی  
 سنوارے گی۔ دونوں چھوٹی بہنیں اس پر جان چڑھ گئی تھیں۔ اس سے بڑی درختوں کی آئینہ سے گھنی رہتی تھی۔ وہ  
 طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ قد وں صاحب جو آئینہ کے والد ہیں اولاد نہ ہونے پر اپنی بیوی  
 ماجرہ کو ساری زندگی باتیں سناتے رہے۔ انہیں آئینہ کا کافی جانا نہیں تھا۔ ماجرہ، آئینہ کے بارے میں جو اس نے  
 گھر میں ہی کھولا ہوا تھا اور محلے کی عورتیں بڑے پارلر میں بیٹے بھانے کی خاطر اس کے پاس آتی تھیں کہ وہ کم  
 پیسوں میں بہترین کام کرتی تھی (اور کو چنگ سے ملنے والی آمدنی کے گن کاٹل تو قد وں صاحب کی اتنا بلبلا جاتی  
 تھی۔ آئینہ بھی ان کی جلی کٹی کی زد میں رہتی تھی۔ عرشان ولی جدی بھتیجی رئیس ہے۔ Perfection اس کی پہچان  
 ہے۔ ذرا بھی نقص اسے برداشت نہیں خواہ وہ چیز اسے کسی عزیز کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے کمرے سے ملحق کمرے کی

## فصل نمبر 6



زینت بنادیتا تھا مگر خود سے جدا کرنا گوارا نہیں تھا۔ ارشمان ولی وجاہت کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ وہ بے حد ہمدرد و دل رکھتا تھا۔ ماہ پارہ بے حد تک چڑھی اور ماڈرن خاتون ہیں۔ ارشمان ولی کی والدہ محترمہ، فرہاد صاحب، ماہ پارہ کے مزاج کے بالکل برخلاف بہت اچھے انسان ہیں۔ ماہ پارہ اور فرہاد صاحب کی تین اولادیں ہیں۔ اسارا بڑی بیٹی ہے جو اپنے شوہر راجیل اور تین بچوں کے ساتھ شارجہ میں رہتی ہے۔ راجیل لالچی انسان ہے۔ اسارا، ماہ پارہ کی طرح تنگ مزاج ہے۔ اسارا سے چھوٹا شاہ میر ہے۔ جمنی، شاہ میر کی بیوی ہے جسے کم صوری کے باعث اکثر ماہ پارہ جلی کی سنانی تھیں۔ جمنی کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے وہ ابھی تک بے اولاد کی کاشکار تھی۔ جمنی سلیمہ مزاج کی لڑکی ہے۔ ماہ پارہ کی بیٹ فرینڈ واصفہ کی دو اولاد ہے۔ کاشان اور زویا۔ کاشان بھنورا صفت انسان ہے۔ فلرٹ اس کا سن پسند مشغلہ ہے۔ زویا تک چڑھی لڑکی ہے۔ وہ ارشمان ولی کو پسند کرتی ہے۔ اس کی نظر کرم حاصل کرنے کے جتن کرتی رہتی ہے۔ تینوں بچپن سے دوست ہیں۔ آنسو نے زویا سے بڑے جتن کر کے دوستی کی تھی۔ کاشان کی صورت میں محروم زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ زویا نے کاشان کو چیلنج کیا تھا کہ وہ آنسو سے فلرٹ کر کے دکھائے تو وہ استاد مان لے گئی۔ کاشان نے چیلنج قبول کر لیا تھا جلد ہی اس نے آنسو سے دوستی کر لی۔ اسے سوٹ اور سیل فون گفٹ کیا۔ جدید اسٹارٹ فون استعمال کرنا آنسو کو مشکل لگ رہا تھا۔ ارشمان ولی، کاشان کو اس کی حرکتوں پر بے نقط کی ستارہ بٹاتا تھا۔ اسے ان لڑکیوں پر غصہ آتا تھا جو کاشان کا شکار بنتی تھیں۔ وہ اپنی محبت اور جذبہ اس کے لیے سنبھالے بیٹھا تھا جو صرف اس کی ہوئی۔ ولید ارشمان ولی کا بیٹ فرینڈ ہے۔ (اب آپ آگے پڑھیں)

☆☆☆

شام ڈھل رہی تھی۔ سونی چھت پر تار سے کپڑے اتار رہی تھی۔ آنسو مندر سے لگی سیل فون چیک کر رہی تھی۔ کاشان کا دیا ہوا سیل فون وہ پھینک دینا چاہتی تھی مگر ابھی اسے اس کی بہت ضرورت تھی وہ جذباتی ہو کر اپنا مزید نقصان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہاں اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ میسج آتے ہی وہ کوئی سستا سیل فون لے کر اس سیل کو پھینک دے گی۔ سونی نے اس کے سنجیدہ انداز کو بغور دیکھا تھا۔

”آپنی کی باتوں سے آپ سیٹ ہو گئی ہو؟“  
 ”نہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ کئی دنوں سے اس کا یہی انداز تھا۔ وہ بہت کم بول رہی تھی۔  
 ”کسی کو کال کرنی ہے؟“

”ہاں SMS ڈھونڈ رہی ہوں۔ جاب کی وینسی کا ایڈ تھا، اسی میں کانیکٹ نمبر تھا۔ مل نہیں رہا۔ ڈیلیٹ نہ ہو گیا ہو۔“ اس نے پریشانی سے مصروف انداز میں کہا۔  
 ”تم جاب کرو گی؟“ سونی کو حیرانی ہوئی۔

”ہاں!“ اس کا لہجہ سٹ تھا۔ وہ خود فریبی کے دور سے نکل آئی تھی۔ کسی کو مہرہ بنانے کا خیال ترک کر چکی تھی۔ اب اسے خود اپنی فیکٹی کے لیے کچھ کرنا تھا اور آج کل وہ اسی سلسلے میں جاب ڈھونڈ رہی تھی۔  
 ”اور کالج کا کیا ہو گا؟“ سونی اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

”پیپر دے دوں گی۔ ویسے بھی چند ماہ ہیں ایگزام میں۔ شکر مل گیا۔“ اس نے ٹیکسٹ ملنے پر سکون کا سانس لیا تھا۔

☆.....☆

”السلام علیکم!“ ارشمان انتر ہوا تو ماہ پارہ صوفے پر براجمان تھیں۔ نائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے وہ ان کے

مقابل بیٹھ گیا۔

”والسلام! دیر ہو گئی تمہیں؟“ ماہ پارہ نے معمول سے لیٹ ہونے پر دریافت کیا۔  
 ”ولید کے ساتھ پارٹنرشپ کی ہے آفس اسٹیبلش ہو رہا ہے۔ میں نے اسے فری ہینڈ دیا ہے مگر وہ ہر معاملے میں مھیٹ رہا ہے۔ وہیں سے آرہا ہوں۔“ اس نے تفصیل بتا کر ان کا تردد دور کیا۔  
 ”اتنا کام مت کرو، تھک جاؤ گے۔“ ماہ پارہ فکر مندی سے اونچے لمبے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ماں کی فکر مندی پر مسکرا دیا۔

”میں نے صرف انویسٹ کی ہے، ولید ہی رن کرے گا بزنس کو۔“ اس نے کچی دباتے ہوئے کہا۔  
 ”اسرار، راجیل کے ساتھ چلی گئی۔ تمہارے ڈیڈ بھی پھر سے ٹور پر نکل گئے۔“ ماہ پارہ کو بیٹی کی فکر ہو رہی تھی بھلے راجیل معافی مانگ کر ساتھ لے گیا تھا مگر وہ اس کی طرف سے فکر مند تھیں۔  
 ”ڈیڈ نے راجیل بھائی کے بزنس کو سپورٹ کرنے کے لیے کچھ کیا؟“ وہ جاننا چاہ رہا تھا اس ضمن میں فرہاد صاحب سے اس کی کوئی بات نہیں ہو پائی تھی۔

”ہاں بلینک چیک دیا ہے۔“ ماہ پارہ نے اس کے علم میں اضافہ کیا۔ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔  
 ”مجھے گھر میں بچوں کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ حسی سے تو توقع فضول ہے۔ تم کب کر رہے ہو شادی؟“  
 واصفہ بھی کہہ رہی تھی زویا.....“

”Not now mom“ ماہ پارہ کی بات جاری تھی جب وہ اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”اور واصفہ آنٹی والا قصہ دوبارہ مت دہرائیں۔ میں زویا کو پہلے ہی کلیئر کر چکا ہوں۔ وہ میرے لائف پارٹنر کے معیار پر پورا نہیں اترتی۔ تھک گیا ہوں۔ آرام کروں گا۔“  
 عرشان ولی جیکٹ بازو پر ڈال کر واک آؤٹ کر گیا تھا۔  
 ”شادی تو زویا سے ہی ہو گئی تمہاری۔“ ماہ پارہ بڑبڑا کر رہ گئیں۔

☆.....☆

ولید انٹرویو لے رہا تھا۔ اب تک جتنی لڑکیاں آئی تھیں انہیں ولید کی زیرک نگاہ نے ریجیکٹ کر دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا آج کوئی سلیکشن نہیں ہو جائے گی لیکن آننور جب انٹرویو کے لیے آئی تو اس کا سراپا اور نپنی تلی گفتگو ولید کو پہلی ہی نظر میں قائل کر گئی۔ گو کہ اس کے پاس کوئی ٹیجر نہیں تھا مگر ولید کو کام کرنے والی لڑکیوں کی پہچان تھی۔

”او کے مس آننور! آپ کو تھوڑی دیر میں اپائنٹمنٹ لیٹرل جانے گا۔ آپ نکل سے جوائن کر لیں۔“ ولید نے فیصلہ کر لیا تھا۔

”تھینک یویر!“ آننور کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ دو تین جگہوں پر پہلے ہی انٹرویو دیتی آئی تھی۔ جہاں کچھ امید نہیں بندھی تھی۔ اس کی ہمت ٹوٹ رہی تھی وہ مزید انٹرویو دینا نہیں چاہ رہی تھی مگر جانے کیا سانس کی آج کا آخری انٹرویو سمجھ کر بھگتاتے چلی آئی اور شوئی قسمت کہ سلیکٹ بھی ہو گئی۔

”شازیہ آپ اندر آئیں۔“ ولید نے انٹرکام اٹھاتے ہوئے دوسری طرف کسی کو پیغام دیا تھا۔  
 ”جواب کے ساتھ آپ کی اسٹڈی ڈسٹرب نہیں ہوگی؟ مگر ریکجوشن کالاسٹ ایئر ہے۔“ ولید نے یوں ہی برسبیل تذکرہ کیا۔

”میں منیج کر لوں گی سر! مجھے جاب کی سخت ضرورت ہے۔“ مبادا نوکری نہ چلی جائے آنسو نے جلدی سے کہا۔

”ہمارے آفس کا ماحول دیگر آفسز سے بہت مختلف لگے گا۔ پک اینڈ ڈراپ بھی ملے گی۔“ ولید دیگر

سہولیات کا بتانے لگا۔

”بہت شکریہ سر۔“ آنسو نے خود کو بہت ہلکا بھلکا محسوس کیا۔ اسے اتنی جلدی اتنی اچھی نوکری ملنے کی امید نہیں تھی۔ جتنی سگری وہ آفر کر رہے تھے اتنی تو اس کی اور قدوس صاحب کی محنت کا معاوضہ ملا کر بھی نہیں بنتا تھا۔

”یس سر!“ سلجے مزاج کی ایک لڑکی دستک دے کر داخل ہوئی۔ سلیطے کی ڈریسنگ اور چہرے پر ملاحات لیے اسے وہ لڑکی قدرے بھلی لگی۔

”شازیہ! یہ آنسو ہیں، آپ کے ساتھ کام کریں گی۔ انہیں کمپیوٹر کی زیادہ Information نہیں ہے۔ انہیں ٹرینڈ کرنا آپ کا کام ہے۔“ ولید نے آنسو کی طرف اشارہ کر کے شازیہ کو اس Task سمجھایا۔

”اوکے سر۔“ شازیہ نے خیر مقدمی مسکراہٹ آنسو کی طرف اچھالی اور مودب ہو کر ولید کو مطمئن کیا۔

”اوکے مس آنسو! آپ مس شازیہ کے ساتھ تھوڑا نام اسپینڈ کریں تاکہ کل آپ کو سمجھن نہ ہو۔“ ولید نے پروفیشنل انداز میں کہا۔

”اوکے سر، جھیک یو۔“ آنسو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”ویکم! میں آپ کا اپائنٹ لیٹر ٹاپ کر داتا ہوں۔“ اسے شازیہ کے ساتھ جانے کا اشارہ کرتے ولید نے خوش دلی سے کہا تھا۔ وہ شازیہ کے ساتھ روم سے نکل گئی تھی۔ شازیہ اسے کافی دیر کام سمجھاتی رہی تھی۔

دوستانہ انداز میں کام سمجھتے اسے سہل لگنے لگا تھا۔

☆.....☆

عرشان ولی فائل اسٹڈی کرتے انگلیوں میں دبا قلم پر سوچ انداز میں لیوں پر مار رہا تھا۔ نظریں وقفے وقفے سے لیپ ٹاپ پر بھی ڈال رہا تھا۔ غالباً فائل سے متعلق انفارمیشن ٹیلی کر رہا تھا۔ زویا اور کاشان اسی دم انٹر ہوئے تھے۔

”کہاں ہوتے ہو یار! نظر نہیں آرہے۔“ کاشان آتے ہی شروع ہو گیا۔

”قائد اعظم کے مقولے پر عمل کرتا ہوں۔ کام کام اور کام۔ تمہاری طرح فضول ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔“ اس نے مسکراتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہا۔

”اور لاؤ یہاں جوتے کھلانے۔“ کاشان نے بے ساختہ جیکھی نظروں سے زویا کو دیکھا۔

”کچھ لوگ تم لوگ؟“ اس نے آداب میزبانی نبھانا چاہی۔

”کچھ کھانے کو منگوا لو۔ جائیز، تھائی۔“ کاشان نے ازلی لا پرواہی سے کہا۔

”تم لوگ ہر وقت کیا بھوکے ہی میرے پاس آتے ہو۔“ عرشان ولی اس کے فراموشی پر گرام پر چیخنے لگا۔

”دیکھا!“ ناک پھلا کر کاشان نے ایک بار پھر زویا کو دیکھتے جیسے عرشان ولی کے رویے کی شکایت لگائی۔

عرشان اس کے بچکانہ انداز پر ہنس دیا۔

”بی جملہ والی خصلت میں کب سے مبتلا ہو گئے۔“

زویا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح دل لینے کی حد تک وجہہ لگ رہا تھا۔ اسکا کی بلو شرٹ پر بلیوٹائی جھول رہی تھی۔ کف کہنیوں سے نیچے تک فولدہ تھے۔ بائیں مضبوط کلائی میں Seiko کی بلیک گھڑی کلائی کی مضبوطی کو اجاگر کر رہی تھی۔ انھی گھڑی ناک، روشن پیشانی اور لائٹ براؤن آنکھوں میں شرارتی مسکان سجا کے وہ کاشان کو چھیڑ رہا تھا۔ لائٹ براؤن سلی گھنے بال بھی پیشانی پر آ جاتے تھے جنہیں وہ جب بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا کر اوپر اٹھاتا تو زویا کا دل جیسے دھڑکنابند ہو جاتا۔ وہ اس ساحر کے سحر میں عرصے سے جتا جی مگر اس کے رتیچٹ کرنے کے بعد بھی وہ اس سے دستبردار نہیں ہو پارہی تھی۔ جب ہی تو خود اس سے ملنے بات کرنے کے جتن کرنے لگتی تھی۔ حالانکہ وہ کال بھی کم ہی Pick کرنے لگا تھا۔

”تم کیوں چپ ہو؟“ عثمان ولی کو زویا کی گہری نظریں متواتر محسوس ہوئیں تو پوچھ بیٹھا۔ وہ کسی حد تک اب اس سے بات کرنے سے احتراز کرنے لگا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا زویا اس کی طرف سے کسی خوش گمانی میں رہے۔

”سن رہی ہوں تم دونوں کو۔“ وہ اس کی ایک نظر پر کھل کے مسکرائی۔

”جی بھر کے دیکھ لو مجھے۔“ کاشان نے پھر گل نشانی کی۔

”کیوں مرنے والے ہو۔“ عثمان ولی نے بے ساختہ کہا۔

”انگلینڈ جا رہا ہوں ڈیڈ کے پاس، سال بھر کے لیے۔“ کاشان نے اطلاع دی۔

”اوہ.....! اور وہ تمہاری اساتذہ؟“ اوکو لبہا کھینچنے اس نے پھر شرارتا کہا۔

”ستاروں سے آگے جہاں ابھی اور بھی ہیں۔“ بے باکی سے ایک آنکھ بند کرتے اس نے اپنے عزائم سے آگاہ کیا۔

”کب سدھرو گئے۔“ ننی میں سر ہلاتے عثمان ولی مسکرایا۔

”کتے کے دم کی مثال تو تم نے سی ہی ہوگی۔“ کاشان بھی سو ڈھیوں کا ایک ڈھیٹ تھا۔ عثمان ولی کا قبہ بے ساختہ تھا۔ اسی اثناء میں کاشان کا سیل فون بجنے لگا۔

”لگ جاؤ اپنے کام میں۔“ اس نے چٹ کی۔ کاشان سیل فون کان سے لگا کر روم سے ملحق اوپن ایریا میں چلا گیا تاکہ سکون سے بات کر سکے۔

”چائیزیا تھا کی نوڈ میں کچھ بھیج دیں۔“ انٹرکام پر ہدایت دے کر اس نے ایک نظر پھر لیپ ٹاپ پر ڈالی۔ روم میں اب صرف وہ دونوں رہ گئے تھے اور ان کے بیچ خاموشی تھی۔ زویا بنوراسے دیکھ رہی تھی۔

”چپ ہو، خاص وجہ؟“ عثمان ولی نے خاموشی کا پردہ چاک کیا۔

”تم نے ملنا کیوں کم کر دیا؟“ زویا نے گہری نظریں سے دیکھتے سوال داغا۔

”بڑی ہو گیا ہوں۔“ معروف انداز میں فائل قریب کی۔

”بڑی ہو یا بھاگ رہے ہو؟“ زویا نے چیتے لہجے میں سوال کیا۔

”کس سے بھاگوں گا؟“ عثمان ولی نے نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔

”مجھ سے، میرے جذبوں سے۔“ زویا نے ایک ادا سے کہا۔ عثمان ولی کے لب سرعت سے بھیج گئے۔ روشن پیشانی پر چند لکیریں ابھر گئیں۔ لب دانتوں تلے دبا کر اس نے جیسے لیوں کو کوئی گستاخ جملہ کہنے سے

روکا جیسے خود پر ضبط کیا ہو لیکن مزید چپ رہنا اسے بے کار لگا۔  
 ”زویا! تم میری بچپن کی دوست ہو۔ اس لیے میں تم سے کوئی سخت بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک بات کو بار بار دہراتا بھی پسند نہیں کرتا۔ تمہیں میری نیچر کا علم ہوگا۔ آئندہ کچھ بھی کہنے سے پہلے احتیاط کرنا۔“ اس نے ناگوار لہجے میں جتا کر سختی سے وارن کیا۔

”نہ کروں تو.....“ زویا کو چڑھنے لگی۔  
 ”مجھ سے ملنے، کانٹیکٹ کرنے کی کوئی کوشش نہ کرنا۔“ خفگی اس کے لہجے میں تھی۔ اندازہ دو ٹوک تھا۔ وہ یوں بھی لگی پٹنی رکھنے کا قائل نہیں تھا۔

”تمہیں مجھ جیسی کوئی لڑکی نہیں ملے گی۔“ چیلنج کرنے والا انداز تھا۔  
 ”مجھے تم جیسی لڑکی چاہیے بھی نہیں۔“ عثمان ولی نے کمال سکون سے کہا۔ نظریں جتناقی ہوئی تھیں۔ زویا کو پینے لگ گئے۔

”تم میری انسلٹ کر رہے ہو؟“ وہ برا مان گئی۔

”مجبور تم کر رہی ہو۔“ وہ جتا گیا۔  
 ”ہے کون وہ، جس کی وجہ سے تم مجھے ٹھکرا رہے ہو۔“ زویا کا بس نہیں چل رہا تھا کس طرح عثمان ولی کو اپنا بنالے۔

”جبل جائے گی تو دیکھ لیتا۔“ وہ جیزر دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”ایکسپوزی!“ جیکٹ جیزر سے اٹھا کر بازو پر رکھ کر وہ روم سے واک آؤٹ کر گیا۔ زویا ہونٹ کی طرح اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆.....☆

ہاجرہ کپڑوں کا ڈھیر پھیلائے بیٹھی تھیں۔ روبی، سوتی کپڑے تہہ کر رہی تھیں۔ قدوس صاحب خشکیں نکا ہوں سے گھور رہے تھے۔ وہ ابھی ابھی باہر سے لوٹے تھے۔ آتے ہی نظر کپڑوں کے ڈھیر پر پڑی تھی۔  
 ”یہ گھر کو کیا تم لوگوں نے جنت بازار بنا رکھا ہے۔“

”میں نے بوتیک والی سے سلائی کا کام لینا شروع کر دیا ہے۔ محلے کے کپڑے ہی کراچی اجرت نہیں مل رہی تھی۔“ ہاجرہ نے محلے کی ایک خاتون کے توسط سے اوسط درجے کی بوتیک سے رابطہ کیا تھا۔ خاتون کا بڑا تو نہیں درنیا نے درجے کا پار لہا تھا جس میں وہ بوتیک بھی چلا رہی تھی۔ اسے ہاجرہ کی سلائی پسند آگئی تھی جس کی وجہ سے اس نے کافی کام دے دیا تھا۔

”اور زلیل کرواؤ محلے میں، سب کے سامنے۔“ قدوس صاحب چنگھاڑے۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح تو انہیں اپنی مردانگی دکھانی ہی تھی۔ ایسے ہی تھی۔

”ذلیل کروانے کی کیا بات ہے۔ گھر کی وال روٹی چلانے کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ آپ کی نوکری بھی چھوٹ گئی کل کو بیٹیوں کی شادی بھی کرنی ہے۔ درخشاں کو جس طرح رخصت کیا اس پر دل ابھی تک رورہا ہے۔“ ہاجرہ افسردہ ہو گئیں۔ ہر ماں کی طرح ان کے دل میں بھی ارمان تھے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو اچھے سے اچھا جیزر، کپڑے دیں مگر وہ وقت و غربت کے ہاتھوں بندھی ہوئی تھیں۔



”دودن گھر بیٹھ گیا تو لگیں طعنہ مارنے۔ ساری زندگی عیش کرتی رہی تب تو نہ بولی تو۔“ قدوس صاحب کی آواز اونچی ہو گئی۔ روٹی سوئی سراسیمگی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں جیسے جنگ شروع ہونے کا خطرہ بھانپ گئی تھیں۔

”کب عیش کیا۔ روز اول سے روکھی سوکھی کھا کر گزارا کیا۔ چند جوڑوں میں بال سفید کر لیے۔“ ہاجرہ کو طعنے چابک کی طرح لگے تو وہ بھی بلبلانگئیں۔ سوئی نے دزدیدہ نظروں سے باپ کا چہرے دیکھتے ہاجرہ کا ہاتھ غیر محسوس طریقے سے دبا کر انہیں جیسے مزید بولنے سے روکنا چاہا۔

”چار پیسے کا کر بہت زبان چلنے لگی ہے تیری۔“ قدوس صاحب آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ کسی بڑوسی کی آمد کی دعا کرتی سوئی تیزی سے دروازے کی اور بڑھی تاکہ یہ جھگڑا تو ختم ہوتا لیکن دروازے پر آنسو روک دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گئی تھی۔ اب تو پوں کا رخ بھینا اسی کی طرف ہو جاتا تھا۔

آنسو نے گھر کے باہر ہی سے قدوس صاحب کی تیز آواز ساعت میں محفوظ کر لی تھی۔

”السلام علیکم۔“ گھر سے کپڑوں اور غصیلے چہرے والے قدوس صاحب کو دیکھ کر اس نے دھیسے سے سلام کیا۔

”اس وقت کہاں سے آرہی ہو؟“ تفتیشی لہجہ تھا۔ آنسو نے گھلاتر کیا۔ حقیقت کب تک چھپ سکتی تھی۔

”انٹرویو کے لیے گئی تھی۔“ انداز بھرمنا تھا۔ قدوس صاحب چونک گئے۔ ہاجرہ پر گھورتی نظر ڈالی۔

”اب یہ نوکری کرے گی۔ تم لوگ بہت من مانی کرنے لگی ہو۔“ وہ بھڑک اٹھے تھے۔

”نوکری کرنا من مانی نہیں ضرورت ہے ابا! گھر کے اخراجات پورے کرنے لیے ہم سب کو کوشش کرنی ہوگی۔“ اس نے بہت کر کے انہیں منانے کی سعی کی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے تجھے نوکری کرنے کی۔ تیرے چند ہزار سے گھر کی قسمت نہیں بدل جائے گی۔“ قدوس صاحب نے قطعی لہجے میں کہا۔

”ابا! میں ہاں کر آئی ہوں۔“ آنسو کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات آ گئے۔

”تو منع کر دے، مجھ سے پوچھ کر گئی تھی۔“ وہ دہاڑ رہے تھے۔

”میں تو صرف انٹرویو کے لیے گئی تھی۔ قسمت سے سلیکشن ہو گئی۔ ابا پلیز اجازت دے دیں۔ پندرہ ہزار سہری ہے۔ اچھی نوکری ہے۔“ لبتی لہجے میں کہتے ہوئے آنسو نے سفارشی نظروں سے ہاجرہ کی طرف دیکھا کہ وہ ہی معاملہ سنبھال لیں۔

”پندرہ ہزار۔“ قدوس صاحب نے بے یقینی سے دہرایا۔

”جی اور نام کے الگ ہوں گے۔ آنے جانے کی بھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ آفس کی گاڑی ہوگی۔ ابا پلیز انکار نہ کریں۔ گھر کے حالات دیکھیں۔“ آنسو رو دیگر سہولیات بتا کر انہیں نرم کرنا چاہ رہی تھی۔

”پھر بھی محلے والے لوگ.....“ قدوس صاحب ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔

”لوگ کون سا ہماری ہانڈی روٹی کے پیسے دیتے ہیں جو ہم ان کی فکر کریں تو جو ان کر لے آنسو۔“ ہاجرہ

نے دو ٹوک لہجہ اپنا کر کہا۔ بیٹیوں کے بڑے ہونے کے بعد اب وہ خود کو مضبوط محسوس کرنے لگی تھیں۔ تب ہی قدوس صاحب کے سامنے بھی بول پڑتی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو قدوس صاحب جواباً گولہ ضرور داغتے مگر پندرہ ہزار نے ان کا منہ بند کر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے گھر سے نکل گئے۔

”پندرہ ہزار کا منہ بند ہو گیا۔ ورنہ پہلے کتنا دباؤ رہا تھا۔ خود میں تو کچھ کرنے کی صلاحیت ہے نہیں سوائے چلانے کے۔ پیسہ اچھے اچھوں کا منہ بند کر دیتا ہے، سنا تھا آج دیکھ بھی لیا۔“ ہاجرہ سر جھٹک کر بڑبڑا رہی تھیں۔

”اچھا چھوڑیں نا، موڈ خراب نہ کریں۔“ آنسور نے قدوس صاحب کی خاموشی کو اجازت جان کر سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ ہاجرہ کا موڈ بحال کرنے لگی۔

”آنسور جب تمہیں پہلی سیلری ملے گی نا ہم سی ویو چلیں گے۔ کتنا عرصہ ہو گیا کھلے سمندر کو دیکھے۔“ سوئی نے پر شوق لہجے میں فرمائش کرتے حسرت سے کہا۔

”اور میں اونٹ پر بیٹھوں گی۔“ ردولی نے ایکسائینڈ ہوتے ہوئے کہا۔

”اچھا! ضرور چلیں گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بہنوں کا مان بڑھایا۔

☆.....☆

آنسور کو آفس جوائن کے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ شازیہ نے اسے چند دنوں میں بی ٹریڈ کر دیا تھا۔ وہ اپنے کام میں دلجمعی سے منہمک تھی۔ تب ہی انٹرکام پر ولید کی ہدایت ملی۔

”آنسور! مینٹگ شروع ہونے والی ہے۔ کسی کو اندر نہیں آنے دیجیے گا۔ سختی سے عمل کیجیے گا۔“

”او کے سر۔“ اس نے جانفشانی کا لہجہ دلا دیا۔ شازیہ آج نہیں آئی تھی اس لیے تمام کالز اور انفارمیشن اسے ہی دینی پڑی تھی۔ وہ کلائنٹ کی کال سن رہی تھی تب ہی عرفشان ولی سیل فون کان سے لگائے داخل ہوا تھا۔ اس کی پشت آنسور کی طرف تھی۔

”ایسکے زمی! ایسکے زمی سر!“ کال میں بڑی آنسور کی نظریں نووارد پر پڑیں تو ہیڈ فون اتارتے اس نے اجنبی کو آواز دی مگر غالباً اس کی آواز اس تک پہنچی نہیں تھی۔

”Hello Mr Can you listen to me!“

اس نے اب کے پہلے سے زیادہ تیز آواز میں کہا مگر وہ کان سے لگے سیل فون میں اس قدر مصروف تھا کہ شاید اس تک آنسور کی پکار پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ اس کا رخ ولید کے روم کی طرف ہوتا دیکھ کر آنسور کو ولید کی انسٹرکشن جہاں یاد آتی وہیں اسے اپنی نوکری جاتی لگی اگر وہ اندر پہنچ جاتا تو ولید کے نزدیک اس کا کیا امپریشن پڑتا کہ ایک دن شازیہ کے نہ ہونے پر وہ اپنی کارکردگی نہ دکھا سکی تھی۔ ہیڈ فون پھینکنے کے انداز سے رکھتے اس نے تقریباً دوڑ لگا دی تھی اور ولید کے روم کے دروازے کے آگے چٹان بن کر کھڑی ہو گئی۔ سیل فون کان سے لگائے عرفشان ولی اچانک ایک دوشیزہ کو دائیں بائیں ہاتھ پھیلا کر راستہ روکنے پر ایک پل کو ٹھک گیا تھا۔ پنک سوٹ میں بھاگنے کی وجہ سے اس کے چہرے پر بھی سرخی دوڑ گئی تھی۔ ستواں ٹاک، اس میں چمکتا نوز پن، گھنے کالے آبشار جیسے بالوں کی ٹیٹیں اس کے شولڈر پر جمول رہی تھیں۔

”اندر مینٹگ چل رہی ہے۔ آپ اندر نہیں جاسکتے۔ باس کی سختی سے تاکید ہے۔“ پھولتی سانسوں کے

درمیان اس نے جلدی سے کہا تھا۔ عریشان ولی نے اب کے اسے بغور دیکھا تھا۔ گھنی مڑی لابی پلکوں کو پٹپٹاتے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی اس کا سیل فون والا ہاتھ بے ساختہ نیچے ہو گیا تھا۔  
 ”دیکھیں۔“

”آپ کو باس سے جتنا بھی ضروری کام ہے وہ ابھی تو نہیں ہو سکتا کیونکہ میں یہاں سے ہٹوں گی نہیں۔ بہتر ہوگا۔ آپ ہی پلٹ جائیں۔ سر جیسے ہی میننگ سے فری ہوں گے میں پہلی فرصت میں ان سے آپ کی میننگ فکس کر دوں گی۔ آئی سویر!“ عریشان ولی نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر اس کی بات شروع ہونے سے پہلے ہی اچک کر آنسوؤں نے اسے آس دلا نا چاہی۔ عریشان ولی کے ارد گرد جیسے ہنسی پٹانے چھوٹنے لگے تھے۔ لڑکی کا انداز اتنا معصومیت لیے اور دلچسپ تھا کہ اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی۔ اس پر سے وہ جس طرح دائیں بائیں ہاتھ پھیلانے اس کا راستہ بلاک کیے کھڑی تھی وہ اس بچکانہ حرکت پر لب دانتوں تلے دبا گیا۔ جیسے وہ اسے ڈانچ دے کر اندر داخل ہو جائے گا وہ جس طرح چست کھڑی تھی۔ اس نے مسکراہٹ چھپائی تھی مگر آنسوؤں اس کی مسکراتی نظروں سے بدگمان ہو کر شانوں سے سرکتا دوپٹا برابر کر کے دایاں ہاتھ پھردا کر کر گئی۔

اسی اثناء میں عریشان ولی کا سیل فون بجنے لگا تھا۔ نظریں اس پر جما کر اس نے کال پک کی تھی۔  
 ”یار! کہاں ہے جلدی آؤ، تہارے روم کے باہر ایک محترمہ سلطان راہی بنی کھڑی ہیں۔ ان کی اجازت ملے تو آؤں نا.....!“ آنسوؤں کو نظروں کے حصار میں رکھتے اس نے بے ساختہ گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ غالباً اس کی دیری پر اسے سرزنش کر رہا تھا۔ وہ اس کی گفتگو سنتی کچھ بزل ہی ہونے لگی تھی۔  
 ”آنسوؤں ہوگی، فون دواے۔“ ولید نے سمجھتے ہوئے کہا۔ عریشان ولی نے بے ساختہ اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھایا۔

”آپ کے باس!“ آنسوؤں بڑھے ہوئے سیل فون کو تعجب سے دیکھ رہی تھی، تب ہی ذرا شرارت سے جھکتے اس نے ہولے سے کہا۔ اس کی شرارت کو تیکھی نظروں سے دیکھتے اس نے سیل فون احتیاط سے لے کر کان سے لگایا۔

”جی سر!“ اتنا تو وہ جان گئی تھی۔ دوسری طرف ولید ہی تھا۔

”راستے سے ہوا اور عریشان ولی کو اندر آنے دو۔ جس کی وجہ سے میننگ رکی ہوئی ہے۔ تم اسے ہی روکے کھڑی ہو۔“ ولید نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات الیکدم عود آئے تھے۔ عریشان ولی دلچسپی سے اس کے چہرے کے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اتنی جلدی اتنے سارے تاثرات ایک چہرے پر وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

”سوری سر! لیکن آپ کی انٹرکشن پر عمل کر رہی تھی۔“ لب کانٹے اس نے پراعتاد لہجے میں کہا تھا۔

”میں آپ کی تعریف کر رہا ہوں۔ اندر آنے دو، عریشان کو۔“ ولید نے سراپتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

”جی سر!“ سیل فون اس کی طرف بڑھاتے اس نے جھل انداز سے چہرے پر جھولتی لٹ کوکان کے پیچھے کیا۔ اس کھڑی وہ خود کو دنیا کی احمق ترین ہستی سمجھنے لگی۔ اس پر سے عریشان ولی کی شرارتی نظریں مسلسل اس کا طواف کر رہی تھیں۔

”اجازت ہے؟“ قدرے جھک کر اس نے جھکے سر کی طرف دیکھا۔ آنسوؤں کی تکیجی نظریں ذرا کی ذرا اٹھی تھیں۔  
 ”Yes Please!“ وہ سامنے سے ہٹ کر اسے کیبن کی اور بڑھ گئی تھی۔

”بندے کو اتنا ہینڈسم بھی نہیں ہونا چاہیے، اوپر سے دلکش مسکراہٹ، گھمبیر آواز، بندہ حواس باختہ نہ ہو تو اور کیا کرے۔ کتنی اسٹوپڈ حرکت کی میں نے۔“ وہ خود کو لعن طعن کرنے لگی۔ اسے دور سے شاز یہ تیز چلتی نظر آئی۔

”تم نے آج دیر کر دی؟“ آنسوؤں کو اس کی بے وقت آمد پر حیرت ہوئی۔  
 ”ہاں کچھ ضروری کام تھا اس لیے چھٹی کا موڈ ہوا تو تمہیں انقارم کر دیا لیکن کام وقت سے پہلے ہو گیا تو آفس چلی آئی کہ ناحق گھر میں بیٹھی بور ہو رہی رہوں گی۔“ شاز یہ نے تفصیل سے کہتے اپنی سیٹ سنبھالی۔  
 ”اوکے!“ وہ کھوٹی کھوٹی سی تھی۔ شاز یہ نے اسے آئی بروا چکاتے ہوئے دیکھا۔ ”کوئی پڑا بلیم!“  
 ”یہ عریشان ولی کون ہیں؟“ آنسوؤں نے اپنی الجھن اسے بتائی۔ اس کے انداز سے اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ وہ کوئی معمولی ہستی نہیں ہے۔

”آئے ہیں کیا؟“ جواب کی بجائے شاز یہ نے انسا سوال جڑ دیا۔  
 ”ہاں اور آتے ہی ان کی وجہ سے مجھے سبکی کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت شرمندگی محسوس کر رہی ہوں۔“ اس نے منہ بنایا۔ اسے عریشان ولی کی نظریں جھل کر رہی تھیں۔  
 ”ہوا کیا؟“ شاز یہ نے جاننا چاہا۔ آنسوؤں نے ولید کی ہدایت اپنا کارنامہ اور عریشان ولی کا چڑاتا انداز تفصیل کے ساتھ من و عن گوش گزار کر دیا۔ شاز یہ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔  
 ”تم بھی ہنسو، میرے تیس بار خان بنے پر۔“ وہ برامان کر فائل اٹھا بیچ کرنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ ناراض ہو جاتی شاز یہ نے اپنی ہنسی کو قابو میں کیا۔

”سوری یار! لیکن چویشن اتنی مزیدار سنائی تم نے کہ قابو نہ رہ سکا ہنسی پر۔“ آنسوؤں نے منہ بسورا۔  
 ”عریشان ولی!“ شاز یہ ایک پل کو رکی۔ آنسوؤں کی توجہ اس کی طرف تھی۔

Aarshmaan Wali one of the best person  
 in this world! He is such a nice man.

”شاید ابھی ایسا کوئی لفظ بتا ہی نہیں جس میں ان کی تعریف کر سکوں۔“ شاز یہ ڈوب کے گویا تھی۔ آنسوؤں کو حیرانی ہوئی اتنی تعریف پر۔

”ایسا بھی کیا ہے؟“ اس نے سر جھٹکا۔

”سر عریشان جدی پشتی رئیس گھرانے سے ہیں۔ بے حد جینٹلس۔ ان کا خود کا بزنس یورپ تک پھیلا ہوا ہے۔ سر ولید کے بیٹ فرینڈ ہیں اور اب پارٹنر بھی۔“ شاز یہ جانے ابھی اور کتنی تعریف کرنی تب ہی کال آنے لگی تھی۔ گفتگو کا سلسلہ رک گیا تھا۔ دونوں آنے والی کالز کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

وہ دونوں معمول کے کام میں مصروف تھیں۔ جب ولید کے روم کا دروازہ کھلا اور کچھ چائینز مہمانوں کو رخصت کرنے کو ولید اور عریشان ولی بھی برآمد ہوا۔ دونوں اپنی جگہ ایکٹو ہو گئیں۔ الوداعیہ انداز میں وہ چائینز مہمانوں کو بھینا عزت کے ساتھ رخصت کر رہے تھے۔

مصافحہ کر کے روانی سے چائیز لیکو بیج میں گفتگو کرتے اس نے عرشان دلی کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ اتنی روانی سے بول رہا تھا کہ اسے رشک آنے لگا۔ ولید خیر مقدی مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔ باتیں کرتے بالآخر مہمان رخصت ہو گئے۔ دونوں بیچ میں ہی رک گئے تھے۔

”اف! ہینکس کہ تو آگیا۔ ورنہ یہ چچی پوں تو میرے بس کاروگ نہیں۔“ ولید نے شکر کا سانس لیتے عرشان دلی کو سراہا۔

”اب میں بھی نکلتا ہوں۔“ عرشان دلی نے مسکراتے ہوئے ارد گرد نظر ڈالی تھی۔ دزدیدہ نظروں سے آنسو کی طرف دیکھا۔ اسے بھی منتظر دیکھ کر اس کے لبوں پر بڑی شریسی مسکراہٹ پھیل گئی جو آنسو کو پھر جھل کرنے لگی۔

”کل ایک اور میننگ ہے۔ انہیں سائٹ کا وزٹ کروادیں گے تم ٹائم پر آ جانا۔ ساتھ چلیں گے۔“ ولید کل کے لیے یاد دہانی کر دیا تھا۔

”میں تو ٹائم پر آ جاؤں گا۔ بشرطیکہ کوئی سلطان راہی بیچ میں نہ آئے۔“ اسے بھرپور نظروں سے دیکھتے اس نے شرارتی مسکراہٹ سے کہا تھا۔ انہیں ان دونوں کے مابین ہونی گفتگو بغور سنائی دے رہی تھی کہ فاصلہ کم تھا۔ اب کے اس نے جب شرارت سے کہا تو آنسو کی نظریں بے ساختہ اس سے مل گئیں۔ وہ سرعت سے دوبارہ سر جھکا گئی۔ عرشان دلی نے لب دبا کر مسکراہٹ روکی تھی۔ وہ اس مزاج کا نہیں تھا مگر اس کھڑی اسے پزل کرنا اسے اپنے مزاج کے ایک روپ سے آشنائی دے گیا۔

☆.....☆

آنسو تھکی باری گھر میں داخل ہوئی تھی۔ ہاجرہ اور قدوس صاحب محن میں براجمان تھے۔

”السلام علیکم!“ وہ ان دونوں کی طرف بڑھ گئی۔

”آج کر دی تم نے۔“ ہاجرہ نے اس کے تھکے چہرے کو دیکھا۔ صبح کی نکلی وہ رات کے آٹھ بجے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ نوکری کے بعد سے یہی معمول تھا اس کا۔

”جی کو چنگ سینٹر میں دیر ہو گئی۔ پیچڑ ہو رہے ہیں بچوں کے تو Extra Time دینا پڑ رہا ہے۔“ وہ سائیڈ پر بیٹھ گئی۔

”دن بھر آفس میں جان کھا کر کو چنگ چلی جاتی ہے۔ یہ وقت ہو جاتا ہے لوٹے، سونی بہن کو پانی پلا۔“ بڑبڑاتے ہوئے ہاجرہ نے آخر میں ادبچی آواز لگائی۔

”کبھی اتنی فکر تو نے میرے لیے تو نہیں دکھائی، بیٹی کے گھر میں گھستے ہی تجھے اس کی فکر ستانے لگی۔“ قدوس صاحب نے غصے سے شکایت کی۔

”عورت مرد کے لیے فنا بھی ہو جائے تب بھی مرد طنز کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ہر وقت جلتی چابک عورت کے وجود پر بارنا اس کی سرشت میں جو ہے۔“

کب لا پرواہی کی میں نے تمہاری طرف سے، آنسو لڑکی ذات ہے ہڈی تو زحمت کر رہی ہے۔ ہم سب کے لیے بیٹوں سے کہیں زیادہ۔“ ہاجرہ کو ان کی شکایت پر ہم کر گئی جس کا انہوں نے اظہار بھی کر دیا۔

”تو نہ کرے کس نے کہا ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے دو پیسے کیا کمانا شروع کیے تم طعنے مارنے

لگیں۔“ قدوس صاحب بھی کمان کس کر میدان میں اتر آئے۔ سوئی پانی لے آئی تھی۔ آنسو نے اسے دیکھا اور گھٹاس تمام لیا۔

”ابا پلیز! میں صرف اماں کی نہیں آپ کی بھی بیٹی ہوں۔ ہمیں یوں فٹ بال بنا کر لڑنے کا بہانہ نہ ڈھونڈا کریں۔“ اس نے پرس میں سے کچھ ڈھونڈتے ہوئے لڑنے کا میدان گرم دیکھ کر سیز فائر والے جملے کہے تو قدوس صاحب کچھ ٹھنڈے پڑنے لگے۔ نوکری کے بعد سے آنسو میں مزید خود اعتمادی آگئی تھی۔ پہلے جو وہ قدوس صاحب سے ڈر کے چپ ہو جاتی تھی اب پیار سے انہیں رام کرنے کے جتن کرنے لگی تھی۔ وہ جان گئی تھی اس کا باپ اوپر سے بظاہر سخت ہے۔ زبان سے گولے داغتا ہے لیکن جوں جوں وہ باہر کی دنیا میں سانس لے رہی تھی اسے ان کے لہجے کی سختی اور کڑواہٹ کی سمجھ آنے لگی تھی۔ ایک معمولی چپڑا سی جولوگوں کی جوتیاں سیدھی کرتے ان کی گالیاں سن کر ان کے ہاتھوں کی لکیریں گن کر اپنی ذات کو صاحب لوگوں کے جوتے تلے کچل کر چند ہزار کا کر جب گھرا لٹا تھا تو اپنی انا، مردانگی کے بلبلانے پر وہ گھر کی عورتوں پر ہی نشتر چائے گا نا، باہر تو اس کا زور صاحب لوگوں پر نہیں چلتا تھا۔ وہ باہر محکوم تھا تو گھر میں حاکم بن جاتا تھا۔ جن حاکموں کے رویے سے وہ بدظن رہتا تھا۔ درپردہ وہ گھر میں ان ہی جیسا بن جاتا تھا اور جب گھر میں کم آمدنی پر طعنہ ملتا تو ان کی انا مزید بلبلا جاتی تھی۔ آنسو رباپ کی نفسیات سمجھ گئی تھی۔ عورت رو دھو کر اپنا دکھڑا سنا دیتی ہے اور مرد کڑوے کیلے لہجے میں۔ دونوں کا انداز الگ ہوتا ہے۔ اس لیے عورت ازل سے مظلوم اور مرد ظالم تھا۔

”ابا یہ آپ کے گھنٹوں کی دوا، اماں یاد سے کھلا دیجیے گا۔ میں منہ دھو لوں ذرا۔“ دو قدوس صاحب کے ہاتھ میں تھمائی۔ ان کا گھنٹا دبا کر اٹھ کھڑی ہوئی تو قدوس صاحب کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے جھپک گئیں۔ اگلے ہی پل وہ دوبارہ اپنے خول میں مقید ہو گئے کہ مرد کو کب اپنی کمزوری دکھانا پسند ہوتا ہے۔

کھانے کے بعد سب اپنی اپنی جگہ پر لیٹ گئے تھے۔ وہ بھی لیٹی تو اکڑی کمرے کے بستر سے لگتے ہی جیسے شکوہ کیا۔ رات کی تاریکی گہری ہونے لگی تھی۔ ذہن کی اسکرین پر کچھ بل دستک دے رہے تھے۔ چہم سے شرارتی نظریں اور مسکراتے لب کے ساتھ عرفشان ولی اس کے سامنے آ گیا وہ کئی پل کے لیے ساکت رہ گئی۔ اسے سوچتی رہی پھر جیسے خوب صورت سوچ میں موٹا سا اثر دھا نکل آیا۔ وہ بنے ساختہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

”آنسو ربا بی بی! پھر سے خوش گمانی کو حکد دے رہی ہو۔ پھر سے انہی گلیوں کا سفر کرنا چاہ رہی ہو۔ کیا زویا کے ہاتھوں ہوئی تذلیل اتنی جلدی بھول گئیں، اپنی حیثیت پہچانو۔“ اس نے جیسے خود کو باور کراتے ہوئے جھرجھری لی۔

”ایک ٹھوکر نے زندگی کا چلن بدل دیا۔ سوچ کا انداز بدل دیا۔ مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی فیملی کے لیے خود محنت کروں گی۔ خیرات ہمیشہ سر جھکا دیتی ہے۔ مجھے اپنی نظروں میں گرنا نہیں ہے۔ جھوٹ و فریب کا کھیل سوائے ذلت کے کچھ نہیں دیتا۔ میں اب پھر سے جھوٹے خواب آنکھوں میں نہیں سجاؤں گی خوب صورت لڑکی سینڈر بلا نہیں بن سکتی۔“

وہ خود کو باور کروا رہی تھی اور کچھ حقیقت جاننے کے بعد انسان کو سوائے تکلیف کے کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن یہ آگاہی یہ درد خود فریبی سے کہیں بہتر ہے۔ وہ پر سوچ نظروں سے کھڑکی سے جھانکتے چاند کو دیکھنے لگی۔ چاند ہر آنکھ میں نظر ضرور آتا ہے مگر اترتا نہیں ہے۔



عرشان دلی بالکنی کے گرل سے دایاں بازو نکائے آسمان کے سینے پر جگمگاتے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ ہانف سلیو زوہائٹ لی شرٹ اور بلیو جینز میں وہ بے حد آسودہ تھا۔ ایک عجیب سی خود فریبی وجود میں دوڑ رہی تھی۔ بلا وجہ لب مسکرا رہے تھے۔ گرل سے پشت کے ساتھ سر بھی نکائے اس کی نظریں چاند پر ہی تھیں جس کا عکس نیچے بنے سوئمنگ پول پر بھی پڑ رہا تھا۔ ہر سو چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔  
 ”تو تم مل ہی گئیں، تمام یہ انتظار ہوا۔“ اس کے لبوں سے بے ساختہ دل کی بات نکلی تھی۔ بھرپور مسکراہٹ لبوں پر پھیل کر احساس دلائی کہ محبت کا جادو چل گیا ہے۔

☆.....☆

حمنی شاپنگ سے فری ہو کر مال سے نکلی تھی۔ بیگز کار میں ڈالتے سیدھی ہوئی تو اس کی نظریں بے ساختہ سامنے ریٹورنٹ پر پڑ گئیں۔ دفعتاً اس کی آنکھیں کھل کر مزید کشادہ ہو گئیں۔ شاہ میر کسی لڑکی کے ساتھ لچ کر رہا تھا۔ حمنی اسے کال کرنے لگی۔

”کیا کر رہے ہو؟“ حمنی نے اپنا شک دور کرنا چاہا۔

”مینگ میں بڑی ہوں۔“ شاہ میر کے جواب پر حمنی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”کہاں ہے مینگ؟“ اس نے لہجے پر مقدور بھرتا بھر کھا۔

”آس میں اور کہاں!“ اب کے حمنی کا بارہ چڑھ گیا تھا۔ وہ تیزی سے ریٹورنٹ میں داخل ہوئی تھی۔

شاہ میر اسے ایک دم سے سامنے دیکھ کر چونک گیا تھا۔

”تو یہ ہے تمہاری مینگ اور تمہارا آس؟“ حمنی خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاہ میر سے کوئی بات نہ بن سکی۔

”آپ کون؟“ لڑکی نے حیرت سے دریافت کیا تھا۔

”ان سے پوچھو، جن کے ساتھ لچ کر رہی ہو۔“ حمنی خشکیں لہجے سے کہتی شاہ میر کو گھور رہی تھی۔

”گھر چلو، تماشا کیوں کر رہی ہو۔“ شاہ میر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”تماشا میں کر رہی ہوں یا تم شادی شدہ ہو کر فلٹ کر رہے ہو۔“ حمنی نے چلاتے ہوئے کہا۔ لوگ

متوجہ ہونے لگے تھے۔ شاہ میر کے لیے بہت اکرڈ صورت حال ہو گئی تھی۔

”یہ میر ڈ ہیں؟“ لڑکی نے حیر سے پوچھا تو حمنی مزید چراغ پا ہو گئی۔

”ڈوب مرو!“ حمنی واک آؤٹ کر گئی تھی۔

”حمنی!“ پیچھے سے شاہ میر نے آواز دی مگر وہ ان سے نہ کر گئی۔

☆.....☆

آنسو سر جھکائے، سٹم پر بڑی تھی۔ تب ہی کسی نے انگلیوں سے کاؤنٹر بجایا تھا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ عرشان دلی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ششپائی۔ اگلے ہی لمحے ازیل خود اعتمادی سے گویا ہوئی۔

”Yes sir!“

”ولید صاحب سے ملنا تھا، روم میں ہیں؟“ وہ نہایت شرافت سے استفسار کر رہا تھا لیکن اس کی شرارتی نظریں آج بھی اسے مسکراتی محسوس ہوئیں۔

”سرراؤنڈ پر ہیں۔ آپ ان کے روم میں تشریف رکھیں۔“ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی جب پارنٹر تھا تو اسے کسی اجازت کی ضرورت کیوں پیش آنے لگی۔

”میں یہاں بیٹھ کر ہی ویٹ کر لیتا ہوں۔“ وہ سامنے وینک ایریا میں ہی بیٹھ گیا۔ جہاں سے وہ آنر کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ آنر نے کچھ نہیں کہا۔

”شازیہ نے تو بتایا تھا پارنٹر ہیں پھر یہاں بیٹھ کر انتظار کیوں کر رہے ہیں۔“ اسے اس کی نظروں سے ابھرنے لگی جو وہ وقتاً فوقتاً اس پر ڈال رہا تھا۔ آنر کو اپنا کام کرنا دو بھر لگنے لگا۔

”عرشان! تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟“ ولید کچھ لمحوں بعد آیا تو عرشان کو دیکھ کر حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

”تم سے ملنے آیا تھا۔ مس نے ویٹ کرنے کا کہا۔“ کھڑا ہوتے ہوئے اس نے معصومیت سے کہا۔ آنر کو کامنڈاس جھوٹ پر کھل گیا۔ ولید مسکرا دیا۔

”تم نے اپنا تعارف کروانا تھا نا، اب تم مینوں بعد شکل دکھاؤ گے تو ایسا استقبال تو ہوگا۔“ ولید، آنر کی طرف رخ کر گیا تھا۔

”آنر! عرشان ولی ہیں میرے بزنس پارنٹر، اور اس آفس کے باس بھی۔ مس آنر نے پندرہ دن پہلے ہمیں جوآن کیا ہے۔“ ولید نے دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔

”اب کیا ہمیں بڑے رہو گے، اٹھو۔“ ولید کے گھر کے پردہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”آنر! دوکانی مجھ کو اس۔“ ولید نرمی سے کہتا عرشان کو لیے روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

آنر نے انٹرکام کیا مگر کچن میں کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ ناچار خود کچن کی اور بڑھ گئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ شازیہ راستے میں ہی مل گئی۔

”ٹاقب کوکانی کا بولنے، سر ولید اور عرشان سر کے لیے۔“

”یار! میں نے ٹاقب کو اپنے پرسل کام سے قریبی سپراسٹور بھیجا ہے۔“ شازیہ کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات آ گئے۔

”پھر کافی کا کیا ہوگا؟“ آنر کو بھی تشویش ہوئی۔ جانے ٹاقب کب تک آتا۔ شازیہ چند لمحوں سوچتی رہی۔

”تم بنادوکانی۔“ شازیہ نے آئیڈیا دیا۔

”میں.....!“ آنر کو حیرانگی ہوئی۔ گواس نے کبھی کافی نہیں بنائی تھی مگر ٹاقب کو کوئی بار بناتے ضرور دیکھا تھا۔ اسے ترکیب اور چیزوں کی مقدار از برتھی۔ ویسے بھی کوکنگ ایکسپرٹ تھی۔ مگر میں کافی جیسی عیاشی نہیں کرتی تھی مگر آفس میں اس ذائقہ سے آشنائی ہو گئی تھی۔

”کیوں بنانا نہیں آتی۔ پلیز یار! جلدی بنادو ورنہ ٹاقب کے ساتھ میری بھی شامت آ جائے گی۔“ شازیہ نے متوقع سرزنش سے بچنے کے لیے لچکی لہجہ میں کہا۔

”اوکے لڑائی کرتی ہوں۔“ وہ دوستی میں بے چارگی سے ہامی بھر کے کچن کی طرف چل دی۔

کافی بن چکی تھی۔ آنر جھوٹی سی ٹرے میں دوکانی لیے شازیہ تک آئی۔

”یہ ٹاقب کہاں رہ گیا؟“ اب کافی اندر لے جانے کا مرحلہ درپیش تھا۔ شازیہ کو پریشانی لاحق ہو گئی۔

آنر کو بے چارگی سے دیکھنے لگی۔

”اب تم مجھے کافی اندر لے جانے کا نہ کہتا۔“ آنسور نے اس کی نظروں کو بھانپ کر صاف ہری جھنڈی دکھادی۔

”شازیہ باجی! یہ آپ کا سامان۔“ صد شکر کہ ثاقب چلا آیا تھا۔ شازیہ نے اس کے ہاتھ سے شاپر لے کر جھٹ آنسور کے ہاتھ میں موجود رے لے کر ثاقب کو تھمائی۔

”شکر نام پر آگئے۔ اس سے پہلے کہ کافی ٹھنڈی ہو جائے اسے باس کے روم میں دے آؤ۔“  
 ”ارے واہ! لیکن بتائی کس نے۔“ ثاقب کو اپنا کام مکمل ہوتا ہوا دیکھ کر حیرت ہوئی۔  
 ”آنسور نے اب سوال جواب کرنے کھڑے نہ رہو۔“ شازیہ نے اسے زبردستی دھکیلا۔

☆.....☆

”کافی دن ہو گئے تم نے چکر نہیں لگایا۔“ ماہ پارہ نے واصفہ کو کال کی تھی۔ وہ گلہ کر رہی تھیں۔  
 ”میں زویا کو لے کر بہت پریشان ہوں۔“ واصفہ در پردہ ناراض تھیں مگر وہ آخری کوشش کر رہی تھیں کہ کسی طرح ماہ پارہ عثمان سے باں کروالیں۔ ورنہ عثمان جیسے لڑکے کا ہاتھ سے نکلنا انہیں بھی گوارا نہ تھا۔  
 ”کیا ہوا زویا کو؟“ ماہ پارہ کو تشویش ہوئی۔

”عثمان کے انکار کے بعد سے وہ بہت دھمی ہے۔ نہ ٹھک سے کھاتی ہے نہ اپنا خیال رکھتی ہے۔ بہت صدمہ پہنچا ہے میری بچی کو۔“ واصفہ بڑھا چڑھا کر زویا کی دلگرفتی کی داستان سنارہی تھیں تاکہ ماہ پارہ جلد ایکشن لے لیں۔

”میں زویا کو سمجھاؤں گی۔“ ماہ پارہ کو حقیقتاً افسوس ہوا۔

”تم نے بہت زیادہ نام لے لیا ماہ پارہ۔ ابھی تک عثمان کو راضی نہ کر سکیں۔ میں کب تک زویا کو تمہاری آس پر بٹھائے رکھوں۔“ واصفہ خفا ہو گئے تھیں۔  
 ”تم فکر نہ کرو۔ میں عثمان سے جلد تفصیلی بات کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔ یقین مانو میری تو دلی خواہش ہے زویا کے لیے۔“

”تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے ماہ پارہ، ہو گا تو وہی جو عثمان چاہے گا۔ تم مجھے جلدی بتا دو۔ اللہ حافظ۔“ واصفہ نے رکھائی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔  
 ”سمجھ نہیں آرہا یہ عثمان چاہتا کیا ہے؟“ ماہ پارہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز پر ماہ پارہ چونک گئی تھیں۔

☆.....☆

”آفس کے بعد مال چل رہی ہو، مجھے کچھ ضروری چیزیں لینی ہیں۔“ شازیہ نے سراٹھا کر ایکدم سے پوچھا۔ دونوں کی تھوڑے ہی دنوں میں بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

”نہیں یار! آفس کے بعد کو چنگ سینئر جاتی ہوں، پیر ز چل رہے ہیں بچوں کے۔ چھٹی نہیں کر سکتی۔ تم ویک اینڈ کا رکھ لو۔ فری ہوں کو چنگ سے۔“ نفی میں سر ہلاتے اس نے مصروفیت کا احوال سنایا۔  
 ”چلو ٹھیک ہے۔“ شازیہ مان گئی۔

ولید کے روم کا ڈور کھلا تھا۔ عثمان کو برآمد ہوتے دیکھ کر آنسور سر مزید سسٹم پر جھکا گئی تھی۔

”السلام علیکم سر!“ وہ قریب آیا تو شازیہ نے سلام جڑ دیا۔  
 ”والسلام، سسر کی شادی ہو گئی شازیہ؟“ آنسوؤں کے جھکے سر کو دیکھتے اس کے لبوں پر چور مسکراہٹ پھیل گئی۔ جان گیا تھا وہ اس کا سامنا کرنے سے کتر رہی ہے۔  
 ”جی سر! میں آپ کا پرستاری شکر یہ ادا کرنا چاہ رہی تھی۔“  
 ”No Need!“ کوئی اور پر اہلم ہو تو بتائیے گا۔“ اس کی نظریں اسی کا طواف کر رہی تھیں۔ اسے سر پر کھڑا دیکھ کر وہ مزید سر جھکا گئی تھی۔  
 ”جی سر!“ شازیہ نے ممنون مسکراہٹ سے کہا۔  
 عریشان پلٹ گیا تھا۔ ایک دم پھر رخ ان کی طرف کیا۔  
 ”اور ہاں شازیہ!“

”جی سر۔“ الارٹ ہوتے ہوئے کہا۔ ”جب یہ مراقبے سے فارغ ہو جائیں تو انہیں اطلاع دے دیجیے گا۔ کانی بہت اچھی بناتی ہیں۔“ شریر مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ آنسوؤں نے جھکے سے سراٹھایا تھا۔ شازیہ مسکراتے ہوئے آنے والی کال کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔  
 آنسوؤں سے ہی دیکھ رہی تھی۔

”ہائے!“ نظریں ملنے پر اس نے ہولے سے کہا تھا۔ پھر پلٹ گیا۔ وہ کئی ٹاپے اس کے اٹھتے قدموں کو دیکھنے لگی یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل بھی ہو گیا۔  
 ”تہہہہہ ہو کیا جاتا ہے سر کو دیکھ کے۔“ شازیہ کال سے نمٹ کے ہنسی۔

”پہلی ملاقات میں ہی سر مندہ کر دیا، مذاق اڑاتے ہیں میری بے وقوفی کا۔“ اس نے جھلاتے ہوئے کہا۔  
 ”سراپیسے نہیں ہیں، یونو پہلے میں سر عریشان کے آفس میں جاب کرتی تھی۔ فیملی پر اہلم پر آفس چھوڑنا پڑا۔“  
 میرے فنانسی کو میرا جاب کرنا پسند نہیں تھا۔ بعد میں اس نے خود ہی منگنی توڑ دی۔ شکر ہے جان چھوٹی، سائنیکو ناپ تھا۔ دوبارہ آفس جوائن کرنے مئی تو ویکسی نہیں تھی۔ سرنے ولید سر کے آفس میں لگوادیا۔ سسر کی شادی میں سرنے بہت ہیلپ کی۔ اگر کسی انسان کا ظاہر و باطن خوب صورت دیکھنا ہو تو سر عریشان کو دیکھ لو۔“ شازیہ پر بھر تعریف کا بھوت چڑھ گیا تھا۔

”ہیں واقعی.....“ عریشان ولی کے سامنے تالو سے لگنے والی زبان چل رہی تھی۔  
 ”نہیں میں جھوٹ بول رہی ہوں۔“ شازیہ نے تیوری چڑھائی۔ ”آنسوؤں کی ہنسی چھوٹ گئی۔“  
 ”اتنا پڑ پڑ سر عریشان کے سامنے کیا کرونا جنہیں دیکھ کر زبان تالو سے لگ جاتی ہے۔“ اب کے شازیہ ہنسی تھی۔ آنسوؤں نے اسے گھورتے چٹکی لی تھی۔

☆.....☆

”میں تمہاری کوئی بکواس سننا نہیں چاہتی۔“ حسنی تیز تیز بولتی لاؤنچ میں داخل ہوئی تھی۔ پیچھے پیچھے شاہ میر بھی تھا۔

”نہیں ضرورت کیا تھی وہاں تماشا کرنے کی۔“ شاہ میر تیز آواز میں کہتا اس کے پیچھے لپکا تھا۔ ماہ پارہ نے اسے منظر کو حیرانی سے دیکھا اور وہ بھی ان کے پیچھے لپکیں۔

کمرے میں داخل ہو کر حمی نے اپنا بیگ گھسیٹ کے نکالا اور کپڑے سوٹ کیس میں ڈالنے لگی۔  
 ”تم پاگل ہو گئی ہو حمی!“ شاہ میر شا کڈ کے عالم میں اس کی حرکت کو دیکھ رہا تھا۔  
 ”تم اتنے گرے ہوئے نکلو گے میں نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔“ حمی آنسو بہاتی دیکھی تھی۔  
 اسے حقیقتاً یہ سب دیکھ کر برا لگا تھا۔

”میں نے ایسا کر دیا۔ فرینڈ تھی۔“ اس نے چڑکے کہا۔  
 ”وہ تو نظر ہی آرہا تھا فرینڈ تھی یا کچھ اور۔“ حمی نے اسے تنبیہی چوتھوں سے گھورا۔  
 ”ملازموں کے سامنے کیسا تماشا کرتے آئے ہو تم لوگ۔“ ماہ پارہ اندر داخل ہوئی تھیں۔  
 ”اپنے بیٹے سے پوچھیں جسے ریسٹورنٹ میں اس کی گرل فرینڈ کے ساتھ پکڑا ہے۔“ حمی نے غصے سے کہا۔  
 ”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے تم نے دیا کیا ہے ان پانچ سالوں میں، اولاد تک کی نعمت سے محروم رکھا ہوا ہے تم نے۔“ شاہ میر آؤٹ آف کنٹرول ہونے لگا۔  
 ”اس میں میرا تصور کیا ہے؟“ حمی کو اس کا طعنہ چابک کی طرح لگا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہ میر کو دیکھ رہی تھی۔

”تو اور کس کا ہے، میں تو کہتی ہوں شاہ میر دوسری شادی کر لو، طلاق دوا سے، اس سے تمہیں اولاد کا سکھ نہیں ملے والا۔“  
 ماہ پارہ نے جلتی پہ تیل ڈالا۔ شاہ میر نے مزید کچھ کہنے سے پرہیز کیا۔ غصے میں دانستہ طور پر وہ حمی کی دھکتی رگ کو چھیڑ گیا تھا۔

حمی وارڈ روپ تک گئی تھی کچھ پیپر ز نکال کر ان تک آئی تھی۔  
 ”یہ ہیں میری رپورٹس جو پازینو ہیں تم اپنے آپ کو چیک کرالو۔ کہیں کمی تمہارے اندر نہ ہو۔“  
 شدید اشتعال سے حمی نے رپورٹس شاہ میر کے منہ پر مار دی تھیں۔ ایک یہ طعنہ اس کا جگر چھانی کرتا تھا  
 آج تو شاہ میر بھی طعنہ دینے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔ حمی آنسو بہاتی اسے دیکھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔  
 شاہ میر شا کڈ کی کیفیت میں اپنے پیروں میں پڑے پیپر ز کو دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆

”نور صاحبہ! آپ نے سلائی کے پیسے پہلے کچھ اور بتائے تھے اب اتنے کم دے رہی ہیں، یہ زیادتی ہے۔“

ہاجرہ بوتیک والی کو سمجھانے کی سعی کر رہی تھیں۔ پہلے کپڑے دیتے ہوئے نور نے زیادہ پیسے بتائے تھے۔ اچھی اجرت ملنے کی امید پر ہاجرہ نے کافی سارا کام لے لیا تھا۔ ان میں سے آدھا جی جان لگا کر وہ وقت سے پہلے مکمل بھی کر چکی تھیں کہ ٹائم پر کام دیکھ کر بوتیک والی خوش ہو جائے گی اور جب وہ کپڑے لینے آئیں تو وقت سے پہلے اور صاف ستھرا کام دیکھ کر خوش بھی ہوں گی مگر جب انہوں نے سلائی کی ادائیگی کی تو کم معاوضہ دیکھ کر ہاجرہ نے انہیں یاد دلایا۔

”میں نے اتنے ہی بتائے تھے آپ کو سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔“ نور نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔  
 ”ایسا کیسے ہو سکتا، جب مجھے یقین ہوا کہ محنت کے اچھے پیسے مل رہے ہیں تب تو میں اور میری بیٹیوں

نے جان مار کر سلائی کی اور پھر آپ نے ار جٹ بھی سلوائے ہیں۔“ ہاجرہ ان کی غلط بیانی پر حیران تھیں۔ کس فرانے سے وہ منہ پر جھوٹ بول رہی تھیں۔

”میں تو اتنے ہی دوں گی، کام کرنا ہے تو کریں۔ ورنہ محنت کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔“ نور صاحبہ نے بے مروتی اور رکھائی کی انتہا کر دی تھی۔ ہاجرہ دکھ کی تصویر بن گئیں۔

”غریب کے ساتھ ہر کوئی زیادتی کرتا ہے مگر کچھ نہیں پاتا، برنس پچ پر چلتا ہے جھوٹ پر نہیں۔“ ہاجرہ کو اپنی بے بسی کا اندازہ تھا۔ وہ اس جھوٹی مکار عورت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔

”میں یہاں ٹیکہ سننے نہیں آئی۔ سلائی میں بھی فنشنگ نہیں۔“ ناقد رانہ نگاہوں سے کپڑوں کو دیکھتے نور نے کام میں نقص نکالنا شروع کر دیا۔ ہاجرہ نے لمبی سانس لی۔

”ٹیکہ ہے آپ ان کے پیسے دیں اور باقی کپڑے لے جائیں ہمیں آپ کا کام نہیں کرنا۔“ جیسی مرضی۔“ نور نے چند سوکے نوٹ نکال کر ہاجرہ کی ہتھیلی پر رکھے اور کپڑے اٹھا کر اپنے ڈرائیور کو پکڑانے لگیں۔

”جھوٹے لوگ.....!“ ہاجرہ پریشانی سے نوٹوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”گھر کا راشن لانا ہے اور یہ.....“ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی تھیں۔ اس آس پر رات دن جاگ کے محنت کی تھی کہ گھر کا راشن آجائے گا مگر غریب جو سوچتا ہے وہ ہوتا کب ہے۔

☆.....☆

”تمہاری روز روز کی آمد کی وجہ آنور تو نہیں؟“ عثمان ولی آج پھر آفس آیا بیٹھا تھا۔ ولید بیسٹ فرینڈ تھا وہ اس کے انداز سے اسے پہچان گیا تھا۔ تب ہی بلا جھجک سوال کر بیٹھا۔

”ہاں!“ اس نے بھی چھوٹے ہی اقرار کر لیا۔

”سیریس ہو؟“ ولید اسے پرکھ رہا تھا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ عثمان ولی کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے تھا۔

”آج سے پہلے تم نے مجھے کسی لڑکی کے لیے اس طرح کی حرکت کرتے دیکھا؟“ عثمان نے الٹا سوال کر دیا۔ ولید نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

”تم اچھی طرح سوچ لو پھر آنور سے بات کرو۔ وہ غریب گھرانے سے ہے۔ چڑا اسی باپ، لوگوں کے کپڑے سیتی ماں اور دو جھوٹی بہنیں ہیں۔ گھر کی کفالت کے لیے نوکری کر رہی ہے۔“ ولید نے اسے سچائی سے آگاہ کیا جو آنور بتا چکی تھی۔

”کلاس کی کوئی پسند نہیں آ رہی تو زبردستی گلے میں گھسنی تو باندھنے سے رہا۔ مجھے آنور سے شادی کرنی ہے کلاس سے نہیں۔ مجھے جس ہم سفر کی تلاش تھی وہ آنور پر آخر ختم ہو گئی ہے۔ میں نے ابھی آنور سے کوئی بات نہیں کی۔ مے لی وہ کہیں انکج ہو۔“ عثمان نے ہر نیچ پر سوچ لیا تھا اور ایسا سوچتے اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا تھا۔ اگر جو ایسا ہوتا اور وہ سر جھٹک رہا تھا۔

”بات تو درست ہے، یہ انھیں تو صرف آنور ہی سمجھا سکتی ہیں۔“ پر سوچ انداز میں کہتے ولید نے انٹرکام اٹھایا۔

”ارے.....!“ عثمان ولی جان گیا تھا وہ کیا کرنے لگا ہے مگر ولید نے جیسے اس کی سنتی نہیں۔ اس نے جو



شان لیا تھا اس پر عمل کرنے لگا۔

”آنور آپ روم میں آئیں۔“

”بہت جلد باز ہو، زندگی میں پہلی بار اس قسم کی جوشن سے واسطہ پڑا ہے، بولنے کے لیے جملے تو سوچ لینے دیتے۔“ عثمان ولی نے اسے گھورتے ہوئے اس کی جلد بازی پر صلا امتیں سنائیں۔

”تو اظہار کرنے جا رہا ہے میرے بھائی، جنگ پر نہیں۔“ ولید کو اسے اس روپ میں دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پیشانی پر انگلیاں چلاتے اس کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

”محبت اچھے اچھوں کو حواس باختہ کر دیتی ہے۔ سارے جملے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ پرسن Experience ہے۔“ ولید اس کی حالت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

”کم ان.....!“

”ریڈی.....!“ پہلا جملہ دروازے پر کھڑی آنور سے کہتے لہجہ دھیمہ کر کے عثمان ولی کو شرارت سے دیکھا۔ عثمان ولی نے بعد میں بدلے لینے کا اشارہ کیا۔ ولید محفوظ ہوا۔

”Yes sir!“ آنور میز سے فاصلے پر آکھڑی ہوئی تھی۔ عثمان ولی نے بے ساختہ اس کی اور دیکھا تھا۔ اتاری رنگ کے سوٹ میں وہ خود بھی اتاری رنگ لپے ہوئے تھی۔ گو اس کے کپڑے معمولی ہوتے تھے مگر کپڑوں کی قسمت جیسے خود جاگ جاتی تھی۔ جب وہ انہیں زیب تن کرتی تھی۔ کچر میں جکڑے آدھے بال بائیں شولڈر پر پڑے تھے۔ دو پنا سلیقے سے دونوں شانوں پر تھا۔

”بیٹھیں۔“ ولید نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”یونو ہمارے آفس میں کام کرنے والے تمام لوگ ایک فیملی ممبر کی طرح ہیں۔“ ولید نے تمہید باندھی۔

”جی سر! مجھے احساس ہے۔“ وہ مودب تھی۔ درپردہ اس تمہید کی وجہ ڈھونڈنے لگی تھی کہ اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی پوریں ایک دوسرے سے دبائے عثمان ولی اسے ہی بغور دیکھ رہا تھا جو اس کی طرف دیکھنے سے بھی احتراز کر رہی تھی۔

”عثمان ولی آپ سے کچھ پرسن باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنے فیصلے میں باختیار ہیں۔ آپ کے فیصلے سے آپ کی جاب پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“ ولید اپنی چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر وہ کمرے سے نکل گیا۔ آنور نے تحیر سے عثمان ولی کو دیکھا کہ اسے مسلسل اپنی اور دیکھتے دیکھ کر اس کی پلکیں خود بہ خود جھپک گئیں۔ کچھ تھا اس کی گہری آنکھوں میں۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ آنور کی ہتھیلیاں نم ہونے لگی تھیں۔ شہادت کی انگلی کو مروڑتی، لب کھینچتی اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔

”آنور میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری زندگی میں آنا چاہیں گی؟“ اُلے ہاتھ کا مکہ بنا کر اس نے اپنے لبوں پر رکھ لیا تھا۔ کہنی گھاس پر تکی ہوئی تھی۔ نظریں آنور پر مرکوز تھیں اور وہ خود بھی آنور شا کڈسی اسے دیکھتی رہ گئی۔

(جاری ہے)

# ہیلاستار

”نیل!“

دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی تھی۔ فخر عالم جو پنگ پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کا نوالہ منہ میں جاتے جاتے رک گیا تھا۔ انہوں نے زور زور سے دستک دینے والے کو ذرا غصیلی نظروں سے دیکھا تھا جو کہ اب اندر آچکا تھا۔ سیدہ جو فرنگ سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لاری تھیں۔ سامنے ستارا کو دیکھ کر مسکرانے لگیں۔



”ارے ستارا کیا ہوا رک کیوں گئیں اندر آؤ کھانا کھاؤ۔“ سیدہ وہیں پانگ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

ستارا جو فخر عالم کو دیکھ کر رک گئی تھی اگر پتا ہوتا کہ وہ گھر میں ہیں تو وہ کبھی یہاں کا رخ نہیں کرتی۔ اس کے بارنگ اڑ چکا تھا۔

”نہیں خالہ بوا دراصل میں نیلی کے پاس آئی تھی اور کھانا تو کھا کر ہی آئی ہوں۔“ ستارا کے چہرے پر نف کے واضح رنگ سیدہ سے چھپے نہیں رہ سکے تھے۔ وہ جانتی تھیں اس کے ڈراور پنچا پاٹ کی وجہ۔

”نہیک ہے نیلما اندر ہے، تم اندر چلی جاؤ اس کے کمرے میں۔“

”بی خالہ!“

## مکمل ناول



بد قسمتی کہ فخر عالم کی سخت گیر آواز نے اس کے قدموں کو زمین پر ہی جکڑ لیا۔

”دروازہ ذرا ہولے سے بجایا کرو یہ کوئی چار سو گز کا بجلہ نہیں ہے جو گھر والے میلوں دور بیٹھے ہوں۔“

”جی فخر بھائی!“ اور پھر وہ تیزی سے اندر نیلی کے کمرے میں بھاگی تھی۔ ستارا کے اس طرح اندھا دھند بھاگنے پر وہ سلگ کر رہ گیا۔

”بے وقوف۔“ اور پھر اپنا کھانا کھانے لگا تھا۔

”ارے بیٹا! مت ڈانٹا کرو دیکھا نہیں کیسے تمہیں دیکھ کر بیچاری کے چہرے کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔“

”اماں لڑکیوں کا اس طرح رہنا مجھے سخت ناپسند ہے۔ ابھی تم نے دیکھا نہیں کہ کیسے پاگلوں کی طرح اندر بھاگی ہے۔ آرام سے بھی تو چلا جاسکتا ہے۔“

”اچھا چھوڑو! ان باتوں کو تم کھانا کھاؤ تمہیں اسٹور سے دیر ہو رہی ہے۔“ سیدہ اس لمبی ہوتی بحث کو سہینٹی ہوئی بولیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ فخر عالم کو زور سے ہنستی بولتی، چنچلی لڑکیوں سے سخت چڑ ہے۔ جب کہ یہ ساری خوبیاں ستارا اور نیلما میں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھیں۔

”ہائے اللہ جان بچی۔“ ستارا دم سے نیلی کے پاس بیٹھی تھی۔ نیلما جو چائے پی رہی تھی۔ ستارا کے یوں اچانک بیٹھنے سے چائے جھلک کر اس کا ہاتھ جلا گئی تھی۔

”پادھشت کیا افتاد آ رہی ہے۔“

”فخر سے بڑھ کر کوئی افتاد ہو سکتی ہے بھلا۔“

”ارے یار! تو تو محتاط رہا کرناں جب وہ گھر میں ہوں تو۔“

”اب مجھے کوئی الہام تھوڑی سی ہوا تھا کہ وہ گھر میں ہیں ورنہ سچی میں اس وقت تو تیرے گھر نہ آتی۔“

”ہاں وہ آج جلدی کھانا کھانے آ گئے ہیں اور جب سے آئے ہیں میں بھی اپنے کمرے میں دیکھی بیٹھی ہوں۔“ اس نے ایک گرم چائے کا گھونٹ لیا۔

”اچھا تو یہ تاخیر یت تو ہے؟ کیوں آئی ہے؟“

”تو پہلے مجھے چائے پلا پھر بتاتی ہوں۔“ ستارا نے نیلی سے آدمی کپ چائے کی پیالی لے لی تھی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

”اب پھوٹ بھی دے بلا وجہ کا تجسس بھیا رہی ہے۔“ نیلی نے گھورتے ہوئے کہا۔ ستارا نے چائے ختم کر کے خالی کپ نیمل پر رکھا۔

”آج اتوار بازار لگا ہے میں تجھے لینے لائی ہوں بازار چلنے کے لیے۔“

”ناپا ماتا میں نہیں جا رہی فخر بھائی گھر میں ہیں خوا خواہ ابھی ٹھیک ٹھاک لیکر سننے کو مل جائے گا۔“ نیلی۔

صاف انکار کیا۔

”ہاں تو ابھی کون چلنے کا بول رہا ہے۔ فخر بھائی جب اسٹور چلے جائیں پھر چلتے ہیں۔“

”اور اتوار بازار سے خریدنا کیا ہے؟“

”رہبانے آج اتوار بازار میں جیولری کا اسٹال لگایا ہے۔“

”اوہ اچھا جیہی میں بولوں اتنی آؤ تالی کیوں ہو رہی ہیں میڈم۔“

”اب پتا چل گیا تو چل جلدی سے تیار ہو جا۔“

”ستارا تو خود تو پھنسے گی مجھے بھی پھنسائے گی۔ پتا نہیں تھے اس لو فر رجب میں کیا نظر آتا ہے جو تجھے وہ اچھا لاتا ہے۔ جی مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔“ نیلی نے برا سامنہ بنایا تھا۔

”محبت اندھی ہوتی ہے میری جان!“

”جی ہاں رجب کو دیکھ کر لگتا ہے کہ تو واقعی پوری طرح اندھی ہو چکی ہے۔“

”اچھا اب زیادہ کواس مت کر جلدی سے میرے ساتھ اتوار بازار چل رجب میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“

”کہاں جاتا ہے؟“ سیدہ کے کانوں میں ستارا کا بس ایک جملہ کانوں میں پڑا تھا۔

”وہ..... وہ..... خالہ۔“

ستارا شپٹا کر رہ گئی اور یہی حالت کچھ نیلی کی بھی تھی۔ کہیں انہوں نے کچھ سن تو نہیں لیا اگر سن لیا تو صحیح لی ثامت آجاتی دونوں کی۔

”اماں! ستارا مجھے بازار چلنے کا بول رہی ہے۔ ہمارے گھر کے قریب میدان میں جو اتوار بازار لگا ہے تا ہاں اسے اس کو کچھ سوٹ خریدنے ہیں۔“ نیلی نے بڑی مشکل سے بات سنبھالی تھی۔ ورنہ سنی تو اس کی بھی گم ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہے تو چلی جاؤ اس میں اتنا گھبرانے والی کیا بات ہے۔“

”خالہ وہ فخر بھائی!“ ستارا کو سب سے زیادہ خوف فخر عالم کا ہی تھا۔ کیوں کہ انہیں لڑکیوں کا بازاروں میں گھومنا سخت ذہر لگتا تھا۔

”فخر اسٹور چلا گیا ہے بلکہ نیلما تم یوں کرو اپنے لیے بھی دولان کے سوٹ خرید لیتا گر میاں آگئی ہیں اور اس رمضان تو گر میاں اپنے عروج پر ہوں گی۔“ سیدہ نے دراز سے اپنا دالٹ نکالا اور دو ہزار نکال کے نیلما کی طرف بڑھائے۔

”سچ اماں!“ خوشی کے مارے اس کی ہانچیں کھل اٹھیں۔ نیلما کو کپڑے بنانے کا بے حد شوق تھا۔ ایک سے ایک لان کے پرنڈ کاٹن کے کڑھائی والے سوٹ اس کی الماری میں بھرے پڑے تھے مگر یہ بھی اس کو گم لگتے تھے۔

وہ دونوں تیار ہو کر باہر نکل گئیں۔ نیلما کی بالکل بے اختیار نظر سامنے والے گھر کی جانب اٹھی تھی۔ وہاں دروازے پر کوئی لڑکا کھڑا تھا۔ اس کی نظریں بھی نیلی پر ہی پڑی تھیں۔ نیلی نے اپنی بڑی سی چادر مزید چہرے پر بٹھائی تھی کہ اس کا آدھا چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا۔

”ستارا!“

”ہاں۔“

”یہ سامنے فریدہ خالہ کے گھر میں کرائے دار آگئے ہیں کیا؟“

”ہاں سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔ چلو اچھا ہے پوری گلی ہماری پر رونق رہتی ہے سوائے فریدہ خالہ کے بچے کے پورشن کے۔ وہاں بھی اب رونق ہو جائے گی اگر فریدہ خالہ بے چاروں کو رکھنے دیں تو۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک کہتی ہے۔“ باتوں باتوں میں اتوار بازار آچکا تھا۔

☆.....☆

عرشان کو آئے ہوئے پورے چھ گھنٹے ہو گئے تھے۔ ابھی تک تو اسے یہاں کوئی مسئلہ درپیش نہیں رہا تھا اور

پھر اسے یہاں کون سا زندگی بھر رہنا تھا۔ صرف ایک ماہ کی تو بات تھی۔ سی اے کے پیپرزدے گا اور پھر واپس کراچی چلا جائے گا۔ یہاں لاہور آنے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ سکون سے پیپرزد کی تیاری کرے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ فی الحال ایک ماہ تک اپنا ٹیل فون آف رکھے گا تاکہ کوئی اسے فون بھی نہ کر سکے۔

ایک کمرہ کرائے پر با آسانی مل گیا تھا کرایہ تھوڑا زیادہ تھا مگر صرف ایک ماہ کا ہی تو دینا تھا۔ وہ یہاں اپنے دوست کے جان پہچان والوں کے ہاں تھا۔ اسی لیے فریدہ خالد نے بغیر کوئی سوال کیے اسے یہاں رہنے کی اجازت دی تھی اور پھر عثمان کی کون سی تانک جھانک کرنے کی عادت تھی۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا عثمان نہایت ہی سویرا اور سنجیدہ خوب صورت و ہر وجاہت شخصیت کا مالک تھا۔ جسے اپنی پڑھائی کے علاوہ کوئی سرور کار نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے پیپر کی تیاری کر چکا تھا تو سوچا تھوڑا ریٹ کر لے۔ باہرنگلی میں شاید کوئی پیشہ بیچنے والا آتا تھا۔ عثمان کی بھوک جاگ اٹھی۔ صبح بھی خالی ایک کپ چائے اور چند بسکٹ کھائے تھے۔

”چلو عثمان ملک دوپہر کے لُچ میں آج بیٹش سے ہی گزارا کرتے ہیں۔“ عثمان ایک لمبی سانس کھینچتا ہوا پلنگ سے کھڑا ہوا۔ وہ باہر دروازے پر آیا مگر جب تک وہ ٹھیلے والا جا چکا تھا۔ سامنے سے دو لڑکیاں باہرنگلی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کی بالکل بے ساختہ نظر اسی کی جانب اٹھی تھی۔ اتفاق کے عثمان کی نظر بھی اسی چہرے پر ٹپک گئی تھی۔ سورج کی تیز تر شعاعوں کی روشنی سے اس کے میدے جیسی رنگت چمکی تھی۔ ان بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں گھبراہٹ کے رنگ ابھرے تو جلدی سے اس لڑکی نے اپنے سر پر چادر کو اپنی دو انگلیوں کی مدد سے آگے کو ہٹھکچھ لیا تھا اور دوسری لڑکی کے ساتھ آگے کو بڑھنے لگی تھی۔ جانے کیوں عثمان کی بے اختیاری نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا اور جب عثمان کو اپنی اس بے اختیاری کا احساس جاگا تو وہ خفیف سا ہو گیا۔ خود کو لسن طعن کرتا وہ واپس اندر چلا گیا تھا۔

☆.....☆

”نیلما! تیار ہو گئیں تو جلدی کرو مجھے اسٹور بھی کھولنا ہے۔“ فخر عالم نے اپنی کلائی میں پینڈ وایج باندھی اور گھڑی میں ٹائم دیکھا جہاں پورے آٹھ بج چکے تھے۔

”بس فخر بھائی آئی۔“ نیلی نے جلدی جلدی اپنے بیگ میں لائے سیدھے نوٹس ٹھونسنے اور باہر نکل آئی۔

”ہزار دفعہ کہا ہے کہ پہلے سے ریڈی ہو جایا کرو مگر نہیں تم سنو تب تاہر روز پندرہ منٹ خود بھی لیٹ ہو جاتی ہو اور مجھے بھی دیر کروا دیتی ہو۔“

”سوری فخر بھائی!“ وہ منمنائی۔

”اچھا اب جلدی کرو۔“ فخر عالم باہر نکلا۔

”ارے ایک منٹ رکو۔“ سیدہ تیزی سے چمن سے برآمد ہوئیں۔

”یہ لو پکڑو ناشتہ بھی جلدی جلدی میں تھوڑا سا ہی کھایا ہے یہ کاج میں کھا لیتا۔“ سیدہ نے ریڈیکلر کالنج بکس نیلما کو تھمایا۔ نیلما نے جلدی سے لُچ بکس اپنے بیگ میں ٹھونسنا اور اپنی پیاری سی اماں کو پیار کرتی باہر نکل گئی۔

”اب ان میڈم کو جلدی سے بلاؤ۔“

”جی۔“ نیلما نے اپنے گھر کے برابر سے لگے ستارے کے گھر کا دروازہ بجایا۔ وہ ایک سینڈ بھی ضائع کیے بغیر باہرنگلی تھی بلکہ وہ تو جیسے انتظار میں ہی آدھے گھنٹہ پہلے دروازے سے گویا لگ کر کھڑی تھی کہ نیلما اس کا دروازہ بجائے اور وہ باہر نکلے ورنہ فخر عالم کے غصے سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔



نیلما اور ستارا کا بچپن ایک ساتھ ہی گزرا تھا۔ دونوں ایک ہی عمر کی تھیں۔ اسکول سے کالج تک کا سفر دونوں نے ایک ساتھ طے کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی ہمراز تھیں۔ ایک دوسرے کی خوشی و غم میں شریک۔ دونوں گھرانوں میں آپس میں کبھی یاد نہیں پڑتا کہ معمولی سی بھی تو تو میں میں ہوئی ہوگی۔ سیدہ اور فرخندہ دونوں سگی بہنیں تو نہیں تھیں مگر بہنوں سے بڑھ کر دونوں ایک دوسرے کو عزیز اور پیاری تھیں۔ سیدہ کے دو بے فخر عالم اور نیلما تھے اور فرخندہ کی صرف ایک ہی بیٹی ستارا۔ نیلما، نیلی کا نام فرخندہ نے ہی رکھا تھا۔ اس کی بیٹی بڑی نیلی آنکھوں کی وجہ سے میدہ جیسی سفید رنگت کھڑے نقوش معصومی بھولی بھالی نیلی آنکھوں والی لکڑیا لگتی تھی۔ چب کہ ستارا بھی پیارے سے نقوش والی ستاروں کی طرح چمکتی روشن آنکھوں والی سیدہ کے لیے بہت خاص تھی۔ سیدہ اور فرخندہ نے کبھی بھی ستارا اور نیلما میں کبھی کوئی فرق نہیں رکھا۔ فخر عالم لباً بڑا گندی رنگت کا مالک کسی ریاست کے شہزادے سے کم نہیں تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد گھر کی سیدہ اور نیلما کی ذمہ داری اسی کے کندھے پر تھی۔ جسے وہ نبھاتا تھا۔ نیلما اور ستارا دونوں کو وہ خود ہی اسکول سے کالج تک چھوڑنے اور لینے جاتا تھا۔ وہ کسی پر بھی رتی بھر بھروسہ نہیں کرتا تھا اور کبھی کبھی تو دونوں فخر عالم کی اس ذمہ داری سے چڑچڑاتا کرتی تھیں۔ زچ ہو جایا کرتی تھیں۔ فخر عالم کے بے انتہا غصے اور سنجیدہ طبیعت سے نیلما اور ستارا دونوں ہی خائف رہتی تھیں۔ بہت سوچ سمجھ کر وہ فخر عالم کے آگے منہ کھولتی تھیں۔

”فخر بھائی!“

فخر عالم اسٹور پر بیٹھا ہاتھ میں ڈائری اور پین لیے اسٹور کا کوئی حساب کر رہا تھا کہ ایک لڑکا آیا۔

”ہاں کہو۔“

”فخر بھائی! یہ سامان کی لسٹ ہے آپ یہ نکال دیجیے میں ذرا آگے سے اپنا ایک کام اور نمٹا کے آجاتا ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے میں نکال دیتا ہوں۔“ فخر عالم نے لسٹ تھام لی تھی۔

”بھائی! ذرا چار انڈے، ایک ڈبل روٹی اور کھن کی چھوٹی ڈبیا تو دینا۔“ ایک خاتون اس دوران آئی تھیں۔

”جی بہن۔“ فخر عالم نے جلدی سے ان خاتون کو فارغ کیا۔

”سلام فخر صاحب! کیسے مزاج ہیں۔“

چھوٹا ہوا بڑا یا چاہے خواتین ہی کیوں نہ ہوں سب فخر عالم کو عزت دیتے تھے اور فخر عالم کو بھی اگر ان لوگوں سے کوئی شکایت نہیں تھی تو گا بکوں کو بھی فخر عالم سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ فخر عالم صاحب حساب کتاب میں بالکل کھرا تھا۔ بالکل خالص اور بچل سامان اپنے اسٹوڈ میں رکھتا تھا۔ اسی لیے زیادہ تر گاہک فخر عالم کی نیک نیتی ایمانداری کی وجہ سے اس کے اسٹور سے چیزیں خریدتے تھے۔

”وعلیکم السلام! الحمد للہ خاوند صاحب آپ سنائیے۔“ فخر عالم نے خوش اخلاقی سے ان سے ہاتھ ملایا تھا۔

”جی اللہ کا احسان ہے۔“

”اچھا فخر صاحب! ہم نے سنا ہے فریدہ خالہ نے اپنے نیچے والا پورشن کرائے پر دے دیا ہے۔“

”ساتو میں نے بھی ہے مگر زیادہ کچھ علم نہیں ہے۔“

”فریدہ خالہ نے ایک نوجوان چمڑے چھانٹ لڑکے کو کمرہ کرائے پر دیا ہے۔ ارے میں کہتا ہوں کیا

ضرورت تھی اگر کرائے پر دینا ہی تھا مگر تو کسی فیملی والے کو دیتیں اب جانے کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ آج کل تو دہشت گرد لوگوں کا گروپ بھی چوری جیسے ادھر ادھر وارداتیں کرتا پھر رہا ہے۔ اب مجھے تو یہ بھی وہم ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خدا نخواستہ بڑا کامیابی سے چوری کر کے آیا ہو یا قتل و قتل کا سلسلہ ہو یا کسی گروپ کا لڑکا ہو کوئی واردات کر کے بھاگا ہو اور پوکیس سے چپتا پھر رہا ہو۔ یار فخر صاحب بہت سے ایسے شک و شبہات نے دل و دماغ میں گھر کر لیا ہے۔ آپ بتائیں اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

”جاوید صاحب! میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا اور آپ تو جانتے ہیں کہ مجھے محلے کی خبر رکھنے کی کوئی عادت نہیں تھوڑا بہت پتا چل جاتا ہے آپ کے ذریعے۔“ فخر عالم نے صاف لاطعلی کا بلا رالہ اظہار کر دیا تھا۔

”خبر رکھا کریں فخر صاحب ہمارے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے آس پڑوس میں کون آ جا رہا ہے۔ سب ہمارے علم میں ہونا چاہیے۔“

”میں معذرت خواہ ہوں جاوید صاحب! مگر یہ سب میرے مزاج کے خلاف ہے۔“ فخر عالم کو ٹوہ لینے کی عادت سے سخت نفرت تھی۔ وہ تو بس اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ہمارے متوسط طبقے میں یہ ساری باتیں یہ حرکتیں ایک دوسرے کے گھروں میں تاک تک جھانک کر ناجو ب مشغلہ تھا۔

”اسی اثناء میں جاوید صاحب کا فون بجنے لگا تو وہ چلے گئے۔“

رات کو فخر عالم اپنا اسٹور بند کر کے گھر جانے لگا تھا۔ گھر کے قریب پہنچا کہ بلا ارادہ ہی نظر سامنے فریدہ خالہ کے گھر پر پڑی۔ قدم خود خود فریدہ خالہ کے گھر کی جانب بڑھنے لگے۔ فخر عالم کی ہانک کی آواز پر اندر سے نیلی نے دروازہ کھول کر باہر جھانک کر وہاں تو فخر عالم نہ ارد۔ سامنے نظر اٹھی تو فخر عالم کو فریدہ خالہ کے کرائے دار کے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ نیلما نے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر اندر واپس سیدہ کے پاس آئی۔

”اماں فخر بھائی فریدہ خالہ کے کرائے دار کے کیوں گئے ہیں؟“

”اچھا پتا نہیں بیٹا، ہو سکتا ہے کوئی کام ہو۔ اچھا تم یوں کرو جلدی سے دسترخوان لگاواتے میں فخر بھی آ جائے گا۔“ سیدہ نے نیلی سے دسترخوان اٹھا کے نیلما کو تھمایا۔ دس منٹ بعد فخر عالم بھی آ گیا تھا اور دسترخوان بھی لگ چکا تھا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! چلو فخر بیٹا جلدی سے آ جاؤ کھانا گرم ہے۔“ نیلما اور سیدہ دونوں دسترخوان پر بیٹھ چکی تھیں۔

”بس میں ہاتھ منہ دھو کر آتا ہوں۔“ فخر عالم واش بیسن کی جانب بڑھ گیا۔

”نیلی اچھی سی چائے بناؤ آج سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔“ فخر عالم ڈرائنگ روم میں جاتے جاتے بولا تھا۔

”جی بھائی! ابھی بنا دیتی ہوں۔“ دسترخوان نیلما نے سیٹ لیا اتنی دیر میں نیلما نے برتن دھوئے تو چائے بھی تیار ہو گئی تھی۔ وہ تین کپ گرم چائے کے ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔ ایک ایک کپ فخر عالم اور اماں کو دیا اور اپنا کپ لیے وہ سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹی دی پر کوئی ڈرامہ آرہا تھا وہی دیکھنے لگی۔

”فخر ابھی تم فریدہ خالہ کے کرائے دار کے گئے تھے۔“ سیدہ نے بہت عام سے لب و لہجہ میں پوچھا تھا۔

”جی اماں! مرثان نام ہے۔ یہاں اپنی پڑھائی کے سلسلے میں آیا ہے۔ وہ بھی صرف ایک مہینے کے لیے۔“

راہی میں رہتا ہے۔ مجھے تو کوئی خرابی نہیں لگی عرشان میں۔ لوگوں نے جانے کیوں اتنی افواہیں پھیلائی  
لی ہیں عرشان کے خلاف۔“ فخر عالم نے گرم چائے کا ایک سپ لیا۔

”ٹھیک کہتے ہو ماشاء اللہ سے بہت نیک اور سعادت مند بچہ ہے۔ دوپہر کو مجھے دودھ منگوانا تھا میں نے  
ان بچے سے کہا۔ کہنے لگا آئی میں وہیں آگے تک جا رہا ہوں لا دوں گا۔“ نیلما کا تو جیسے ایک ایک عضو  
مات بنا ہوا تھا۔ اس کے نیلے جمیل جیسی کانچ پر عرشان کا عکس ابھرا تھا۔

”اس محلے کے لوگ بھی نہ بس ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔“ فخر عالم کی چائے ختم ہو چکی  
تھی۔ خالی کپ اس نے نیمل پر رکھا۔

”خیر ہمیں کسی سے کیا لینا دینا عرشان فریدہ خالہ کے جان پہچان کا لڑکا ہے اس لیے اکیلے اسے رکھا ہے۔  
کمر اس کے جانے کے بعد وہ کسی فیملی کو ہی رکھیں گی۔“

”ہاں مجھے بھی یہ ہی بتا رہی تھیں فریدہ خالہ۔“  
”اور تم سناؤ نیلی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟“ فخر عالم نے اچانک ہی سوال کیا تھا کہ وہ گھبرا کے رہ گئی تھی۔

”جج..... جی فخر بھائی اچھی چل رہی ہے۔“  
”گڈ! فرسٹ ایئر کی طرح فائنل میں بھی مجھے تمہارا گریڈ اے ون ہی چاہیے۔“ نہایت بخیدگی سے کہتے

ہے وہ کھڑا ہو گیا۔  
”کیوں نہیں انشاء اللہ میری بچی اتنی محنت کرتی ہے تو صلہ تو ملے گا ہی نا۔“ سیدہ نے جائنا نظروں سے

لینا کود دیکھا۔  
”ہوں..... اچھا اماں آج میں بہت تھک گیا ہوں سونے جا رہا ہوں، شب بخیر۔“

”شب بخیر بیٹا!“ سیدہ نے فخر عالم کو مسکراتی ہوئی اور نظرات تاری نظروں سے دیکھا۔  
”نیلی بیٹا!“

”جی اماں!“  
”جاؤ جا کر تیل لے آؤ میں تمہارے سر میں تیل ڈال دوں گی۔“

”جی اچھا۔“ وہ اپنی خالی پیالی اور فخر عالم، سیدہ کی خالی پیالی اٹھائے کچن میں چلی آئی۔  
☆.....☆

ستارا اپنی دیوار سے لگی لکڑی کی سیڑھی پر چڑھتی ہوئی سیدہ کے گھر میں جھانکنے لگی۔ اس نے ادھر ادھر  
دیکھا فخر عالم کہیں نہیں تھا جس کا مطلب تھا وہ اپنے کمرے میں سو گیا ہے۔ نظر محسن پر پڑی جہاں چار پائی پچھی

ہوئی تھی۔ چادر کو خود کو پورا ڈھانپنے سے سو رہا تھا ہونہ ہو یہ یقیناً نیلی ہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ رات کو اس کا  
انتظار کرے گی۔ دیوار پھلانگ کر آجائے اور ستارا کو دلچسپ کے بارے میں کچھ خاص بھی بتاتا تھا۔

”نیلی نیلی!“ ستارا نے بہت آہستہ آواز میں اس کو پکارنا شروع کیا مگر وہ بھی شاید سارے گھوڑوں کا  
اطمینان سچ کر سوئی تھی۔ انتظار کرنے پر بھی نیلی ٹس سے مس نہ ہوئی ستارا کو غصہ آ گیا۔ اس نے سوچ لیا کہ اسے

اب کیا کرنا چاہیے۔ ستارا نے دیوار پر چڑھ کر جو پھلانگ پٹنگ پر لگائی تو سیدہ حانیلی کے اوپر ہی مگر تھی۔  
”یادداشت.....!“ فخر عالم نے چادر ہٹائی اپنے چہرے سے تو اپنے اوپر ستارا کو پایا اور جو ستارا نے فخر

مالم کو دیکھا تو اس کا سانس رک گیا اب تو قیامت کا وقت تھا۔ اس نے چھلانگ بھی لگائی تو کس پر۔ چہرے پر

ڈر و خوف کے سائے تیزی سے منزل لانے لگے تھے۔ ستاروں کی روشنیوں سے بھری آنکھوں میں اپنی موت نظر آنے لگی۔

”فخر بھائی!“ سوکھے ہونٹوں پر کچکی سی تھمی مگر مقابل بھی کون تھا فخر عالم وہ خاموشی سے بس اس کو گھور رہا تھا۔ ستارا کو ایسا لگا جیسے ابھی ثابت مسلم ہی نکل جائے گا۔ بہت ساری ہمت جمع کر کے وہ فخر کے اوپر سے اٹھنے لگی تھی کہ چادر پر ایک بار پیرا نکا تو وہ دوبارہ ہے وہ اس کے وسیع سینے پر گر کر بیٹھی۔

”سو..... سو..... ری..... فخر بھائی! وہ میں..... میں نیلی سے ملنے.....“ حلق سے گویا دل باہر نکلنے کو تھا۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں وہ اپنے آنے کا مقصد بتانے لگی تھی۔

”ایک منٹ۔“ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی تو فخر عالم نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور نہایت احتیاط سے وہ نرم وجود خود سے الگ کیا۔

ستارا نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اندھا دھند اندر نیلی کے کمرے میں بھاگی تھی۔ دل خوف سے بری طرح دھڑکے جا رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد فخر عالم کے عنائی گداز لبوں پر مسکراہٹ کی ایک تحریر رقم ہونے لگی تھی۔ دل کا اس طرح دھڑکنے کوئی اور ہی کہانی سنار ہا تھا۔ آنکھوں کی پٹیوں پر اس کا خوف زدہ چہرہ گویا چپک کر رہ گیا تھا کہ اچانک ہی اس کی مسکرائی نظر فرش پر مڑے تو بے سفید سے کاغذ پر پڑی۔ فخر عالم نے جھک کر وہ کاغذ اٹھا لیا، اسے کھولا تو خوشبو جو ناک کے تختوں تک پہنچی تو دماغ پر لگی۔ اس سفید کاغذ پر کبھی تحریر کو جو پڑھنا شروع کیا تو آنکھوں کے سرخ ڈورے بہت واضح ہونے لگے تھے۔

”نیلی.....“ ستارا بھاگتی ہوئی جھٹ سے نیلما کے گلے سے لگی تھی۔ ستارا کے یوں گلے سے کٹنے پر نیلی پریشان ہو گئی۔

”ستارا کیا ہوا سب خیریت تو ہے؟ میں کب سے تمہارا ویٹ کر رہی ہوں۔ ارے اب کچھ بولے گی بھی یا یوں ہی گلے لگے سکیاں لیتی رہے گی۔“

”مت بوجھ نیلی آج میں نے بہت قریب سے اپنی موت دیکھی ہے۔“ اس کی نظروں میں فخر عالم کا سنجیدہ چہرہ ایک بار پھر محسوس کیا تھا۔

”کیوں ایسا کیا دیکھ لیا۔“ نیلما نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے اس کے گھبرائے چہرے کو دیکھا تھا اور پھر اس نے خود پر مبنی روداد اس کو سنائی جسے سن کر جہاں نیلما کو ہنسی تو آئی بہت مگر پھر فکر مند ہوتے ہوئے بولی۔

”خود تو ڈانٹ کھانا سو کھانا مجھے بھی چھنوا دے گی۔ اب دیکھنا صبح کتنا بڑا لٹکے پھر دیں گے بھائی، ان کو سب پتا چل جائے گا کہ رات کو دونوں اس طرح ایک دوسرے کی دیوار پھٹا گئی ہیں۔“

”ہاں مگر ابھی تو سوچ ابھی میں کیا کروں۔ میں تو نہیں جا رہی باہر۔“ ستارا نے ڈرتے ہوئے کہا اور نیلما کے ہلکے بریٹھ گئی۔

”تو ٹھیک ہے آج ہم دونوں جاگ کر خوب ساری باتیں کریں گے۔“ نیلما بھی خوش ہوتی اس کے برابر میں آ بیٹھی۔

”صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔“ مگر صبح کا سورج دونوں کے لیے خوب گرم ثابت ہوا۔ فرخندہ اور سیدہ نے اچھی خاصی کلاس لی تھی دونوں کی، ستارا اور نیلما دونوں ہی سر کو جھکائے ڈانٹ سستی رہیں مگر جو سب سے حیران

ان بات تھی وہ یہ کہ فخر عالم کرسی پر بیٹھا بالکل خاموش تھا ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بلکہ ناشتہ کر کے اسٹور چلا گیا۔  
آج ان دونوں کا کالج جانا بھی کینسل ہو گیا تھا۔ سارا دن دونوں نے ایک ساتھ گزارا تھا۔ فرخندہ بھی سیدہ  
لے کمر پر ہی رہی تھیں۔

”پتہ نہیں کب عقل آئے گی دونوں کو۔“ فرخندہ نے ستارا اور نیلما کو دیکھا جو باورچی خانے میں تھمی  
نیکرونی بنا رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ ہنسی مذاق بھی جاری تھا۔

”مجھے تو ستارا کی زیادہ فکر ہے۔ نیلما سے زیادہ بچپنا کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے۔“  
”ارے فرخندہ! پریشان مت ہو، یہی فکر مند جب اپنی عملی زندگی میں قدم رکھیں گی تو خود ہی عقل آ جائے  
گی۔“ سیدہ نے پیار بھری نظروں سے اپنی آنگن کی ان دو چھبکتی چڑیوں کو دیکھا۔

☆.....☆

”ستارا ایک بار پھر سوچ لے کہ کہیں ہم دونوں کی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔“ نیلما نے ستارا کو خوف زدہ  
نظروں سے دیکھا تھا۔ چہرے پر ہزار ڈر و خوف کے رنگ منڈلا رہے تھے۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا ہے نیلی میں واقعی راجہ کے بغیر مرنے والی ہوں گی اس نے کہا تھا کہ اس  
نے اپنا رشتہ بھیجا تھا مگر ماں نے منع کر دیا بلکہ سختی سے ان لوگوں کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا تھا۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے۔ ستارا لیکن اس مسئلے کو ایک بار پھر بیٹھ کے سنجیدگی سے حل کیا جاسکتا ہے ہو سکتا  
ہے۔ فائیت کی کوئی راہ نکل آئے گھر سے بھاگنا کیا یہ ٹھیک رہے گا۔“ نیلما کے دل و دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں  
زدور دھور سے بج رہی تھیں۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ بہت غلط ہونے والا ہے بہت برا ہونے والا ہے۔“

”نیلی اب تو جا..... راجہ دور رہا۔“ ستارا نے دور سے ہی راجہ کو دیکھ لیا تھا جو اس کو دیکھ کر ہاتھ ہلار رہا تھا۔  
”ستارا ایک بار پھر سوچ لے۔“ ہاتھ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا جو کہ نیلما نے ایک بار پھر تھام لیا۔

”اب سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفلوج ہو چکی ہیں نیلی، اللہ حافظ۔“ اور پھر نیلما سے ہاتھ چھڑایا  
اور راجہ کی طرف بڑھ گئی۔ نیلی نے ایک آخری نظر ستارا کو دیکھا اور پھر دل کو سنبھالتی واپس قدموں کو موڑ گئی  
اسے شدت سے ایک بات کا احساس جاگا تھا کہ جو ہوا ہے غلط ہوا ہے اور اگر اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو وہ  
شاید پتھر کی بن جائے گی۔

ستارا اور نیلما کالج سے جلدی نکل گئی تھیں۔ ستارا نے اپنی دوستی اور محبت کے واسطے دے کر اس کو زیر کر لیا  
تھا مگر گلی کے کونے پر آ کر اس کو یہ احساس بھی جاگا کہ فرخندہ خالہ کو کیا جواب دے گی۔ گھبراہٹ کے مارے وہ  
پوری پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ ایک تو آج سورج بھی پوری آب و تاب سے ہر سو پیش بکھیر رہا تھا۔ ایسا  
خسوس ہوا کہ ہر کوئی اسی کو دیکھ رہا ہے۔ پیچھے کچھ قدموں کی آواز پر اس کا دل مزید سبے جارہا تھا۔ اپنے  
دروازے پر ایک دو عورتیں بھی کھڑی تھیں۔ جن کی نظر اسی پر تھی۔ جن سے وہ جلد از جلد بھاگ جانا چاہتی  
تھی۔ چھپ جانا چاہتی تھی مگر جب بد قسمتی دروازے پر کھڑی ہو تو ساری خوش قسمتی خوش نصیبی کے دروازے  
بند ہو جاتے ہیں۔ اس کے گھر کے دروازے پر بڑا سا تالا لگا اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس  
پر زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔ اب کہاں جائے وہ فرخندہ خالہ کے جانی سے تو ایک ہزار سوال اس کو کٹھنرے  
میں کھڑا کر دیں گے۔ جائے پناہ کی کوئی توجہ ہو..... پیچھے پلٹ کر اگر دیکھے گی تو مرجائے گی۔ اچانک اس کی  
نظر فریدہ خالہ کے گھر کی جانب گئی۔ کرائے دار کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر وہ تیزی سے

عرشان کے پورشن میں کھس گئی۔

”ارے یہ تو نیلی بھی ناسیدہ بہن کی بیٹی۔“

”یہ تو فخر بھائی کی بہن ہے مگر یہ اس کرائے دار کے گھر میں کیوں گئی ہے اور یہاں تو کوئی لیڈر بھی نہیں رہتی۔“ نگلی میں بہت سے لوگوں نے یہ منظر دیکھا تھا۔ اپنے اپنے دروازے پر کھڑی خواتین تو انکشت بدنداں ہو کر رہ گئیں تو پیچھے کچھ مرد حضرات حیرانگی کا پیکر بنے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

”اچھا تو سیدہ بہن کے گھر میں تالا لگا ہے جیسی تو نیلمہ نے فائدہ اٹھالیا۔ چلو بھی جلدی چلو کہیں کوئی غلطی نہ کر لیں دونوں۔“ ایک مجمع لگ چکا تھا۔ مرد اور محلے کی خواتین، عرشان کے دروازے پر اکٹھا ہو چکے تھے۔

”ارے حیراد ہاں دیکھ فخر عالم تیرے بیٹے راجہ کو کیسے مارتا ہوا لارہا ہے۔“ محلے کی خواتین انجوائے منٹ سمجھ کر فریاد خالہ کے گھر کے پاس اکٹھا تھیں۔ انہی میں سے ایک عورت نے زور سے بولتے ہوئے کہا تھا۔

حیرانے نخت جگر کو اس طرح پینٹا دیکھ کر سینے پر ہاتھ مارتی تیزی سے بھاگی۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم کیوں اس طرح میرے بیٹے کو مار رہے ہو۔“ حیرانے فخر عالم کے شکبے سے راجہ کو جیل کی طرح جھٹا تھا اور خود سے جھٹالیا تھا۔ اس کے منہ سے اور ناک سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی۔

”پوچھیے اپنے سپوت سے کہ ستارا کو کہاں لے کر بھاگ رہا تھا۔“ فخر عالم کے چہرے پر زمانے بھر کا غصہ تھا۔ حیرانے راجہ کو پھر فخر عالم کے پیچھے بھرموں کی طرح سر کو جھکائے روٹی ہوئی ستارا کو دیکھا جس نے بڑی سی چادر میں خود کو چھپا رکھا تھا۔

”ارے اتنے ہی خدا کی فوجدار نے پھرتے ہو ذرا خود اپنے گھر میں بھی جھانک کے دیکھو تمہاری بہن اس چلچلاتی دھوپ میں اپنے ماں بھائی کی آنکھ میں دھول جھونک کر فریاد خالہ کے کرائے دار کے گھر میں اسکی کیا کر رہی ہے۔“ حیرانے اپنے نخت جگر کا بہتا خون ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ گویا وہ زخمی شیرنی بن گئی تھی۔ جیسے کسی نے اس کو انگاروں پر کھینچ لیا ہو۔

”اور وہ لڑکا گھر میں اکیلا رہتا ہے اور میرا بیٹا بھلا کیوں لے کر بھاگے گا، اسی ستارا کی بچی نے بھلایا پھلایا ہوگا۔ بھلا میرا معصوم بچہ کیوں ایسی بے ہودہ حرکتیں کرنے لگا۔“

”اماں تم ٹھیک کہتی ہو ستارانے ہی مجھے کہا تھا کہ آؤ بھاگ چلیں۔“ راجہ نے صاف اپنا دامن بچا تھا۔ فخر عالم نے نہایت گھور کر دیکھا تھا۔ وہ ہاتھ بڑھانے لگا کہ اس کا گریبان پکڑ کے زمین پر پرتیخ کر مارے مگر حیرانے اس کو پیچھے کر لیا۔

محلے والوں کے ہاتھ گویا ایک مزرے دار حما موضوع گفتگو لگ گیا ایک تماشہ شور شرابہ۔

☆.....☆

”سیدہ دیکھ یہ دو پڈکتنا خوب صورت ہے نا اس پر گوٹے اور کرن کا سارا کام میں نے اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔“ فرخندہ نے آرگنر انشو کا پورا دو پڈ پھیلایا۔

”ایسا ہی ایک سرخ دو پڈ میں نے نیلی کے لیے بھی بنایا ہے۔“

”فرخندہ ماشاء اللہ بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔ میں بہت جلد ستارا کو لے جاؤں گی بس یہ انٹر کا امتحان دے لے تو گھر میں شادیانے کی ڈھونکی رکھوں گی۔“ سیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے فرخندہ یہ نگلی میں اتنا شور شرابہ کیسا ہے۔“ اچانک ہی جب شور شرابہ چیخ و پکار مچی تو دونوں کھڑی

ہو گئیں۔

”ہاں سیدہ اللہ رحم کرے چلو آؤ دیکھتے ہیں۔“

جب دروازے پر دونوں آئیں تو پوری گلی مرد عورتوں سے بھری پڑی تھی۔ فرخندہ کی نظر ستارہ پر پڑی ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ تیزی سے اس کے پاس آئیں۔ فخر عالم حیران سے کیوں اس قدر اونچی آواز میں بات کر رہا تھا۔ کچھ لمبے نہیں پڑ رہا تھا۔ سیدہ بھی فرخندہ کے پیچھے جانے لگی تھیں کہ محلے کی ایک اور عورت سیدہ کا ہاتھ پکڑے۔ مٹی ہوئی فریدہ خالہ کے دروازے پر لے آئی تھی۔ نیلما کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے وہ اپنی جان بچانے کے خاطر آ تو مٹی لیکن جانے کہاں.....! وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جہاں ایک پٹنگ اور کرسی میز کے علاوہ کچھ نہیں رکھا تھا۔ ایک سفری بیگ تھا جو بیک تھا۔ میز پر کچھ کتابیں رجسٹر قلم وغیرہ رکھے تھے۔ پٹنگ پر پر پل ٹکری ٹرٹ رکھی تھی۔ ہاتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آئی جس کا مطلب تھا کہ ان سب سامان کا مالک ہاتھ روم میں نہار ہا تھا۔ نیلما ایک سائیز دیوار سے جا لگی گلی میں چہل پہل ہو رہی تھی۔ سو چاہیہ چہل پہل کم ہو تو وہ یہاں سے نکل جائے گی۔ کوئی پندرہ منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اس کو یہاں کمرے کے کمرے، گلی میں شور شراب۔ چہل پہل کم کیا ہوئی مزید سے مزید چیخ پکار بڑھ ہی گیا تھا۔ نیلما کا تودل ہی بیٹھا جا رہا تھا۔ ہاتھ خنڈے ہوئے تو دونوں پاؤں شل ہونے کے ساتھ ساتھ کپکپا بھی رہے تھے۔ دل تو جیسے ابھی پسلیوں سے نکل کر باہر آ جائے گا۔ نیلما بھیل آبشار کی طرح بہنے لگے تھے یہ احساس جلد ہی ہو گیا کہ وہ اب پھنس چکی ہے۔

”یامیرے رب میری مدد کر۔“ نیلما نے سرچمٹ کی طرف اٹھا کے رب سے مدد طلب کی۔ اسی اثناء میں عرشان بھی ہاتھ روم سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ گلی میں جب اس قدر چیخ و پکار ہوئی تو عرشان کے کان میں بھی پڑی مگر وہ کدھے اچکا کر رہ گیا مگر جب نہادھو کر باہر نکلا تو صبح معنوں میں الجھ کر رہ گیا بالکل سامنے ہی دیوار سے لگی اس انجان سی لڑکی کو دیکھا جو راز و قطار رو رہی تھی۔

”ایکسکوزی۔“ عرشان کی سنجیدہ آواز پر نیلما نے نظر اٹھا کے دیکھا تو جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ عرشان نے بلیک جینز کے علاوہ اپنے کمرتی وجود پر اور کچھ نہیں ڈالا ہوا تھا۔ نہانے کی وجہ سے بالوں سے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ عرشان نے وہ سارے ٹپکے بال دونوں ہاتھوں سے پیچھے کیے تھے۔

”کیا میں جان سکتا ہوں آپ کون ہیں اور یہاں میرے روم میں کیا کر رہی ہیں؟“ عرشان کے چہرے پر ہلاکی سنجیدگی تھی۔

”نیلما.....!“

اچانک ہی سیدہ اور فریدہ خالہ اندر داخل ہوئی تھیں۔ نیلما نے سیدہ کا چہرہ دیکھا تو بھاگ کر ان کے گلے سے لگی اور سینے سے لگ کر بلک بلک کر رو دی تھی۔

”عرشان یہ سب کیا ہے؟“

”فریدہ خالہ نے مشکوک نظروں سے اس کو دیکھا اور ان نظروں میں جولا تعداد سوالات تھے۔ عرشان صبح معنوں میں چکر اکر رہ گیا تھا۔ وہ کوئی ٹین ایجر لڑکا تو نہیں تھا کہ فریدہ خالہ کی آنکھوں کے سوالات اور سیدہ کے چہرے پر لکھی تحریر اور سب سے بڑھ کر سیدہ کے سینے میں چھپی روٹی بھٹی نیلی کارونا نہیں سمجھ سکتا۔ کیا مطلب لے وہ اس بات کا، کیا نیلما نے جان کر اس کو پھنسا یا ہے یا بات اور کچھ ہے۔

سیدہ، نیلما کو خود سے لگائے عریشان کے گھر سے باہر نکلی تھیں مگر فریدہ خالہ، عریشان کو چھوڑنے والی نہیں تھیں۔

”تمہارے بارے میں میرے بیٹے حمزہ نے سب کچھ بتایا ہوا ہے کراچی میں میرا بھتیجا بھی فون پر تمہارے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔ تمہارے کردار کے بارے میں مجھے رتی بھر شک و شبہ نہیں مگر یہ جو سب نظریں دیکھ رہی ہیں ان میں کیا سچائی ہے وہ سب تم مجھے سچ بتانا کیونکہ نیلما اور اس کے گھر والوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ لوگ ایک شریف اور عزت دار سبھے ہوئے لوگ ہیں۔ نیلما کو میں اپنی بیٹی کی طرح ہی سمجھتی ہوں میں نے بھی اس کے کردار میں کوئی جھول کوئی خرابی نہیں دیکھی۔ وہ بچی میرے سامنے کی بچی ہے۔“

”پلیز آئی آپ نے جو دیکھا، جو سمجھا وہ سب ایک غلط فہمی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ان میں کوئی حقیقت کوئی سچائی نہیں ہے۔ میں خود نہیں جانتا یہ سب کیا ہے۔“

رش ختم ہو چکا تھا سب اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے مگر کچھ عورتیں حمیرا کے گھر میں اکٹھی ہو گئی تھیں اور خوب مریج سالہ لے کر پٹنارہ لے رہی تھیں۔ حمزہ لے رہی تھیں سب کی زبانوں پر دو نام تھے۔ ”نیلما اور ستارا“ یہ ٹاپک تو جانے کتنا عرصہ چلے گئی دونوں تک لوگ اس واقعے کو دہرائیں گے۔ جب تک اور کوئی ٹاپک اور کوئی واقعہ رونما نہیں ہو جاتا۔

”چنانچہ.....!“ نہایت زور سے فخر عالم نے نیلما کے منہ پر تھپڑ مارا تھا کہ وہ نیچے فرش پر گر پڑی۔

”فخر اصل بات کیا ہے وہ بتاؤ یقین کر دو راہبر اس کا تصور ہوا تو میں خود تمہارے سامنے اس کا گلا گھونٹ کے مار دوں گی یا زہر دے کر مار دوں گی۔ زندہ درگور کر دوں گی۔“ سیدہ نے طیش میں فرش پر پڑی نیلما کو گھورا تھا۔

”یہ دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دے رہی تھیں۔ آج اگر میں بروقت ریلوے اسٹیشن نہ پہنچتا تو راجہ ستارا کو لے کر نہ جانے کہاں لے جا چکا ہوتا۔ راجہ کوئی شریف قسم کا لڑکا نہیں ہے ایک آوارہ مفت قسم کا لڑکا ہے جو کچھ وہ ستارا کے ساتھ کرتا وہ مجھے بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اس سے آگے میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا ستارا کے لیے۔“ فخر عالم نے فرخندہ کے برابر میں بیٹھی روٹی سسکتی سر کو جھکائے ستارا کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

”فخر بیٹا! اگر تم اس کو وہیں چلتی ٹرین کے آگے دھکا بھی دے دیتے تو خدا کی قسم میں اف نہیں کرتی تم نے بہت غلط کیا اس کو یہاں میرے پاس واپس لا کر۔“ فرخندہ نے آنسو بھری آنکھوں سے فخر عالم کو دیکھا۔ ”کاش کے یہ پیدا ہوتے ہی مرجانی محلے میں اتنی بدنامی اتنی بے عزتی تو نہ اٹھانی پڑتی سرتو دور، نظر اٹھا کر چلنے کے قابل تک نہیں رکھا ان دونوں نے۔“ فرخندہ، سیدہ ایک دوسرے کا سہارا تھیں۔ دونوں ہی اس بے عزتی پر تڑپ کر رہ گئیں۔ فخر عالم نے سر دسانس لیا اور ستارا نیلما کو گھورتے ہوئے اندر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆.....☆

عریشان کے پاس دوسرے دن فرخندہ، سیدہ اور فریدہ خالہ چلی آئیں۔

عریشان جوانا بیگ پیک کر چکا تھا اس کو آئے پورا ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ اس کے پیپر ز ختم ہو گئے تھے۔ اب کراچی اپنے گھر جانے کی تیاری تھی۔ بیگ کی زپ بند کیے وہ سفری بیگ اٹھائے باہر نکلے گا تھا کہ ان تینوں کو اچانک گھر میں آتا دیکھ کر وہ بھی کے عالم میں دیکھنے لگا۔



”بیٹا عریشان یہ سیدہ ہے نیلی کی امی۔“ فریدہ خالہ نے تعارف کرایا اور پھر اپنے یہاں آنے کا مدعا بھی پیش کیا۔

”جی.....“ وہ شاکرہ گھبراہٹ سے کہنے لگی۔

”یہ کیسے ممکن ہے فریدہ! آئی آپ جانتی ہیں اس میں میرا رتی بھر بھی قصور نہیں ہے۔“  
 ”بیٹا قصور تو ہمارا بھی نہیں ہے مگر پھر بھی ہماری بچی کی ذات پر انگلیاں اٹھانی جا رہی ہیں۔“ فرخندہ نے التجائی نظروں سے دیکھا تھا۔

تینوں نے مل کر بہت منت و ساجت کی تھی مگر عریشان کسی طور نیلما سے نکاح پر رضامند نہیں تھا۔ بالآخر بہت سوچ بچار کے بعد بہت اللہ رسول کے واسطے دیے ہاتھ جوڑ دیے مگر عریشان کی ”نہ“ ”ہاں“ میں نہیں بدلی تھی۔ سیدہ نے اپنے سر پر اوڑھی چادر اتار کر عریشان کے قدموں میں ڈال دی اور خود بھی اس کے قدموں میں بیٹھ گئیں۔

”ارے ارے! آئی خدا کے لیے ایسا مت کیجیے کیوں مجھے گناہ گار کر رہی ہیں۔ آپ بالکل میری ماما کی طرح ہیں میرے لیے قابل عزت و احترام والی ہستی ہیں۔“ عریشان نے فوراً سے بیشتر سیدہ کو اٹھایا اور ان کی چادر ان کے اوپر ڈال دی۔

تو پھر اپنی ماما کے صدمے ہی میری نیلی کو اپنا اور نہ لوگ میری بچی کا جینا حرام کر دیں گے کوئی اس کو اپنی زندگی میں شامل کرنا پسند نہیں کرے گا۔ آپ کو آپ کے چاہنے والے کا واسطہ دیتی ہوں۔ میری نیلی سے نکاح کر لیں اسے اس دوزخ سے نکال کر لے جائیں۔ انجانے اور نادانستی میں بہت بڑی غلطی نیلی سے سرزد ہو گئی ہے۔“

سیدہ ہلکے ہلکے کر رہ رہی تھیں، تڑپ رہی تھیں۔ عریشان کا نرم و ملائم دل یہ سب دیکھ نہیں سکا اس سے زیادہ دیر برداشت نہیں ہوا۔ اس نے اپنا سفری بیگ اپنے کندھے اتارا اور فریدہ خالہ کے پاس چلتا ہوا آگیا۔

”میں اس نکاح کے لیے تیار ہوں۔“

عریشان کی رضامندی جیسے جسم میں ایک نئی روح پھونک گئی تھی۔ کانوں میں خوشی کے شادیاں سے بجنے لگے تھے۔

کوئی ایک گھنٹہ کی کارروائی تھی نیلما، عریشان کے نکاح میں آگئی تھی۔

”جیتے رہو بیٹا! آپ نے جو مجھ پر احسان کیا ہے وہ میں مر کر بھی نہیں چکا سکتی۔“ سیدہ نے عریشان کو تشکرانہ نظروں سے دیکھا تھا مگر عریشان نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اس کو اب جلد از جلد کراچی پہنچنا تھا۔ اپنے گھر اپنوں کے پاس۔ اس لمحے وہ جتنا بچتا تا تم تھا۔ اس کا لاہور آنے کا فیصلہ اس کے لیے نہایت بھاری پڑ گیا تھا۔ نیلما عریشان کے ساتھ کراچی جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہو رہی تھی کہ تڑپتی ہوئی واپس سیدہ کے کٹے سے لگی تھی۔ ان کی جدائی کا درد جسم کے ہر عضو سے عیاں تھا۔ باپ کی طرح چاہنے والا بھائی اس سے سخت باراض تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ یہ غم بہ درد جانے اور کتنا اٹھانا پڑے۔ جان سے عزیز ہمارا ز خوش دم دکھ و سکھ کی ساتھی بہن جیسی دوست اس سے مل نہیں سکی تھی۔ وہ ان سب کے بغیر اکیلی انجان لوگوں میں کیسے رہ پائے گی۔

”بس کرو بیٹا جو ہو گیا اب تمہیں زندگی میں آگے بڑھنا ہے یہ جو کچھ ہوا تم لوگوں کی غلطی کی سزا ہے جو تم لوگوں کے ساتھ ہمیں بھی جھگڑتی پڑے گی۔“ فرخندہ نے نیلما کو سیدہ سے الگ کیا۔ عثمان کے چہرے پر بے زاری تھی۔ نیل کو اس طرح روتا دیکھ کر وہ شدید کوفت کا شکار ہوا تھا۔  
ریل گاڑی نے سائرن دینا شروع کر دیا تھا کہ بس اب چلے ہی گئی ہے ٹرین.....!  
”ایک تو یہ محترمہ.....“ وہ برا سامنے بتاتے ہوئے اوپر چڑھ گیا تھا۔  
”چلیں.....!“ دل تو کر رہا تھا کہ پلیز اس بن بلائے مصیبت کو اپنے پاس ہی رکھیں مگر مجبوری آڑے آگئی۔

”جاؤ..... جاؤ.....“ سیدہ نے نیلما کو فرخندہ سے سختی سے الگ کیا اور ٹرین کی طرف ہولے سے دھکا دیا۔  
”یہ ہی تمہاری سزا ہے کہ تم اپنوں سے دور رہو ان کی شکل دیکھنے کو ترس جاؤ۔“  
”اماں.....“ مگر فرخندہ کا ہاتھ تھامے وہ رخ پھیرتی جانے والے راستے کی طرف بولیں وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھیں۔

”اماں.....“ نیلما نے تڑپ کر ہاتھ آگے بڑھا دیا وہ آگے بڑھتی کہ عثمان نے اس کی نازک کلائی پکڑی اور اپنی جانب کھینچ لیا مبادا وہ پھر سے سیدہ کی طرف نہ چلی جائے۔  
گھر آ کر سیدہ فرخندہ کے گلے سے لگ کر بہت روئیں یہاں تک کہ بچکیاں بندھ گئیں۔ فخر عالم اپنے روم سے باہر نکلا تھا۔  
”میں نے اس گھر کو سیل کر دیا ہے۔ اب ہم یہاں نہیں رہیں گے اور دوسرا یہ کہ میں ستارا سے سادگی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔“  
”فخر بیٹا!“ فرط جذبات سے فرخندہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔  
”پلیز فرخندہ خالد اب کوئی بات مزید نہیں ہوگی اور گھر میں نے بڑا خریدا ہے ہم سب ایک ساتھ مل کر رہیں گے۔“ فخر عالم سبیدگی سے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆.....☆

جملہ عروسی میں ستارا فخر عالم کے بیڈ روم میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ شرمندگی کے مارے نظروں کو جھکائے سر کو جھکائے وہ مجرم بنی ہوئی تھی۔ اس دن کے بعد سے آج اس کا سامنا فخر عالم سے ہو گا نہ جانے کیسا بڑا تاؤ ہو گا اس نے تو تصور میں بھی فخر عالم سے شادی کا نہیں سوچا تھا۔  
فخر عالم کاشن کے سفید شلوار کرتے میں لباسِ انٹر ہوا۔ اس کی آہٹ اس کی کلون اور پرفیوم کی خوشبو کی آمد پر اس کا دل مزید بری طرح دھڑکا تھا۔ فخر عالم آگے بڑھا اور پیڈ کے پاس کھڑا کافی دیر تک سرخ شرارے میں دلہن بنی سر کو جھکائے ستارا کو دیکھتا رہا۔ کوئی پانچ منٹ تو گزر رہی گئی ہوں گے۔ آخر کار وہ ایک ٹھنڈی سرد سانس کھینچتا اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ جیب سے کچھ نکالا اور اس کے سامنے کر دیا۔  
”یہ تمہاری رونمائی..... لو.....“ ستارا نے نظراٹھا کے فخر عالم کا پھیلا ہوا ہاتھ دیکھا۔ چوڑی ہتھیلی پر ایک سفید کلر کا پرچہ تھا۔ ستارا نے سوالیہ نظروں سے اس سفید پرچے کو دیکھنے کے بعد ناگہی کی کیفیت میں فخر عالم کو دیکھا۔ جس کے سیاہ کانچ میں کچھ تو ایسا تھا کہ ستارا کو انا دل کھینچتا ہوا لگا۔  
”پکڑو اسے۔“ فخر عالم نے ذرا سختی سے کہا تو ستارا نے وہ کاغذ کپکپاتے ہاتھوں سے اٹھالیا۔

”اب اس کو کھولا اور پڑھو۔“ وہی سخت انداز۔

ستار نے جب اس سفید کاغذ کو کھولا تو ایسا لگا کہ اس گھر کی پوری چھت اس کے سر پر آگری ہو۔ یہ تو وہی پرچہ بلکہ خط تھا جو رجبہ نے آخری بار اس کو دیا تھا مگر یہ فخر عالم کے پاس کیسے..... اوہ جتنا سوچتی اتنا داغ بھیننے لگا۔

”میں نے کہا پڑھو اسے۔“ وہ آہستگی سے دہاڑا تھا۔ شیر جیسی دہاڑا اور چٹکھٹا پرستار ابری طرح سہم کر رہ گئی۔ آنکھوں میں ایک سمندر سا بھرنے لگا تھا۔

”پیار..... پیار..... پیار..... ر..... ر..... ر..... ی..... ی..... ی..... ست..... را.....“

”اسٹاپ اسٹ۔“ فخر عالم زور سے چیخا۔

”اس طرح ایک ایک کرنہیں اسی طرح پڑھو جس طرح پہلی بار پڑھا تھا۔“ فخر عالم نے غصے سے مگھورتے ہوئے شہادت کی انگلی اٹھا کر وارن کیا تھا۔

ستارا خوف زدہ ہو کر مزید خود میں سٹ کر رہ گئی تھی۔

”پیار سی ستارا..... یہ ظالم سماج ہمیں ملنے نہیں دے گا۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ دل و جان سے چاہتا ہوں..... تم اگر نہ ملیں تو میں مری جاؤں گا اور میں جانتا ہوں یہ ہی حال تمہارا بھی ہے۔ تو کیوں ناں ہم بھاگ چلیں۔ اس دنیا سے ان لوگوں سے چھپ کر اپنا نیا جہاں بنائیں گے..... تمہارا چاہنے والا..... رجبہ..... تمہیں بہت جلد بتاؤں گا کہ ہم کب یہاں سے بہت دور سب کو چھوڑ کے چلے جائیں گے..... اپنی رانی کا رجبہ۔“ ڈیڈ پالی آنکھوں سمیت کانپتے ہوئے ستارا نے رجبہ کا وہ خط پڑھا تھا۔ سمندر سے بھری آنکھیں اس نے بہت ڈرتے ڈرتے اوپر اٹھائیں تھیں۔ فخر عالم کے چہرے پر زمانے بھر کی سنجیدگی، سختی، نفرت کیا کچھ نہیں تھا اور شاید فخر عالم کا ضبط اس کا مبر جواب دے گیا تھا۔ اس نے ایک زنانے دار بھڑ ستارہ کے گال پر سید کیا کہ چار کی چار سرخ انگلیاں اس کے رخسار پر ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔ فخر عالم کا دار سہ نہیں پائی تھی اور ایک جانب کوڑا لڑائی تھی۔ فخر عالم نے اس کا بازو قہراً ایک جھٹکے سے اس کو اپنی جانب کھینچا کہ وہ جتنی ہوتی اس سے آگئی تھی۔

”میں نے اپنے جذبے اپنی محبت تمہارے لیے سینٹ سینٹ کر رکھے، کبھی اس میں خیانت کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں کبھی کسی غیر لڑکی کو نظر اٹھا کر دیکھا نہیں کیونکہ میرے دل میری آنکھوں میں صرف اور صرف تمہارا چہرہ تمہارا عکس تھا یہ دل تمہاری محبت سے آباد تھا۔ دل کے ایک کونے میں تمہارے لیے سارے جذبے ساری محبت چھپا کر رکھی تھی کہ آج اس دن سب کچھ تم پر عیاں کروں گا۔ ان آنکھوں میں تمہارے سنے ہوئے تھے۔ جس کی تعبیر آج کے دن حاصل کرنی تھی..... مگر..... تم نے سب کچھ ختم کر دیا۔ تم نے میری محبت، میرے پاکیزہ جذبوں کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا..... میری آنکھوں سے اپنے پیار کے سنے بے دردی سے نوح ڈالے۔ مذاق بنادیا میرا..... آج لگ رہا ہے جیسے میرا اپنا تم میری محبت مجھ پر ہنس رہی ہے۔ قہقہہ لگا رہی ہے اور ان سب کی وجہ صرف ایک وجود ہے اور وہ ہے تمہارا وجود۔“ بازو پر ان مضبوط انگلیوں کی سختی مزید سخت ہو گئی تھی۔

”نفرت ہو گئی ہے مجھے تم سے تمہارے وجود سے۔ کراہیت آرہی ہے تمہارے وجود سے گھن محسوس ہو رہی ہے تمہارے اس چہرے سے۔ تم نے میرا اعتبار، اعتماد، بھروسہ، یقین سب چٹکا چور کر دیا کرچی کرچی

کردیا۔“ جبکہ جسکے سے فخر عالم نے اس کو پکڑ کے کھینچا تھا اپنی جانب اس سے کہیں زیادہ جھٹکے سے فخر عالم نے ستارا کو خود سے الگ کیا تھا کہ بیک کراؤن کی دراز اس کے سر پر لگی تھی کہ وہ کراہ کے رہ گئی مگر اس تکلیف اس درد سے زیادہ تکلیف یہ تکلیف تھی جو فخر عالم کے ہونٹوں کے الفاظ تھے جو اس کے دل پر برقی بن کر چبھ کر اس کا دل زخم زخم کر گئے تھے۔ فخر عالم نے اس کو کیا سمجھا اور وہ کیا لگی وہ تو شاید اس کے قدموں کی دھول بھی نہیں تھی۔ اس سے ایسی سنگین غلطی سرزد ہوئی تھی جس کی حلانی یا معافی نہیں تھی صرف اور صرف سزا ہی۔

”اور ایک بات۔“ فخر عالم کھڑا ہو گیا تھا۔ واپس پلٹا اور جھک کر ان ستاروں بھری آنکھوں میں جھانکا جہاں اب نہ وہ پہلے جیسی چمک دمک تھی اور نہ ہی اس کا عکس۔

”تمہاری ایک خوش فہمی تو دور کر دوں رولہ تمہیں کراچی پہنچنے کے لیے لے جا رہا تھا نہ کہ تمہارے ساتھ گھر بسا نہ..... تم جیسی بے وقوف لڑکیاں ہی رولہ جیسے آوارہ بد معاش لوگوں کو بڑھا دیتی ہیں، ان کو شہ دیتی ہیں۔ میں نے اگر تم پر نظر نہ رکھی ہوتی تو آج تم یوں اس سرخ جوڑے میں میرے سامنے میرے بیڈروم میں لیٹن بنی نہ ہوتیں بلکہ کسی ہول کے روم میں کسی کا دل پھلا رہی ہوتیں کسی حسن بازار کی زینت بنی پاؤں میں ٹھنکرو باغیچے بگڑے رئیس زادوں کے آگے ناچ کر رقص کر کے ان کو خوش کر رہی ہوتیں۔“ اور پھر فخر عالم رکائیں وہاں سے ہٹا چلا گیا تھا۔

کتنی بڑی گالی دے گیا تھا وہ..... کہ خود اس کو اپنے وجود سے گھن آ رہی تھی۔ اپنے ہی وجود سے غلاعت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ جو ہار سنگھار کیا تھا ہاتھوں میں چوڑیاں پاؤں میں پائل ماتھے پر بندیا جھومر گلے میں ہار یہ زیورات جو اس کے جسم پر سجائے گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بہت سے سانپ پھوڑ ہر لیے کیڑے کوڑے اس کے جسم پر چپے ہوئے تھے اس کے مساموں میں رینگ رہے ہوں دیمک کی طرح اس کو نوچ رہے ہوں، کھا رہے ہوں۔

ستارے روتے ہوئے ایک ایک زبور خود سے نوچ نوچ کر دور پھینکا۔ وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ فخر کی کڑوی سچائی نے اس کو کتنی ہی گہری کھائی میں دفن دیا تھا۔ اپنی وقعت اپنا مقام اپنی حیثیت اس نے اپنے ہاتھوں سے گنوا دی تھی۔ اپنی عزت و آبرو اپنی سوانیت پر خود اس نے اپنے ہاتھوں سے داغ لگا دیے تھے۔ فخر عالم نے اس کو اس کی اوقات دکھا دی تھی۔ وہ جگہ دکھا دی تھی جو اس کی تھی۔ دل تو دور فخر عالم نے تو اپنے قدموں میں بھی اس کو جگہ نہیں دی تھی۔ یہ پوری سیاہ رات اس کے نصیب کو بھی سیاہ کرتی چلی گئی تھی۔ وہ پوری رات اس نے ماتم کرتے گزار دی تھی۔

☆.....☆

”السلام علیکم!“ عثمان کی یکدم سے آتی آواز پر عالم ملک نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

”عثمان میری جان! عالم ملک صوفی سے انھیں اور تیزی سے عثمان کی جانب بڑھیں۔“

”مما!“

عثمان نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے جس میں عالم ملک سا گھٹیں۔

”کیسے ہو میری جان! کہاں تھے اس طرح بھی بھلا کوئی غائب ہوتا ہے۔ کتنے دن میں نے تڑپ تڑپ کر گزارے ہیں کچھ اندازہ بھی ہے۔“

”آئی نومما! آئی نو..... بت آپ تو جانتی تھیں تاکہ میں سی اے کے پیپر زدوں کا جس کے لیے مجھے ہر

سال میں آپ لوگوں سے دور جانا پڑے گا ورنہ ڈیڈ مجھے زبردستی برنس میں انوالو کر دیں گے۔“ وہ عالمہ ملک کے بالوں میں بوسہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔  
 ”ہاں تو کچھ غلط تھوڑی تھا۔ ہمارا جو کچھ بھی ہے اتنے بڑے پیانے پر پھیلا برنس آپ دونوں بھائیوں کا ہی تو ہے۔“

”بٹ ماما میرا سی اے کرنا پھر بھی ضروری تھا۔“  
 ”ہاں جا ہے اس عرصے میں آپ کی ماما کی جان ہی کیوں نہ چلی جاتی۔“  
 ”اللہ نہ کرے ماما! آپ کو میری عمر بھی لگ جائے۔“ عثمان نے جلدی عالمہ ملک کے ہونٹوں پر اپنی پوڑی پھیل رکھ دی۔

”مامی چاچو.....“ تین سالہ ارمان بھاگتا ہوا عثمان کے پیروں سے لگا تھا۔  
 ”چاچو کی جان!“ عثمان نے اپنے لاڈلے اکلوتے بھتیجے کو گود میں اٹھالیا تھا اور خوب چٹا چٹا پیار کیا۔  
 ”عثمان.....!“

”السلام علیکم ساریہ بھابی۔“ عثمان نے ساریہ کو مسکراتی نظروں سے دیکھا۔  
 ”جیتے رہو جیتے رہو۔ تو جناب دیور صاحب گھر سے دور رہنے کا شوق پورا ہو گیا۔“ ساریہ نے پر مزاج انداز میں عثمان کو چھیڑا تھا۔

”جی ساریہ بھابی دونوں شوق پورے ہو گئے۔“  
 ”تو کیا سارہا تجربہ۔“

”گھر سے ایٹوں سے دور رہنے میں بہت تکلیف ہے۔ سچ بہت مس کیا آپ سب کو۔“ عثمان کی کاہلی بہندی آنکھوں میں گزرے دن کے روز و شب گھوم گئے۔

”تو محترم عثمان ملک فیصلہ بھی تو آپ کا تھا ہم سے دور جانے کا۔“ پیچھے سے شبیر کی آواز ابھری تھی۔  
 عثمان نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو اس کا بڑا بھائی دوست شبیر کھڑا تھا جس کے چہرے پر عثمان کو دیکھ کر خوشی کے ہزاروں لاکھوں رنگ تھے۔ عثمان نے ارمان کو نیچے اتارا اور آگے بڑھ کر شبیر کے گلے سے لگ گیا۔

”عثمان!“ عالمہ کی پکار پر عثمان شبیر سے الگ ہوا تھا۔

”جی ماما!“

”یہ لڑکی کون ہے؟“

”اوہ شٹ!“

عثمان کو جتنا افسوس ہوتا تھا۔ اتنی دیر ہو گئی تھی مگر نیلما کا کسی سے تعارف کروانا یا یہی نہیں رہا اور وہ تو ایسے بھی سوچ چکا تھا۔ ٹرین کے سفر میں کہ کیا کہہ کر نیلما کو گھر والوں سے ملواتا ہے۔

”ماما یہ نیلما ہیں۔“ عثمان نے یاد ای ٹکری بڑی سی چادر میں لپیٹ لڑکی کا تعارف کرایا تھا۔ ساریہ اور شبیر کی نظر بھی سر کو تھم رہے جھکائے نیلما پر بھی۔

”لاہور میں فخر عالم سے میری بہت اچھی جان پہچان ہوئی سمجھے بہت کلوز فرینڈ شپ ہو گئی تھی۔ یہ انہی کی بہن ہیں انچھو ٹکی کسی غلطی کی بنا پر پولیس نے ان کے بھائی فخر عالم کو اریسٹ کر لیا ہے اور جب تک جرم غلط

ثابت نہیں ہو جاتا ان کو جیل میں ہی رکھیں گے۔ وہاں لاہور میں فخر عالم کا کوئی اپنا رشتہ دار نہیں ہے بلکہ پوری دنیا میں یہ ایکلی ہیں تو فخر عالم نے ہی مجھ سے بہت ریکویسٹ کی کہ کچھ دنوں تک میں ان کو کراچی اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں فخر عالم جیسے ہی رہا ہوتے ہیں وہ فوراً سے پیشتر اپنی بہن کو لے جائیں گے۔“ جو کچھ اس نے سوچا وہ سب کہہ ڈالا تھا۔ من گھڑت کہانی آرام آرام سے ان لوگوں کے گوش گزار کر دی۔

”مما کیا میں نے کچھ غلط کیا؟“ عریشان نے عالمہ سے سوال کیا۔  
 ”نہیں میرے چاند تم نے بالکل کچھ غلط نہیں کیا جو کیا نیکی کے لیے کیا۔ مجھے بہت خوشی ہے بلکہ یہ یہاں جب تک چاہے رہ سکتی ہیں۔ ہمیں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ عالمہ ملک کے چہرے پر نیلما کے لیے خاص پسندیدگی کے رنگ تھے۔

”کیوں ساریہ تم کیا کہتی ہو؟“ عالمہ ملک نے ساریہ کو دیکھا۔  
 ”مما آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں ہمیں قبول ہے۔ اچھا ہے عریشان کی نیکی میں ہم بھی کچھ حصے دار بن جائیں۔“ ساریہ نے خوش دلی سے کہتے ہوئے نیلما کو دیکھا۔  
 ”کیا نام ہے تمہارا؟“ ساریہ نے نیلما کو مخاطب کیا تھا۔

”جی نیلما.....!“ نیلما نے اپنی نیلی نیلی آنکھیں اوپر کو اٹھائی تھیں۔  
 ”ارے ساریہ یہ بالکل نیلی آنکھوں والی گر یا نہیں لگ رہی۔“ مخمیری پلکوں کی باز اٹھائے گرانے پر وہ بالکل کانچ کی نیلی آنکھوں والی ڈول ہی لگ رہی تھی۔ جس کا عالمہ ملک نے بلا جھجک اعتراف کر دیا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ ممّا۔“ ساریہ نے بھی مسکرا کر نیلما کو دیکھا تھا۔  
 ”یار آپ کو کچھ اندازہ ہے میں یہاں کتنی دیر سے کھڑا ہوں۔“ عریشان نیلی آنکھوں والی ڈول کے ٹاپک سے اب بھر ہونے لگا تھا۔ بلکہ شدید کوفت کا شکار ہونے لگا تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے بیڈروم میں جانا چاہتا تھا۔

”ہاں یار کافی ٹائم ہو گیا تم یوں کرو اپنے بیڈروم میں جا کر آرام کرو رات کے ڈنر میں ڈیڈ سمیت ملاقات ہوگی۔“ شمیمہ نے عریشان کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا۔  
 ”ساریہ یوں کرو دیرے برابر والا جو روم ہے وہ کھلوادو وہاں نیلما رہ لیں گی۔“  
 ”جی ممّا! میں ابھی نوری سے کہہ کر تھوڑی بہت صفائی کروا دیتی ہوں۔“ ساریہ مسکراتی ہوئی نوری کو بلانے چلی گئی۔

”آؤ بیٹا! تم یہاں آؤ جب تک میرے ساتھ.....!“ عالمہ ملک نے نیلما کی موی گلابی کلائی تھامی اور اپنے ساتھ ہال میں لے آئیں۔

☆.....☆

صبح معمول سے ہٹ کر تھی۔ گھر میں خاموشی سنانے کا ہر طرف راج تھا اور یہی خاموشی اور سناٹا ستارا کے اندر گھر کر چکا تھا جس سے شاید مرنے کے بعد ہی چھٹکارا مل سکتا تھا۔ پرانا محلہ پرانا گھر بے شک وہ لوگ چھوڑ چکے تھے مگر وہ تکلیف دہ باتیں وہ کاٹ دار زہریلی نظریں وہ دل میں تیر کی طرح پیوست یادیں ہمیشہ اس کا پیچھے کرتی رہیں گی۔  
 پوری رات تو ویسے بھی اس نے روتے جاتے گزار دی تھی۔ آنکھ بھی لگی تو جب اللہ رب العزت سے اپنے

مگنا ہوں کی معافی کا وقت جا چکا تھا۔ صبح فجر کی اذانوں میں اس کی آنکھ لگی تھی۔ اس وقت بھی صبح ساڑھے دس بجے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ کمرے میں ایک طائرانہ نظر ڈالی تو کمرہ خالی اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ فخر عالم بیڈروم میں نہیں تھا۔ شاید وہ اسٹور جا چکا تھا۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ سامنے ہی تخت پر سیدہ اور فرخندہ بیٹھی مڑ پھیل رہی تھیں۔

”السلام علیکم!“ ستار نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔

”علیکم السلام جیتی رہو خوش رہو صد سہاگن رہو۔“ سیدہ نے مڑ چھوڑے اور اٹھ کر ستار کو گلے سے لگا کر اس کی پیشانی پر پیار کیا۔ جب کہ فرخندہ نے بری طرح اس کو نظر انداز کیا اور اٹھ کر وہاں سے اندر اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ یہ منظر ستار کی ستار جیسی آنکھوں میں دکھ کے آنسو بھر گیا تھا۔ اپنی ذات مزید زمین کی گہرائیوں میں دفن ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ دل خون کے آنسوؤں سے لگا تھا۔ ستار کی نظروں کے ارتکاز پہلے سیدہ نے بھی دیکھا تھا۔ تخت پر اب وہاں فرخندہ نہیں تھیں۔ جس کا مطلب وہ ستار کو دیکھتے ہی اندر چلی گئی تھیں ان کی ناراضی بھی اپنی جگہ درست تھی مگر سیدہ نے بہت سمجھایا فرخندہ کسی طور ستار کو معاف کرنے کے حق میں نہیں تھیں۔

”فکر مت کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا بہت جلد..... تمہاری امی ابھی تم سے ناراض ہیں۔ غصے میں ہیں مگر بہت جلد سب بھول بھال کے تمہیں گلے سے لگائیں گی۔ ماں اپنی اولاد سے زیادہ دن تک ناراض نہیں رہ سکتی۔ دینی غصے سے تم زیادہ پریشان مت ہو۔“ سیدہ نے بہت پیار سے ستار کو سمجھاتے ہوئے ایک بار پھر اس کی پیشانی پر پیار کیا تھا۔

F امی مجھ سے جائزہ ناراض ہیں۔ سیدہ خالہ میں نے غلطی نہیں بہت بڑا گناہ کیا ہے ان کا اعتبار توڑا ہے ان کے بھروسے ان کے اعتماد کا ٹل گیا ہے۔ مجھے سزا ملنی چاہیے۔“ ان ستاروں بھری آنکھوں سے چند موٹی ٹوٹ کر رخسار پر نکھرتے چلے گئے تھے۔

”دعا کرو میری جان! اچھا یہ بتاؤ رات فجر نے تو کچھ نہیں کہا۔“ سیدہ ایک ماں تھیں انہوں نے ستار کے چہرے پر بہت کچھ کھوج لیا تھا۔ ایک رات کی دلہن کے چہرے سے وہ قوس و قزح کے ساتوں چمکتے دکتے رنگ منقود تھے جو ہونے چاہئیں بلکہ ستار کا بابا یاں رخسار کچھ سرخ ہو رہا تھا۔ جسے ستار نے بڑی مہارت سے میک اپ سے چھپا لیا تھا۔

”ستارا.....!“

”جج..... جی!“ ستار ابری طرح چونک کر رہ گئی۔ اس کی سوچوں کے سارے دھاگے رات کی کہانی میں الجھ چکے تھے۔ فخر عالم کا تھپڑ اتنی زور سے نہیں لگا تھا جتنا اس کے لفظوں نے اس کا جو دھچکائی کر دیا تھا۔ اس کی روح پر ایسی ضرب لگائی کہ مرنے کے بعد قبر میں بھی بے سکونی رہے گی۔ سوچوں کا تسلسل جانے اور کتنی گہرائی تک پہنچتا کہ سیدہ کی آواز نے حال کی دنیا میں پہنچ لیا۔

”کیا بات ہے چہرے پر یہ ادا سی کیوں ہے۔ آنکھوں میں یہ ویرانی کیوں ہے..... مجھے اپنی ستار اچلے والی چاہیے ویسی ہی ہنستی ٹھٹھکلائی رونتی نکمیری آنکھوں میں ستاروں کی مانند روشنی چھلکانی۔“

”آپ کو نیلی یاد نہیں آتی؟“ ستار کے اچانک پوچھے گئے سوال پر سیدہ خاموش ہو کر رہ گئیں۔ حالانکہ اس نے تو کوئی غلطی بھی نہیں کی تھی۔ کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی قصور وار ٹھہرائی گئی۔ پھر اتنی بڑی سزا کیوں

ملی اسے..... سیدہ خالہ یہ میری لگائی ہوئی آگ تھی جس میں نیلی بجاری بھی لپیٹ میں آگئی میں تو آپ لوگوں کی نظروں کے سامنے ہوں مگر نیلی کو جدائی کی یہ کھن سزا کیوں دی تھیں اپنے آپ سے دور کر دیا۔“ سیدہ نے اب بھی کچھ نہیں کہا سوائے خاموشی سے دیکھنے کے۔

”دیکھو گیارہ بج گئے ہیں میں تمہارے لیے ناشتہ بنا کے لاتی ہوں۔“ سیدہ مکمل طور پر اس کی باتوں کو نظر انداز کیے کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

”سیدہ خالہ یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔“ ستارا نے سیدہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سیدہ نے پیچھے پلٹ کر اپنا ہاتھ ستارا کے ہاتھ میں دیکھا پھر ستارا کو دیکھنے لگیں۔

”تم بیٹھو میں ناشتہ لارہی ہوں۔“ سیدہ نے ستارا کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے آرام سے ہٹایا اور آگے گئیں۔ ستارا نے نہایت دکھ سے جانی ہوئی سیدہ کو دیکھا۔

☆.....☆

”ٹھک ٹھک ٹھک۔“ دروازے پر ہولے سے دستک دی گئی تھی۔ اگر جناب کی اجازت ہو تو کیا میں اندر آ سکتی ہوں۔“ عثمان جو لپٹاپ پر کوئی کام کر رہا تھا۔ کا ہی مہندی آنکھوں کو لپٹاپ کی اسکرین سے ہٹا کر دروازے کی جانب دیکھا۔

”اوہ ہائے رخسار اندر آؤ نا۔“ عثمان نے لپٹاپ آف کر دیا۔ سائیڈ میں رکھ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ رخسار اندر داخل ہو گئی اس کے چہرے پر ناراضی اور غصے کے واضح رنگ تھے۔

”چلو شکرت تم کو میرا نام تو یاد رہا ورنہ میں بھی مجھے بھولنے کے ساتھ ساتھ میرا نام بھی تمہارے ذہن کی ish اسکرین سے مٹ چکا ہے۔“ ناراضی سے بولتی ہوئی وہ اندر داخل ہوئی۔

”ارے یار تم تو سمجھا کرو۔“

”جی میں سمجھا کروں مگر بندے کو کم از کم اتنا بے حس بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ایک کال یا ٹیکسٹ ہی کر دیا جائے مگر کال یا ٹیکسٹ تو دور محترم نے فون تک آف کر دیا تھا۔ وہ بھی پورا ایک مہینہ۔“ شکایتوں کا پورا انبار کھول دیا تھا۔

”اوکے اوکے بابا لگتا ہے گھر میں سب سے زیادہ تم ہی ناراض ہو۔“

”کیوں نہیں ہونا چاہیے؟“ التماساں دے رہا تھا۔ عثمان نے مسکرا کے سر نیچے جھکا لیا اور سر جھکانے لگا۔

”ٹھک ہے اب بتاؤ ناراضی دور کرنے کے لیے کیا کیا جائے۔“

”غصے کی ہے تو سزا بھی ملے گی اور سزا یہ ہے کہ آج کا سارا وقت تم میرے ساتھ گزارو گے۔“

”اوکے ڈن میں اپنی اچھی سی دوست کو منانے کے لیے یہ تو کر ہی سکتا ہوں۔“ عثمان آگے بڑھا اور

رخسار سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا جیسے رخسار نے تمام لیا تھا۔

”ارے واہ ہم تو سمجھے تھے خدا نخواستہ یہاں بہت بڑی جنگ چھڑ گئی ہوگی، کرے کی ہر شے تمہیں نہیں

دوچکی ہوگی مگر صلح تو جلدی ہی ہوگئی۔“

سارے دو گلاس جوس کے لائی گئیں۔

”جی نہیں سارے بھائی میری دوست بہت اچھی ہے۔ مجھ سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتی۔“ عثمان نے

خیر انداز میں اس کو دیکھا تھا۔



”جیسی تو تم میری چھوٹی سی بہن کی اس خوبی کا فائدہ اٹھاتے ہو۔“ ساریہ نے چاہ سے اپنی چھوٹی بہن رخسار کو دیکھا۔

”ساریہ بھابی رخسار آپ کی بہن بعد میں اور میری بیسٹ فرینڈ پہلے ہے۔“ عرشان نے ٹرے سے اورنج جوس کا گلاس اٹھالیا تھا اور دوسرا گلاس اٹھا کر رخسار کو تھمایا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ آج کیا ایجنڈا بنایا جائے۔“

”ساریہ آپ آج کا پورا دن ہم نے پلان کر لیا ہے لچ اور ڈنر ہم باہر ہی کریں گے۔“ رخسار نے خوشی خوشی بتایا۔

”زبردست بھی تو کیا آپ لوگوں میں کسی تیسرے فرد کی گنجائش نکلتی ہے۔“ ساریہ کا اشارہ خود اپنی

جانب تھا۔

”بالکل بھی نہیں۔“ رخسار نے صاف انکار کیا اور خالی گلاس واپس ٹرے میں رکھ دیا۔ ”عرشان نے بھی جوس ختم کر کے خالی گلاس ٹرے میں رکھا جو ساریہ کے ہاتھ میں تھی۔

”بھئی یہ مسئلہ اب آپ دونوں ہمیں حل کریں میری طرف سے تو کھلی آفر ہے کہ آپ ہمیں جوائن کر سکتی ہیں۔“

”جی نہیں مجھے کباب میں ہڈی بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ ساریہ نے عرشان کو جواب دیا۔ عرشان ہولے سے ہنس دیا۔

”میں تیار ہو جاؤں پھر نکلتے ہیں۔“ عرشان نے اپنی وارڈروب سے اپنی بیگر شدہ جنیز اور ریڈی ٹی شرٹ نکالی اور ڈریسنگ روم میں مرس گیا۔

رخسار کی نظریں ڈریسنگ روم کے دروازے پر تنگ مئی تھیں جہاں ابھی عرشان گیا تھا۔ ساریہ نے اس کی نظروں کے چلتے دیپ دیکھ لیے تھے۔

”بہت جلد انشاء اللہ تم عرشان سمیت اس بیڈ روم کی ہر شے کی غیر شراکت مالک ہوگی۔“ ساریہ نے رخسار کے گال پر ہاتھ پھیرا۔ رخسار نے ساریہ کو دیکھا۔

”سچ.....!“

”بالکل سچ..... کل ہی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ ہم بہت جلد رخسار کو یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لے آئیں گے تاکہ عرشان کے ٹیل ڈالی جاسکے۔“

”اوہ ساریہ آپ آئی آپ نہیں جانتیں آپ نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے۔“ رخسار ساریہ کے گلے سے لگی تھی۔ چہرے پر خوشی کے لاکھوں رنگ کھل اٹھے تھے۔

”میں سب جانتی ہوں تمہاری دیوانگی اور محبت سے واقف ہوں۔“

”چلو بھی آئی ایم ریڈی۔“ اسی اثناء میں فل تیار عرشان ڈریسنگ روم سے نکل آیا۔

”جاؤ۔“ ساریہ نے ان کے ساتھ کی ڈھیروں دعائیں دی تھیں۔

☆.....☆

”یہ لو میں تمہارے لیے کچھ کپڑے خرید کے لائی ہوں۔ تم پر اچھے لگیں گے لو پہن کے دیکھو نا پ وغیرہ تو سب ٹھیک ہے نا۔“ ساریہ نے بہت سے شاہنگ بیگز نیلما کو تھما دیے۔

”آپ نے اتنے بہت سے خرید لیے میرے لیے تو سبیل سے ہی بہت ہیں۔“ نیلما کو یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔

”نیلما بالکل تکلیف مت کرو ہم نے تمہیں اس گھر کی بیٹی سمجھا ہی نہیں مانا بھی ہے۔ اس لیے بلا جھک تم مما سے مجھ سے کچھ شیر کر سکتی ہو۔ کسی شے کی ضرورت ہو تم بتاؤ کسی تکلیف کے ہم سے کہہ سکتی ہو۔“ ساریہ نے نرمی سے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کو تھاما تھا۔ ان چند دنوں میں نیلما اسے بہت اچھی لگی تھی۔ معصوم سی بھولی بھالی۔ چالاکی اور ہوشیاری تو نام کو نہیں تھی بلکہ اس نے نوٹ کیا تھا کہ وہ کچھ گھبرائی گھبرائی اور سہی سہی سی رہتی ہے ہر وقت۔ عام لڑکیوں جیسی بات ہی نہیں تھی۔ ٹیلی جھیل جیسی آنکھوں میں ایک درد تھا خوف تھا جسے وہ لاکھ چہپانے پر بھی چھپائیں پائی تھی۔ عائکہ ملک نے کہا تھا کہ ”ساریہ تم ہٹا کرو آخر اس پیاری سی چھوٹی سی بچی کو کیا دکھ ہے۔ شاید اپنے بھائی کا دکھ ہو۔“

ساریہ کے لائے ہوئے ڈھیروں سوٹ میں سے اس نے ایک خوب صورت قیمتی سوٹ نکال کر پہن لیا تھا۔ بلیو اور فیروزہ کاٹن ایمر ایڈری سوٹ میں اس کی رنگت کھل اٹھی تھی۔ نیلما اس وقت ساریہ اور عائکہ ملک کے ساتھ ہال میں بیٹھی لی وی دیکھ رہی تھی۔ سر پر سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے وہ ان لوگوں کے بیچ بیٹھی خود کو ان فٹ محسوس کر رہی تھی مگر ساریہ کی ڈانٹ پر وہ یہاں بیٹھی تھی۔

”ہیلو گائیز۔“ کیف کی آمد پر ساریہ نے مڑ کے دیکھا۔

”ارے کیف تم کیسے ہو؟“

”بالکل ٹھیک تم سناؤ کسی ہو۔“

”ٹھیک۔“ وہ مسکرا دی بھائی کے آنے پر وہ خوشی سے پھولے نہیں ساری تھی۔

”السلام علیکم آئی!“ کیف نے سر کو تم کیا۔

”جیتے رہو کیسے ہو۔“ عائکہ ملک نے اس کے جھکے سر پر ہاتھ بھیرا تھا۔

کیف کی نظر صوفے کے ایک کونے میں کٹھی سی نیلما پر پڑی۔

”کیا میں جان سکتا ہوں۔ آسمان سے یہ پری آپ کے گلے میں کب اتری ہے؟“ کیف کو نیلما پہلی ہی نظر میں اٹریکٹ کر گئی تھی۔

”بھئی یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ تسلی سے بتاؤں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اس بار کتنے دن کے لیے آئے ہو۔“

”ایک دو ماہ کے لیے سوچا ہے کہ رمضان اور عید کر کے جاؤں گا۔“ کیف نیلما کے بالکل سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا تھا۔

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے اب ہم تمہاری شادی کر کے ہی تمہیں تمہاری دلہن کے ساتھ دینی رخصت کریں گے۔“ ساریہ نے محبت سے بھائی کو دیکھا۔

”او کے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میرا خیال ہے مجھے بھی اب سنجیدگی سے اس پر عمل کرنا ہی پڑے گا۔“ کیف کی مسلسل نظریں گھبرائی سی نیلما پر تھیں۔

”ارے کیف بھائی آپ۔“ اس دوران رخسار اور عثمان بھی اندر داخل ہوئے تھے۔ رخسار تو تقریباً بھاگتے ہوئے کیف کے پاس آئی تھی۔ کیف نے کھڑے ہو کر رخسار کو خود سے لگایا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ بھیرا۔

”اور سناؤ عرشان کیا چل رہا ہے سب؟“  
 ”فائن۔“ عرشان بھی کیف سے ہنسلکیر ہوا تھا۔

”نیللی بیٹا.....!“  
 ”جی آئی!“ نیلما نے بڑی بڑی جھیل جیسی نیلی آنکھیں اوپر اٹھائی تھیں۔  
 ”ارے کیا انہوں نے بلیو لنس لگائے ہوئے ہیں۔ بہت خوب صورت شیلڈ ہے آپ کے لنس کا۔“  
 کیف کو یکدم سے بے ساختہ تعریف پر عرشان کی نظریں اب پڑیں تھیں نیلما پر۔ نیلما گھبرا کر رہ گئی۔  
 ”نیللی۔“ عرشان نے ہکا راتھا۔ نیلما نے عرشان کی طرف دیکھا۔  
 ”تمہارے بھائی کی کال آئی تھی وہ تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں تم اپنے کمرے میں جاؤ میں کال ملا کر لا رہا ہوں فون۔“

”جی بہتر۔“ وہ اس مشکل سے جھنکارا پانا چاہتی تھی اور اس مشکل سے عرشان نے اس کو نکال لیا تھا مگر جو اس نے کہا تو جیسے دل خوشی کے مارے دھڑک اٹھا وہ اس وقت شدت سے اپنوں کو ہی تو یاد کر رہی تھی۔  
 ”تم یہاں بھی تو بات کر سکتے تھے۔ عرشان بلا وجہ نیلی کو کمرے میں بھیج دیا۔“ رخسار کو کچھ خاص اچھا نہیں لگا تھا نیلما پر عرشان کی یوں اہمیت جتنا۔

”ہو سکتا ہے کوئی خاص بات کرنی ہو اچھا ہے نا بے چاری پر بڑا ترس آتا ہے۔ اپنوں سے دور یہاں ان کی یاد میں روٹی رہتی ہے۔“ عاملہ ملک نے عرشان کی تائید کی تھی۔  
 عرشان مزید کچھ بولے وہاں سے کھڑا ہو گیا تھا۔ چہرے کے یہ رنگ بالکل الگ تھے جو صرف رخسار نے ہی نوٹ کیے تھے۔

نیلما اپنے روم میں بے صبری سے عرشان کا ویٹ کر رہی تھی۔ وہ فخر عالم سے بات کرانے کا کہہ رہا تھا۔ مطلب فخر عالم نے اس کو معاف کر دیا تھا۔ ایک گویہ سا سکون مل رہا تھا۔ دل کو کہ وہ سیدہ اور فخر عالم سے بات کرے گی وہ اپنی ہی گہری سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ عرشان کے اندر آنے کا پتا ہی نہیں چل سکا۔ عرشان نے نہایت جارحانہ انداز میں اس کا نازک بازو تھاما اور اپنی سمت کھینچا تھا۔ وہ ٹھہری نازک اندام ہی کسی گڑیا کی طرح اس کے پہاڑ جیسے وجود سے بری طرح ٹکرائی تھی۔

”آج کے بعد میں تمہیں نہ دیکھوں کہ تم کیف کے سامنے بھی آئی ہو بالفرض اگر یہاں کیف آتا بھی ہے تو تم اپنے کمرے میں ہی رہو گی۔“ ان کا ہی مہندی آنکھوں میں شعلوں کی پھنکار مگی جس سے نیلما کو اپنا چہرہ ہی نہیں اپنا پورا وجود بھی جھلستا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”انڈر اسٹینڈ۔“ مگر نیلما نے کچھ نہیں کہا اس کے دونوں بازوؤں کو نہایت ہی جارحانہ طریقے سے عرشان نے پکڑا ہوا تھا کہ تکلیف کی شدت سے اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

”میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ عرشان کی گرفت پر مزید سختی کہ نیلما کراہ کے رہ گئی تھی۔  
 ”جی.....“ سچ معنوں میں وہ عرشان کے اس روپ اس غصے سے ڈر گئی تھی۔ عرشان نے اس کے چہرے کو تیز نظروں سے دیکھا اور ایک جھٹکے سے خود سے الگ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے نیلی جھیل آنکھوں سے گرم گرم سیال بہہ کر اپنا مقام کھوتے چلے گئے تھے۔ وہ بیڈ پر بیٹھی سسک اٹھی تھی۔ عرشان کے رویے اس کے اس انداز لب و لہجے نے اس کو بہت چوٹ پہنچائی تھی۔

”فخر بھائی یہ کیا کیا آپ نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے آپ لوگوں نے مجھ پر میری نادانستگی میں کی گئی غلطی کی اتنی بڑی اور گھٹن سزا۔“ نیلما اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے بلک بلک کر روتی تھی۔

☆.....☆

ستار نے رات کے کھانے پر فخر عالم کی فیورٹ ڈش بنائی تھی۔ فخر عالم کو مٹن پلاؤ اور چکن کے شامی کیاب بہت پسند تھے اور میٹھے میں سویوں کا زردہ۔ ستار نے اپنی یہ زندگی دل و جان سے قبول کر لی تھی۔ وہ نادم تھی۔ شرمندہ تھی۔ اپنی غلطی اپنے سنگین گناہ پر پشیمان تھی۔ یہ شاید اس کی ماں کی کوئی دعا کوئی نیکی کوئی عبادت ہی تھی کہ وہ غلط باتوں میں جانے سے بچ گئی تھی۔ کسی کے غلط ارادوں کی بھیٹ چڑھنے سے بچ گئی مگر فخر عالم واقعی بہت بلند اور عظیم ہستی تھا جس نے سب کچھ جانتے بوجھتے اس کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنی زندگی میں شامل کر کے اپنا شریک سفر بھی بنایا۔ وہ فخر عالم کو منالینا چاہتی تھی۔ اپنی امی کو منالینا چاہتی تھی جو اس سے سخت ناراض تھیں خفا تھیں۔

”بیٹا ستارا! کھانا تیار ہو گیا؟ فخر بھی آ گیا ہے۔“ سیدہ کچن میں چلی آئی تھیں۔

”جی سیدہ خالہ کھانا تیار ہے بس میں دسترخوان لگا رہی ہوں۔“

”وہ میں لگا لوں گی تم یوں کرو جاؤ دیکھو فخر کو کسی شے کی ضرورت نہ ہو۔“ سیدہ زیادہ سے زیادہ وقت دونوں کو ایک ساتھ دینا چاہتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ فخر عالم ناراض ہے ستارا سے مگر ستارا جتنا نام فخر عالم کو دے گی اس کی ناراضی و غلطی اتنی ہی کم ہوگی۔

”سیدہ خالہ وہ..... وہ..... سوچا تو بہت کچھ جاسکتا ہے مگر عمل کرنے میں جان پر بن آئی بہت مشکل sh ہے۔ فخر عالم کا سامنا کرنے میں۔“

”کوئی میں..... وہ..... نہیں جاؤ شامیاش بیٹا اپنی زندگی سہل اور پرسکون کرنا چاہتی ہو تو زیادہ سے زیادہ وقت فخر کو دو۔ وہ دل کا برا نہیں ہے بس ذرا تم سے ناراض ہے مگر تم اس کو منادو گی تو وہ مان جائے گا..... چلو جاؤ.....“ ستارا مرنے نہ کرتی مصداق اپنے پیڑروم میں آئی تھی۔ فخر عالم ابھی ابھی نہا کر نکلا تھا کیلے بالوں کو تویہ سے خشک کر رہا تھا اس کے لمبے چوڑے جسم پر بلیوٹراؤزر کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ستار نے جھجک کر لمبی خم دار پلکوں کی باز عارض پر مگرانی تھیں۔ فخر عالم کی روشن سیاہ نظریں ستارا پر پڑیں اس کی جھجک وہ سمجھ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ اس کی خمدار پلکوں کا لرزنا دیکھتا رہا یہ وہ چہرہ تھا جسے اس نے بچپن سے اپنے دل میں بسایا تھا۔ جس کی ہر لمحہ ہر بل پر سنس کی بھی پوچا کی تھی۔ وہ اس کی محبت اس کا عشق اس کا جنون تھا۔

جانے دل نے کیا حکایات ہوئے سے سنائی کہ وہ دھیرے دھیرے اس کے بہت پاس آ گیا تھا۔ ستارا کا دل بری طرح دھڑکا تھا اس کے یوں قریب آنے پر وہ بری طرح گھبرا کے رہ گئی تھی۔ فخر عالم نے ہاتھ بڑھا کے اس کی ٹھوڈی پر اپنی انگشت شہادت رکھی اور چہرہ اوپر کو اٹھایا تھا۔ سیاہ آنکھیں ان ستاروں بھری آنکھوں میں گڑھ دیں۔ جہاں وہ اپنا کس واضح طور پر دیکھ سکتا تھا مگر ان ستاروں بھری آنکھوں میں وہ روشنی نہیں تھی جو وہ بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا۔ دل باغی ہو رہا تھا اس کا ہر کوئی خوب صورت جسارت کرنے کے لیے اس کے گلابی لرزتے ہونٹوں پر ایک تحریر رقم کرنے کے لیے..... وہ کوئی فرشتہ نہیں تھا ایک انسان تھا جس کے سینے میں دل تھا جو صرف ستارا کے نام پر دھڑکتا تھا اور اپنی ان دھڑکنوں کی آواز اس کے دل تک پہنچانے کے لیے وہ اس کے چہرے پر جھکتا چلا گیا تھا۔

ستارا صحیح معنوں میں شپٹا کے رہ گئی تھی اس کو امید نہیں تھی کہ فخر عالم اپنا یک سے گستاخیوں کا حملہ کر دے گا۔ وہ پوری کی پوری پسینے میں شرابور ہو کر رہ گئی تھی۔ فخر عالم نے اپنا چہرہ ستارا کے گھبرائے شرمائے چہرے سے اوڑھ لیا تھا اور جو گلیاں تو لہ اس نے اپنے چوڑے شانے پر ڈال رکھا تھا وہ تو لہ ستارا کے چہرے پر ڈال دیا تھا اور مسکراتا ہوا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

شٹے میں اس کا ٹکس دیکھنے لگا وہ سمجھتی شرماتی بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی تو کبھی اپنے ماتھے پر آتی چھوٹی چھوٹی بالوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے اڑتی۔

دستر خوان پر فرخندہ کے علاوہ وہ تینوں بیٹھ چکے تھے۔

”اماں فرخندہ خالہ کھانا نہیں کھائیں گی۔“ فخر عالم کو فرخندہ کی غیر موجودگی بہت محسوس ہوئی تھی۔ ”میں نے بہت کہا مگر وہ منع کر رہی ہیں کہہ رہی ہیں ابھی بھوک نہیں ہے بعد میں کھاؤں گی۔“ اب بھلا وہ کیا بتاتیں کہ ستارا کی وجہ سے وہ یہاں نہیں آتا چاہتی ہیں۔

”نہیں یہ تو غلط بات ہے۔ آپ رکیے میں فرخندہ خالہ کو لے کر آتا ہوں۔“ فخر عالم دسترخوان سے اٹھا اور فرخندہ کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ ستارا نے سر کو جھکا لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کیوں نہیں آ رہی ہیں دسترخوان پر۔ آج چونکہ جمعہ تھا اس لیے فخر عالم اسور جلدی بند کر دیا کرتا تھا تو دسترخوان پر وہ تھا۔ ورنہ تو سیدہ اور ستارا ایک ساتھ کھانا کھاتیں اور فرخندہ کا کھانا سیدہ کمرے میں ہی لے جا کر کرتی تھیں۔ اسے اب بھی یقین تھا کہ وہ کمرے سے باہر نہیں آئیں گی مگر اس کی سوچ غلط ثابت ہوئی۔ فخر عالم فرخندہ کو اپنے ساتھ لے ہی آیا R۔ فرخندہ، سیدہ کے برابر میں بیٹھی تھیں۔ ستارا کے دل کو تھوڑا سکون میسر آیا تھا۔ اس نے سالن کی ڈش اٹھا کے فرخندہ کی جانب بڑھائی تھی۔ جسے انہوں نے بری طرح نظر انداز کرتے ہوئے کباب کی ٹرے اٹھالی تھی۔ یہ منظر نہ تو فخر عالم سے چھپا رہا کہ وہ سیدہ کی آنکھوں سے..... ستارا کا دل چھوٹا سا ہو گیا تھا۔ سیدہ نے اس کا دل رکھنے کے لیے سالن کی ڈش تھام لی تھی۔

”لاؤ ذرا مجھے تو چکھاؤ کیسا بنا ہے سالن۔“

”اہم، ہم، ہم، بہت مزے کا بنا ہے۔“ سیدہ نے ایک لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”لو فخر تم بھی لو ستارا نے بہت مزے کا بنایا ہے سالن۔“ فرخندہ نے پھر بھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ ستارا اداسی سے مسکرا دی تھی۔ رات کو جب وہ بچن کے سارے کام سے فارغ ہو کر بیڈ روم میں آئی تو فخر عالم نیم دراز بیک کراؤن سے ٹیک لگائے موبائل میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ ستارا تو سمجھی وہ سو گیا ہو گا اور اصل مقصد بھی ستارا کا بیڈ روم میں دیر سے آنے کا یہی تھا کہ وہ قہقہے والی فخر عالم کی نظروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شام کی بے باکی نے اس کا دل سہا دیا تھا۔ دھڑکا دیا تھا۔ وہ فخر عالم کے اس روپ کے لیے تیار نہیں تھی۔ ستارا نے کن آنکھیں سے فخر عالم کو دیکھا تھا۔ اس کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ دل کو سنبھالتی وہ اپنا ہکا سالان کا سوٹ لیے واش روم میں آ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو فخر عالم کروٹ بدل کر سو چکا تھا۔ ستارا نے سکھ کا سانس لیا اور بیڈ کے دوسرے کونے پر سوٹ کر لیٹ گئی اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں بند کرتی فخر عالم نے ایک ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو پکڑا اور اپنی جانب کھینچ لیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی فخر عالم کی مضبوط اپنی بانہیں اس کے گرد اپنا گہرا احصار کھینچ چکی تھیں۔ اس کی بے بسی فخر عالم کی مضبوط اپنی بانہوں میں دم توڑ چکی تھی۔



عالمہ ملک عریشان کے بیڈروم میں آئی تھیں۔ عریشان کی صبح دوپہر کے گیارہ بجے ہوئی تھی۔ وہ فریش ہو کر ٹارنک ٹیل کے سامنے کھڑا تھا۔ خود پر پر فیمو کا فراخ دلی سے اسپرے کیا۔ ناشتہ کر کے وہ آج آفس شہیر کے ناشتہ ہی بیٹھے گا۔

”کڈرنک مم!“ مرر کے سامنے سے ہٹا اور عالمہ کو مسکرا کے دیکھا۔

”مارنک ٹو مائی چائلڈ۔“ عالمہ ملک کے چہرے پر سنجیدگی اور پریشانی کے آثار تھے جو عریشان کی نظروں سے چھپنے نہیں رہ سکے۔

”سب خیریت ہے مم! آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟“

”جی میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کل رات نیلما کے بھائی کا فون آیا تھا سب ٹھیک تو ہے نا کوئی پریشانی والی بات ہوئی تھی؟“

”نیلما کے بھائی کا فون؟“ عریشان کل کا سارا قصہ بھول چکا تھا۔

”ہاں تم نے نیلما کو ہال سے کمرے میں جانے کا کہا تھا نا اس کی بات اس کے بھائی سے کراؤ گے۔“

”جی..... جی..... ہاں مم!..... آیا تھا اور میں نے بات بھی کرائی تھی۔“ عریشان کو سب یاد آگیا تھا کہ کس بار سناہنہ طریقے سے کل اس نے نیلما سے بات کی تھی۔

”تو پھر کیا بات ہوئی ہے کیونکہ نیلما نے نہ رات کا کھانا کھایا اور نہ صبح کا ناشتہ کیا ہے۔ بس روئے جا رہی ہے۔ بڑی مشکل سے ساریہ نے اس کو ایک گلاس دودھ کا پلایا ہے۔ وہ بھی ومیٹ ہوئی۔ میں تو بہت پریشان ہوئی۔ یوں تم ہتا کر کے بتاؤ کیا ہوا ہے۔“

Jish

”لکھتا ہے کل میں نے کچھ زیادہ ہی سختی سے بات کر لی ہے محترمہ سے۔“ عریشان آہستگی سے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا تھا۔

”کچھ کہہ رہے ہو؟“ عالمہ ملک کو اس کی بڑبڑاہٹ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”نہیں مم! میں دیکھتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں بلکہ یوں کریں نوری سے میرا اور نیلی کا ناشتہ نیلی کے بیڈروم میں بھجوا دیں میں بات کرتا ہوں۔“ عریشان کی کاہلی مہندی آنکھوں کی چمک عثمانی لبوں کی معنی خیز لمبراہٹ عالمہ ملک کو کوئی اور ہی کہانی سنار ہے تھے۔ عریشان عالمہ ملک کے سر پر بوسہ دیتے باہر نکل گیا تھا۔

عریشان بغیر ناک کیے اندر داخل ہوا۔ نیلما اپنے بیڈ پر گھٹنوں میں منہ دیے شاید رو رہی تھی جس کا ثبوت اس کے نازک لرزتے وجود نے دے دیا تھا۔ عریشان نے دروازہ بند کیا اور مضبوط قدم دبیز قالین پر دھرتا اس تک آیا تھا۔ کچھ لمحے تو اس کو نرم و گرم نظروں سے دیکھتا رہا پھر بڑے آرام سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ آہٹ پر نیلما نے اپنے گھٹنوں سے سرواڑا پٹھایا اپنے سامنے بالکل قریب عریشان کو بیٹھنے دیکھ کر وہ سچ معنوں میں گھبرا کے رہ گئی۔ وہ پیچھے ہٹ سکتی بیک کراؤں سے جا کر رانی۔

”کیا بات ہے نہ رات کا کھانا کھایا نہ صبح ناشتہ سب خیریت ہے اور مہتابا رہی تھیں و میٹنگ بھی ہوئی ہے۔ ابھی تو ہمارے بیچ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو یہی نوبت آئے۔“ عریشان نے شریر لب و لہجے میں کہتے ہوئے اس کی بڑی بڑی نیلی جھیل آنکھوں میں جھپٹا کر وہاں سوائے خوف کے اور کچھ نہیں تھا وہ تو شاید عریشان کی بے باکی میں کہا گیا رشوخ جملہ بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔ عریشان اس کی معصومیت پر ہولے سے مسکرا دیا۔

”اچھا لاؤ دکھاؤ میں نے زیادہ زور سے پکڑ لیا تھا تمہارا بازو۔“ عریشان نے اس کا بازو پکڑنا چاہا مگر نیلما

نے بری طرح اس کا ہاتھ جھک دیا وہ سائیڈ میں سے اترنے لگی تھی کہ عریشان نے اس کی کلائی پکڑ کے کھینچی کہ وہ سیدھا اس پر آ رہی۔

”نامحرم نہیں ہوں جو مجھ سے یوں بھاگ رہی ہو..... دکھاؤ.....“ عریشان کو اپنا ہاتھ اس طرح جھڑکنا خاصا ناگوار مگر راتھا۔ عریشان نے اس کا دوپٹہ ہٹا کے اس کی آستین اوپر کی بازو پر دفاعی نیل کے اور سرخ انگلیوں کے نشان اس کی میدے جیسی رنگت پر بہت واضح ہو گئے تھے۔ اس نے نیلما کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ کے اس کا بازو چیک کیا جہاں وہی نشان پڑے تھے۔

”اوہ مائی گاڈ یہاں تو میری انگلیوں کے نشان پڑ گئے ہیں اس کا مطلب کل میں نے تمہارے ساتھ کچھ زیادہ ہی سختی کر دی ہے۔“ عریشان نے نیلما کے نشانوں پر اپنی انگلیوں کے لمس چھوڑے تھے اور ان دیکھتے لمس کی پیش سے نیلما کے دل کی کیا حالت تھی عریشان اس سے بے خبر تھا۔

”پلیز چھوڑیں۔“ نیلما کی بھیگی آواز پر عریشان نے اپنی کاہی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اس چہرے پر ایسا کچھ تو تھا جو بل بھر میں عریشان کا سب کچھ جیتیں سکون ختم کر گیا۔ اس کا دل پہلی بار نیلما کے نام پر دھڑکا تھا۔ وہ بے خود سا ہو کر بس یہ چہرہ دیکھتا ہی رہا اور جانے یہ پل مزید اور کتنے گزر جاتے کے دروازے پر دستک دی گئی تھی۔ عریشان نے نظروں کا رخ بدلا اور وہاں سے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھولا جہاں نوری ناشتے کی ٹرائی لیے کھڑی تھی۔

”تم جاؤ۔“ عریشان نے ٹرائی نوری سے لی اور ٹرائی لیے اندر داخل ہو گیا۔ اس دوران نیلما نے خود کو R سنبھال لیا تھا۔ بیڈ سے نیچے اتر گئی تھی اور اپنے دو بچے کو مزید پھیل کر خود پر ڈال لیا تھا۔

”چلو آؤ پہلے ناشتہ کرتے ہیں پھر کوئی بات ہوگی۔“ عریشان ٹرائی کو صوفہ سیٹ تک لے آیا تھا۔ نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔“ نیلما نے آہستگی سے کہا۔

”تو اس کا مطلب ہے تم رات بیتی بیویوں کی طرح ناراض ہو تو پر اہم مجھے منانے کا فن آتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گا تو مان جاؤ گی نا؟“ عریشان اس کی طرف بڑھا تا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کے یہاں لاسکے۔

”نن..... نہیں..... میں کھا لوں گی۔“ اس سے پہلے کہ عریشان اس تک پہنچتا وہ خود ہی آکر سنگل صوفے پر سٹ کر بیٹھ گئی کیونکہ عریشان سے کچھ بعید نہیں تھا وہ اپنے کبے پر عمل بھی کر گزرے۔ چڑیا کی طرح تھوڑا سا چمک لیا تھا۔

”بس اتنا سا۔“ نیلما کے ہاتھ کھینچنے پر عریشان نے ٹوکا۔

”نہیں بس مجھ سے اور نہیں کھایا جائے گا۔“ ان نیلی جھیل میں نمی حیرنے لگی تھی اپنی بے بسی کی اپنے اس قدر کمزور ہونے کی..... تنہا اور اکیلا ہونے کی۔

”او کے کوئی بات نہیں..... میں نے بھی کھالیا۔“ عریشان نے بھی بس کھالیا تھا۔

”پریشان مت ہو آج کے بعد میں تمہیں احتیاط سے چھوڑوں گا۔“ عریشان کی پھر سے رگ طرانت بھڑکی تھی۔ نیلما جو اس کے پہلے والے جملے پر مشکل نظر اٹھا کے دیکھ رہی تھی اس کے دوسرے جملے پر وہ کان کی لوؤں تک سرخ پڑ گئی تھی۔ یہ دلکش نظارہ عریشان نے دلکشی سے دیکھا تھا۔

☆.....☆

دوسرے دن ستارے پورا گھر صاف کیا، کھانا بنایا اور پھر سیدہ اور فرخندہ کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

فرخندہ تو اس کے بیٹے پر فوراً سے اٹھ کر جانے لگی تھیں مگر ستارا نے فرخندہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 ”اور کتنی سزا دو گی امی بس کر دیں ورنہ میں مر جاؤں گی۔“ ستارا کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح نکلنے لگے تھے۔

”میری بلا سے مر جاؤ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ کس قدر بے حسی تھی ان کے لب و لہجہ میں کہ ستارا کے ساتھ ساتھ سیدہ بھی رُخ پر رہ گئیں۔  
 ”فرخندہ کچھ علم ہے کیا کہہ رہی ہو۔“

”سیدہ میں کچھ نہیں جانتی ہوں بس اتنا جانتی ہوں کہ اس کو کہو میرے سامنے مت آیا کرے نفرت ہوتی ہے مجھے اس کے وجود سے نفی۔“ ستارا کا ہاتھ جھڑکتی ہوئی وہ وہاں سے نکلتی چلی گئیں۔ ”ستارا بھلتی ہوئی اپنے بیدروم میں بھاگی تھی۔ پیچھے سے سیدہ پکار رہی تھیں۔

”آج فیصلہ ہو کر ہی رہے گا۔“ سیدہ غصے میں انھیں اور فرخندہ کے پاس آئیں۔ فخر عالم نے یہ سارا نظارا نہایت دکھ سے دیکھا تھا مگر اس کے اندر کا غصہ ایک بار پھر اُٹھ آیا تھا۔ وہ اپنے بیدروم میں تیزی سے آیا۔ ستارا بیدروم پر اندھے منہ زار و قظار رو رہی تھی۔ فخر عالم نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو سختی سے تھام کر اپنے مقابل کیا۔  
 ستارا کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ فخر عالم آجائے گا۔

”جی تو چاہتا ہے اس کائنات اس ہستی سے تمہاری ذات کا نام و نشان منادوں تمہارے وجود کو کرچی کرچی کر کے زمین کی انتہائی گہرائیوں میں دفنا دوں تمہیں اس کال کو گھڑی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قید کر دوں جہاں گھپ سیاہ اندھیرا اور گھمبیر خاموشی اور تنہائی کے علاوہ کچھ نا ہو مگر یہ دل یہ آنکھیں مجبور ہیں..... جنہیں تم سے h شش ہے، محبت ہے، تمہاری چاہ ہے۔“ فخر عالم نے اپنی بات کہی اور اس کو ہلکے سے جھٹکنے سے خود سے الگ کرتے ہوئے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ وہ فرخندہ اور سیدہ کے کمرے میں آیا تھا۔

”اتنی نفرت کرتے ہیں آپ مجھ سے۔ ای کو میرا وجود برداشت نہیں ہے اور آپ کو میرا جینا..... میری اپنی زندگی میری اپنی سانس کہاں کہاں ہیں..... میرا وجود کہاں ہے..... میری یہاں کس کو ضرورت ہے۔ تین ماہ سے زیادہ ہو گیا تھا فرخندہ اور فخر عالم کی کج ادائیگی کی رخی ناراضی خفگی برداشت کرتے کرتے..... اب تو دل بھی درد کے مارے پھٹنے لگا تھا۔ دماغ کی رگیں دکھنے لگی تھیں..... رواں رواں، زخم زخم ہو گیا تھا۔ روح تک کھال ہو گئی۔ وہ کون سی گھڑی ہو گی جب یہ جسم روح کا ساتھ چھوڑے گی۔ دل کا دھڑکن..... سانسوں کا رکننا بند ہو جائے گا۔ پاؤں اس قدر رمل ہو گئے تھے کہ اب ان زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔

تین ماہ کا یہی یہ اثر تھا سوچیں جواب ساتھ چھوڑنے لگی تھیں۔ فخر عالم کے یہ جملے کانوں میں زور زور سے اپنی ذات پر بھٹتے ہوئے لگ رہے تھے۔ کمرے کی ہر شے گردش کرتی لگ رہی تھی۔ ہر شے گھوم گھوم کر اس کو چکرار رہی تھی۔ ان ستاروں جیسی آنکھوں کی ہر روشنی مانند پڑ گئی تھی۔ اندھیرا ہر طرف نظر آ رہا تھا۔ فخر عالم کا آخری جملہ بار بار گونج رہا تھا جا رہوں طرف۔

”تمہیں اس کال کو گھڑی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قید کر دوں جہاں گھپ سیاہ اندھیرا اور گھمبیر خاموشی و تنہائی کے علاوہ کچھ نہ ہو۔“

تو فخر عالم تمہاری دعا قبول ہو گئی تمہاری خواہش تمہاری آرزو پوری ہونے کا وقت آ گیا اور پھر وہ آنکھیں ستاروں کی روشنی سے بھری آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں اس کی تھکاوٹ کو ان اندھیروں نے خود میں



سمیٹ لیا تھا۔

”دیکھو فرخندہ آج تم جو کر رہی ہو تمہارا رویہ تمہارا برتاؤ بہت غلط ہے ستارا کے ساتھ۔ مانتی ہوں اس کے قدم بہک گئے تھے مگر وہ شرمندہ پریشان اور پشیمان و نادم ہے اپنی غلطی پر۔ تین ماہ ہو گئے ہیں اب خدا کا واسطہ بس کر دو، معاف کر دو ستارا کو۔ مجھے دیکھو میری اکلوتی بیٹی میری نظروں سے دور ہے جس کو دیکھنے کے لیے میری آنکھیں ترس گئی ہیں جس سے بات کرنے کے لیے میں تڑپتی ہوں مگر ستارا میں نیلما کو دیکھ لیتی ہوں مگر تم کیوں اتنی بے حس پتھر دل بن گئی ہو..... ٹھیک ہے اگر اتنی ہی نفرت کرنی ہو تو اس کا گلا گھونٹ کے مار کیوں نہیں دیتی ہو..... اچھا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے گی کبھی شکل ہی نہیں دیکھ سکو گی۔“

”سیدہ یہ کیا کہہ رہی ہو تم بھلا کوئی ماں ایسا کر سکتی ہے اپنی اولاد کے ساتھ۔“ فرخندہ تڑپ کر رہ گئی تھیں۔

”تو جو تم انھی کر رہی ہو وہ ٹھیک ہے اور جو کچھ فخر عالم کر رہا ہے وہ صحیح ہے۔“

”فخر نے کیا کیا ہے؟“

”فرخندہ میں بھی ایک ماں ہوں، اپنی اولاد کے ہر رنگ کو پہچانتی ہوں جانتی ہوں۔ فخر نے ستارا کو بیوی تو بنالیا ہے اس کو اس کا حق تو دے دیا ہے مگر جو بچی محبت اور عزت ہے وہ بچی اب تک اس سے محروم ہے۔ یقین کر دو اگر ستارا کو تم دونوں کی وجہ سے کچھ ہو گیا تو میرا امر منہ دیکھنا۔“

”اماں!“ پیچھے فخر عالم دہلتا ہوا آیا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو اللہ نہ کرے۔“

”کیوں اللہ نہ کرے..... اس معصوم بچی کو جس طرح تم دونوں ستارے ہو، رلا رہے ہو، تڑپا رہے ہو وہ سب کیا میں دیکھ نہیں رہی ہوں۔“ سیدہ نے دونوں سے اپنی ناراضی کا اظہار کر دیا تھا۔ فخر عالم نے تو نظریں ہی چرا لی تھیں۔

”بیٹا میں جانتی ہوں تم نے ستارا کو سب کچھ دیا ہے ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی جوڑے کپڑے منگنی کی مہنگی جیولری عمدہ واعلیٰ میک اپ ہر آسائش دنیا و جہاں کی ہر نعمت تو کیا تمہیں لگتا ہے وہ یہ سب یا کر خوش ہے مطمئن ہے پرسکون ہے نہیں نا؟“ سیدہ نے خاموشی کی ایک نظر فخر عالم کے پر سوچ چہرے پر ڈالی تھی۔

”عورت عزت کی محبت و توجہ کی بھوک ہوتی ہے اپنے شوہر کی پیار بھری نظروں کی پیاسی ہوتی ہے اور ستارا کو تم نے یہ سب نہیں دیا۔“ سیدہ نے دھمکی ہو کر سانس لی اور فرخندہ کو دیکھا۔

”فرخندہ میں ستارا کو یہاں لا رہی ہوں، تم اس سے بات کرو پیار کرو اس کو اپنے گلے سے لگاؤ۔ اپنی نرم گرم آغوش میں چھپا کر اس کا درد بانٹو۔“ حیدہ نے فرخندہ کے کندھے پر ہولے سے ہاتھ رکھا۔ فرخندہ نے کچھ نہیں کہا ان کی خاموشی کا مطلب رضامندی ہی تھا۔

فرخندہ اور فخر عالم کو چھوڑ کر سیدہ، ستارا کو لینے چلی گئیں مگر ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا۔

”فرخندہ فخر جلدی آؤ.....“

سیدہ کی چیخ پر دونوں وہاں بھاگے تھے۔

فخر عالم نے اپنے کسرئی بازوؤں میں ستارا کا بے ہوش وجود اٹھالیا تھا اور تیزی سے اسپتال کی سمت بھاگے تھے۔

ایک گھنٹے کی ٹریفک سے ستارا کی حالت بہتر ہو گئی تھی اس کو ہوش آ گیا تھا بلکہ ڈاکٹر نے جو خوشخبری سنائی

ان تینوں کے دل نہال ہو گئے تھے۔

”مبارک ہو آپ لوگوں کو ستارا پر یکلیٹ ہیں۔“ فرخندہ تیزی سے اندر آئی تھیں اور ہلکتی ہوئی ستارا کو خوب بار کیا تھا۔ اس کو اپنی نرم و گرم آغوش میں بھر لیا تھا۔

”میری بچی میرے دل کا ٹکڑا تمہاری حالت دیکھ کر تو میری جان ہی نکل گئی تھی۔ پیدوں تلے سے جیسے زمین نکل گئی تھی۔“

”فرخندہ بس کرو شکر ادا کرو ستارا کو ہوش آ گیا ہے وہ ٹھیک ہو گئی ہے اب اگر تم اس کو اتار لاؤ گی تو کہیں نہ آؤ اسے ستارا کی طبیعت پھر سے نہ بگڑ جائے۔“ سیدہ نے فرخندہ کو ستارا سے الگ کیا۔

”خدا نہ کرے اب میری بچی کو کوئی دکھ پہنچے۔“ فرخندہ نے ستارا کی بھیگی آنکھیں بیگیا چہرہ اپنے دوپٹے سے صاف کیا تھا۔

”اب کوئی نہیں روئے گا بس اب خوشیاں ہی خوشیاں ہمارے دروازے پر دستک دیں گی۔“ سیدہ مسکرا رہی تھی اس بار ادان کی یہ مسکراہٹ بہت پھسکی سی تھی آنکھوں میں ادا سی سی تھی وہ کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔ نیلما کی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

”امی تم نے مجھے معاف کر دیا؟“

”ہاں میری شہزادی میں نے تمہیں معاف کیا۔“ فرخندہ نے ایک بار پھر ستارا کو خود سے لگایا تھا۔

☆.....☆

ish

”عرشان آخر اس میں غلط کیا ہے۔“ رخسار اس کی ضد سے زچ ہو گئی تھی۔

”اچھا تو اس میں درست کیا ہے تم مجھے وہ بھی سمجھا دو۔“ رخسار سے زیادہ عرشان اس کے سوالوں سے زچ ہو گیا تھا بلکہ صحیح معنوں میں چڑ گیا تھا۔

”عرشان! کیف بھائی نیلما کو پسند کرنے لگے ہیں۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں آخر اس میں برائی والی کیا بات ہے۔“

”کیف کو تو ہر دوسری لڑکی پسند آ جاتی ہے۔“

”ہاں تو اس میں کیا برائی ہے وہ مرد ہیں، اسٹیلش ہیں، خوب صورت ہیں، دینی میں ایک شاندار جاب ہے۔“

”اور ان سب سے بھی بڑھ کر دینی میں کیف نے نہ صرف شادی کی ہوئی ہے بلکہ دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں۔“ ظفر کا تیر پھینکا تھا۔

”ہاں تو کیا ہوا وہ انور ڈکڑ کر سکتے ہیں۔ دو کیا چار بیویاں رکھ سکتے ہیں۔“ رخسار پوری طرح کیف کی حمایت میں بات کر رہی تھی۔

”میری بلا سے وہ چار کیا چھ شادیاں کر لیں یہ اس کا اپنا فعل ہے مگر نیلی کا نام کیف کے ساتھ مت لو۔“

”شان کو سخت ناگوار لگ رہا تھا۔ بار بار رخسار کا جراح کرنا۔

”اچھا تو نیلما میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں پوری دنیا میں اس کا کوئی نہیں سوائے ایک بھائی کے۔ اس وقت جیل میں نہ جانے کون سا جرم کر کے قید ہے۔ اس کی بہن یہاں غیر کے در پر اکیلی پڑی ہے اب اس کو ایک گھر ایک جیون سا مٹی ملتا ہے تو نہ جانے تمہیں کیا پراہم ہے۔“

”کیوں کہ وہ میری ذمہ داری ہے۔“ عثمان سے زیادہ دیر اس سے بحث میں الجھا نہیں جا رہا تھا۔  
 ”کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے۔“ رخسار چونک کر رہ گئی تھی۔ شک کی لہر اس کے اندر دوڑ گئی  
 عثمان نے اس کی طرف سے رخ ہی پھیر لیا تھا۔ رخسار اس کے سامنے آکھڑی ہوئی اور اس کی پُرسوج کا ہی  
 مہندی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔  
 ”عثمان سچ سچ بتاؤ آخر وجہ کیا ہے؟“  
 ”نبی میری منکوحہ ہے میں نے اس سے نکاح کیا ہے۔ وہ میری ذمہ داری، عزت اور میری غیرت  
 ہے۔“

”نہیں تم مذاق کر رہے ہو!“  
 ”ایسا گھٹیا مذاق کرنے کی میری عادت نہیں ہے رخسار۔“  
 ”اور میں..... میں کہاں ہوں تمہاری زندگی میں عثمان میں نے تم سے محبت کی ہے۔“  
 ”کیا.....! رخسار تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ ہم اچھے دوست ہیں میں نے کبھی تم سے ایسی بات نہیں کی ج  
 تمہیں محبت کی راہوں تک لے جائے۔ میرا مقصد میرا کیریئر صرف میری پڑھائی رہا ہے محبت جیسی الجھنوں  
 میں میں کبھی نہیں پڑا۔“  
 ”ہاں کیوں کہ نیلما سے نکاح ایک حادثہ تھا کسی کی عزت و آبرو بچانا تھا کسی کی مجبوری تھی..... بس اس  
 سے آگے اور میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی تمہارے سوالوں کے جواب دے سکتا ہوں مگر ہاں آج شاید صرف  
 R۔ تمہاری وجہ سے میں ایک سچا اور مخلص دوست گنوا دوں گا۔“ اور پھر عثمان وہاں رکا نہیں اس کے گھر سے نکلے  
 چلا گیا تھا۔

”رخسار.....“ دروازے کے اوٹ میں چھپی ساریہ جوان دونوں کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو  
 سنی تھی عثمان کے جانے کے بعد رخسار کے پاس آئی تھی۔  
 ”ساریہ آپ..... میری محبت ہار گئی..... آج میں ہار گئی۔“ رخسار اس کے گلے سے لگی پھوٹ پھوٹ کے  
 رو دی تھی۔  
 عثمان رات گیارہ بجے گھر آیا تھا۔ ہال میں عائکہ ملک اس کا ویٹ کر رہی تھیں۔

”مما آپ جاگ رہی ہیں۔“  
 ”تمہیں لگتا ہے اتنے بڑے انکشافات سننے کے بعد مجھے سونا چاہیے..... میں نے کبھی تم پر یا شہبیر  
 زبردستی نہیں کی زبردستی اپنا فیصلہ نہیں توہو پاشہبیر نے ساریہ کو پسند کیا میں نے ان کی خواہش کا احترام کیا تم مجھ  
 اگر نیلما کو پسند کرتے تھے تو مجھے بتا دیجئے میں منع تو نہیں کرتی بلکہ خود جا کر اس بچی کو دھوم دھام سے دہن بنا کر  
 لاتی۔ اس طرح وہ بھی چھپ چھپاتے کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی اور اس پر تین ماہ تک بے وقوف ہو  
 جاتے رہے۔“ عائکہ ملک سخت کبیدہ تھیں نالاں تھیں۔

”آئی ایم سوری ممما.....!“ وہ عائکہ کے گلے کا ہار بنا اور پھر جو کچھ لاہور میں ہوا وہ سب بتاتا چلا گیا۔  
 ”یہ تو اچھی بات ہے کہ کسی لڑکی کی عزت بچانے کے لیے تم نے یہ قدم اٹھایا مگر چھپایا کیوں؟“  
 ”ڈیڈ وکسب علم ہے۔“  
 ”شاباش اس کا مطلب ہے تم باپ بیٹے نے خوب مجھے بے وقوف بنایا۔“ عائکہ ملک نے شانے پر رے

ان کے بازو پر ہولے سے چپٹ لگائی۔

”ایچو کلی مہاشیں رزلٹ کا ویٹ کر رہا تھا پھر خود ہی بتا دیتا سب کچھ۔“ وہ سر کھجا کر رہ گیا تھا۔

”اتھار یہ بتائیں آپ کو آپ کی بہو پسند تو آئی تا۔“

”بہت پیاری انویسٹ ہے بالکل نیلی نیلی آنکھوں والی نموی گڑیا۔“ عریشان کی کاہی آنکھوں میں اس کا

ہاتھ جھلکانے لگا تھا۔

”ارے ہاں آج بے چاری گر مٹی پاؤں میں موج آئی ہے۔“

”واٹ مگر کیسے؟“ عریشان نے عالمہ ملک کے شانے سے بازو ہٹالیا چہرے پر پریشانی کے واضح رنگ

آئے تھے۔ عالمہ ملک دھیرے سے مسکرا دیں اس کی دیوانگی پر۔

”پتا نہیں کیا سوچ رہی مگر جلدی سے ڈاکٹر کو بلوالیا تھا۔ ابھی اپنے روم میں آرام سے سو رہی ہے۔“

عالمہ ملک کو عریشان کی پریشانی اور فکر مند کی اچھی لگی تھی۔ وہ سختی اور زبردستی کی قائل نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنے

دواؤں بیڈوں کی تربیت بہت اچھی کی تھی۔ بالکل دوستوں کی طرح رہی تھیں۔

”میں ایک نظر دیکھ لوں ذرا۔“ اسی دوران عالمہ ملک کا سیل فون بجنے لگا۔

”لو تمہارے ڈیڈو کی کال آگئی ہے تم جاؤ میں ذرا رحمان صاحب سے دودو ہاتھ کر لوں۔“ وہ مسکراتی ہوئی

اپنے بیڈ روم میں چلی آئیں۔

عریشان بے مبری سے آگے بڑھا دروازے کھولا تو دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا تھا۔ اندر کا منظر دیکھ کر وہ

بہت سا ہلکا ہوا رہ گیا تھا۔

ish

نیلما فینک کے ریڈ اینڈ بیو سوٹ میں بغیر دوپٹے کے کھڑی تھی۔ کمرے سے نیچے تک گولڈن شیڈ بال کسی

آئینہ کی طرح پشت پر بھیلے ہوئے تھے۔ اس کی نیلی بڑی آنکھوں میں وحشت ہی وحشت تھی۔ شاید درد کی سرخی

پہرے اور آنکھوں میں کھلی ہوئی تھی۔ عریشان بے خود سا آگے بڑھا تھا۔ نظروں کا یہ تصادم نیلما کی جان نکال رہا

تھا۔ آج صبح سے ہی اس کا دل بوجھل بوجھل ادا اس سا ہوا رہا تھا۔ گھر والے اپنی بہن دوست دوست ہمارا ستارا

رہ رہ کر شدت سے یاد آ رہی تھی۔ سوچیں اتنی گہری ہو گئی تھیں کہ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کسی شے سے ٹکرائی ہے

اور پاؤں میں موج بھی آگئی تھی۔ اسی درد و تکلیف کی وجہ سے اس کو بخار بھی ہو گیا تھا۔ نڈھال سی بہت کمزوری

وہ کر رہی تھی خود کو۔ اس وقت بھی دل جانے کیوں گھبرا رہا تھا تو وہ بیڈ سے نیچے اترتی ابھی دو قدم ہی آگے

گئی تھی کہ دروازہ کھٹکنے اور بند ہونے کی آواز پر اس نے نیلے جیل اوپر کی جانب اٹھائے تھے۔ وہاں عریشان کو

لہا پاپا یا تو دل دہشت سے دھڑکنے لگا تھا۔ ٹھنڈا گرم مزاج والا عریشان اس کی جان نکالنے لگتا تھا۔ وہ بالکل

سات و جامد کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ عریشان آگے بڑھا تھا۔ نیلما نے ہمت کر کے قدم اٹھایا ہی تھا مگر وہ اتنا

ماری اور ذہنی لگ رہا تھا کہ لڑکھائی وہ عریشان کے وسیع سینے سے لگی تھی اس کی ہمت ٹوٹ گئی تھی بخار سے

۱۰ سال کمزور وہ کیا اپنا دفاع کرتی بے بسی ہی بے بسی۔ اس نے اپنا سر عریشان کے سینے پر جھکا دیا اور با آواز آنسو

اس کا کر بیان بھگوتے چلے گئے تھے۔

عریشان نے اس کے گمراہے مضبوط اپنی بازوؤں کا گھیرا تنگ کر دیا تھا۔ اس کو خود میں سمیٹ کر اس کا

دل جو اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

نیلما کو بازوؤں میں بھرے وہ بیڈ تک لے آیا اور نہایت احتیاط سے بیڈ پر لیٹا دیا تھا۔ خود بھی اس کے پاس

بیٹھ گیا اور بغور اس چہرے کو دیکھنے لگا جو شدتِ غم سے سرخ ہو رہا تھا۔  
 ”بہت درد ہو رہا ہے۔“ وہ اس کے چہرے پر جھکا پوچھ رہا تھا اس کے بالوں کو سہلارہا تھا۔

نیلمہ نے چہرے کا رخ پھیرنا چاہا مگر عثمان نے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھ دیا۔  
 ”محبت کے رنگ کیا ہوتے ہیں تمہیں دیکھ کر جانا پہچانا ہے۔ دل پیار میں کیسے دھڑکتا ہے۔ احساس کی شدت روح کی تشنگی سے سب صرف تم سے ہی تو سیکھا ہے ورنہ یہ دل تو ایک شجارہ تھا جو انجان تھا جس کی زمین پر پیار و چاہت کے بارش کی ایک بوند بھی نہیں پڑی جہاں کلیاں نہیں کھلیں وہاں اب پھولوں کا کھلنا ان کا خوشبو بکھیرنا مہکتا یہ سب تمہاری ہی مہربان منت ہے نیلی۔“  
 عثمان نے اس کے سرخ رخسار پر اپنی ہتھیلی پھیری تھی۔

”تمہاری فرقت، قربت تمہارا ساتھ ہی میری زندگی ہے جو زندگی مجھے کل تک روکھی پھینکی لگتی تھی اب تمہاری موجودگی سے خوشنارنگیں اور خوب صورت لگتی ہے۔ یہ نکاح کے دو بول کا ہی اثر تھا کہ میرا دل خود بخود تمہاری طرف کھینچتا تھا یہ آنکھیں تمہیں ہی دیکھنا چاہتی تھیں۔ یہ لب تم سے پیار کرنا چاہتے تھے۔“ عثمان نے اس کی صاف و شفاف گردن سے بال ہٹائے اور وہاں ایک کہانی اپنی محبت کی رقم کر دی۔ مقابل کی غیر ہونی حالت کی پرواہ کیے بغیر وہ صرف اور صرف اپنی حکایات دل سنا رہا تھا۔ اپنے پیار کا اظہار عملی کر رہا تھا اور نیلمہ..... اس کی زبان تو جیسے تالو سے جاچکی ہو۔ ان نیلے جھیل کا کچ کو اس نے نہایت سختی سے پیچ لیے تھے۔ اس کا دل اتنی بری طرح دھڑک رہا تھا کہ عثمان اس پر جھکا باسانی وہ آواز سن سکتا تھا۔ عثمان نے اپنا چہرہ R- اور اٹھایا تو وہاں کا منظر کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ اس چہرے پر شرم و حیا کے رنگ نہیں کھیل رہے تھے بلکہ خوفزدگی کے آثار تھے درد و ہشت بھی اس چہرے پر۔

”نیلی!“

عثمان نے اس کی لرزتی پلکیں ہولے سے چھوئی تھیں۔ نیلمہ نے آہستہ سے لرزتی پلکیں واکی تھیں۔  
 ”کیوں خوف زدہ ہو، مجھ سے کیوں ڈر رہی ہو، میری محبت کا یقین نہیں ہے۔ بولو نیلی کچھ تو بولو۔“  
 ”مجھے آپ کی باتوں آپ کے حرف باحرف پر یقین ہے لیکن اس سچائی کو مجھے قبول کرنے کے لیے تمہارا وقت دے دیجیے میں اپنے دل کو آپ کے دل کی طرح یقین دلانا چاہتی ہوں کہ میں کسی خواب سراب کے پیچھے نہیں بھاگ رہی تھی۔ کھلی آنکھوں کا آپ کوئی پھٹنا نہیں ہیں۔ بلکہ ایک خوب صورت تعبیر ہیں جو صرف میری ہے..... پلیز عثمان پلیز.....!“

ان نیلے کالج سے دو نمونی ٹوٹ کر پلکیں کے گوشوں سے گرے اور نیچے میں جذب ہوتے چلے گئے تھے۔  
 عثمان جو بغور اس کا چہرہ تک رہا تھا جس کی آنکھوں میں حیرانگیوں کا ایک جہاں آباد تھا۔ اس کی سوچوں کی رسائی بھی نیلمہ کی سوچوں تک گئی ہی نہیں اس کو یہ گمان تھا کہ وہ بڑھے گا، ہاتھ بڑھائے گا اور نیلمہ بنا کسی تاویل بنا کسی درخواست کے اس کا ہاتھ تمام لے گی اس کی محبت کو قبول کر لے گی اپنا سب کچھ مان لے گی مگر عثمان کی ساری خوش فہمیاں ڈھیر ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے میں تمہیں وقت دے رہا ہوں مگر یاد رکھنا اس عید پر ہمارا ولیمہ ہے کل سے میں پورا رمضان اعتکاف میں بیٹھ کر سچے دل سے خشوع و خضوع سے عبادت میں لگ جاؤں گا۔ میرا رب مجھے میری عبادتوں ریاستوں کا صلہ، ان نیکیوں کا اجر ضرور دے گا اور رمضان کے بعد جو عید آئے گی اس عید پر مجھے تمہاری طرف

ت عیدی چاہیے اور تم جانتی ہو کہ مجھے تمہاری طرف سے کون سی عیدی چاہیے اس لیے خود کو مکمل طور پر تیار کر لے میرے پاس آنا کیونکہ اس وقت کسی صبر، برداشت، ناکہ کوئی گنجائش نہیں ہوگی، اوکے۔“  
 نیلما اس کا مطلب اچھی طرح جانتی تھی۔ اس لیے ہولے سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ عثمان یہ پیارا سا نظر پیار سے دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر جھکا اور ان بند پلکوں پر اپنے دہکتے لب رکھ دیئے تھے۔  
 ”مگنڈ ٹائٹ!“

عثمان مسکراتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ دروازہ بند کرنے کی آواز پر نیلما نے آنکھیں کھول کر بند دروازہ دیکھا تھا۔ پھر کروٹ لے کر آنکھیں موندھ لیں ان بند آنکھوں کی پتلیوں پر عثمان کا چہرہ جھلملا رہا تھا۔ دل میں بجا نکا جہاں عثمان پورے طہرقات سے کھڑا سے ہی پیار و جاہت بھری نظروں سے تکی رہا تھا۔

☆.....☆

”اماں!“ فخر عالم بہت سے فردوس، بھگلا، بھینی، دودھ، دہی کے شاپر ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا تھا۔  
 ”ارے فخر آگئے۔“ سیدہ جو مغرب کی نماز ادا کرنے جا رہی تھیں رک کر اس کو دیکھنے لگیں۔  
 ”جی اماں یہ لیس میں ایک ہفتے کا سحری اور افطاری کا سامان لے آیا ہوں۔ سارے شاپر ٹیبل پر رکھے اور سیدہ کا ہاتھ تھام کر نرم و ملائم صوفے پر بیٹھ گیا۔  
 ”عثمان کا فون آیا تھا۔ میری ان کی ماما سے بھی بات ہوئی ہے۔ وہ لوگ بہت اچھے ہیں اس پہلی عید پر عثمان اور نیلما کا دلیر ہے۔“  
 نیلما کے ذکر پر سیدہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

Vish

”جو ہوا وہ بھول جائیں شاید اس میں کوئی بھلائی کوئی بہتری ہی تھی رب تعالیٰ کی۔“ فخر عالم نے سیدہ کے بچے آنسو صاف کئے۔

”میں نیلما کو دیکھنا چاہتی ہوں بات کرنا چاہتی ہوں بیٹا۔“  
 ”بالکل بات کریں اور ہم سولہ رمضان سے عثمان کے گھر رکنے بھی جائیں گے۔ حالانکہ میں نے بہت منع کیا اعتراض کیا مگر عثمان کی چیلی نہیں مانی یہ لیس میں نمبر ملا کر دے رہا ہوں، نیلی اور اس کے سسرال والوں سے بات کر لیں، نیرادل جیسے نیلی کی طرف پر سکون و مطمئن ہو گیا۔ آپ بھی پر سکون و مطمئن ہو جاؤ گی۔“ فخر عالم نے اپنا فون جیب سے نکالا اور نمبر ملا کر سیدہ کو تھما دیا فرخندہ بھی وہیں چلی آئی تھیں۔  
 فخر عالم اپنے بیڈروم میں آ گیا جہاں اس کی زندگی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بیڈروم میں داخل ہوا۔ ستارا شاید مغرب کی نماز ادا کر کے بیٹھی تھی۔ آج رمضان کا چاند بھی نظر آ گیا تھا۔  
 وہ چلتا ہوا آیا اور اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔ ستارا کھاس کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا بوجھ چہرہ اوپر نہیں اٹھایا تھا۔ فخر عالم نے اپنی چوڑی ہتھیلیوں میں اس کا پائیزہ چہرہ بھر لیا تھا۔  
 ”تاراض ہو؟“

بس اتنا کہنا تھا کہ ستارا کی ستاروں بھری آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے لگے تھے۔ فخر عالم نے لبوں کو سختی سے پیچ لیا تھا اور اس کو خود سے لگا لیا تھا اس کا پورا وجود چٹکیوں کی زد میں تھا۔ فخر عالم نے اس کی پشت سہلائی تھی۔

”مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کے اعتماد کا، اعتبار کا خون کیا ہے آپ کا بھروسہ کا قتل کیا ہے۔ مجھے

معاف کر دیجیے۔ فخر میں نے آپ کو سمجھا نہیں۔ آپ کی محبت کو پہچانا نہیں۔“

”ستارا.....! میری طرف دیکھو!“

فخر عالم نے اس کو شانوں سے پکڑ کر اپنے مقابل کیا اور ٹیبل سے گلاس میں بھرا ٹھنڈا پانی کا گلاس اٹھا کر اس کے لبوں سے لگا تھا۔

”پہلے پانی پیو۔“

دو گھنٹوں کی کرگلاس ہٹا دیا۔ فخر عالم نے گلاس کا باقی بچا پانی خود پی لیا تھا اور خالی گلاس واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔

”اب روٹا نہیں۔ جانتی ہو مجھے تمہارا روٹا بہت تکلیف دیتا ہے۔“

ستارا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔

”جھوٹ، جھسی مجھے رلاتے رہے ہیں۔“

”ہاں تو غصہ بھی تو دلاتی تھیں، میں کتنا انتظار کرتا رہا تھا تمہارا کہ اب تم میرے پاس آؤ مجھے مناؤ گی مگر میرا انتظار، انتظار ہی رہ گیا۔ شادی کی رات اگر میں نے تم پر غصہ کیا تمہیں برا بھلا کہا تو تم خود سوچو وہ سب بجا تھا مگر جب میرا غصہ ٹھنڈا ہوا تو تمہاری راہ دیکھنے لگا کہ تم اب آؤ گی میرے پاس مگر تم نہ آئیں۔ تو کیا غصہ نہیں آئے گا۔“

غصے کے بادل آنکھوں سے چھٹے تو سارا منظر صاف و شاداب نظر آنے لگا۔ یہ جو سامنے شخص بیٹھا ہے وہ جو اس کو دیوانگی کی طرح چاہتا ہے وہ صرف اس کا ہے۔ تو کیوں مجھے پہلے فخر عالم کی محبت نظر نہیں آتی۔ کیوں R-1 میں ایک دھوکے کے پیچھے بھاگتی رہی۔“

”سوری۔“

ستارا نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھا وہ اپنے ناراض ناراض سیاں کو منانا چاہتی تھی۔ صرف سوری سے کام نہیں چلے گا مجھے اور بھی کچھ چاہیے فخر عالم نے چاہ سے ان ستاروں بھری آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”مگر فی الحال تو ابھی میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ ستارا نے اپنے دونوں خالی ہاتھ پھیلانے۔

”بہت کچھ ہے بے وقوف لڑکی اگر سمجھو تو۔“ فخر عالم نے ستارا کے دونوں پھیلے ہاتھ تھام کر آہستگی سے اپنے قریب کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر اپنی محبت کی مہر ثبت کر دی تھی۔ ستارا کا تو جیسے جسم کا سارا خون چہرے پر اٹھ رہا ہو۔ پلکوں کی گھنیری باؤں دیکھتے سرخ عارض پر جھدہ رہے ہو گئی تھیں۔

ان چار ماہ میں آج پہلی بار شرم و حیا کے وہ رنگ کھلے تھے اس کے چہرے پر جو گزرے ان چار ماہ میں نہیں دیکھے تھے۔ فخر عالم دھیرے سے ہنس دیا۔

”تمہیں پتا ہے تم کتنی پیاری لگ رہی ہو اس وقت۔“ فخر عالم کی شوخیاں بڑھنے لگی تھیں۔ اس کے شرارتوں پر شاید بندھ باندھنا شکل تھا۔ اس لیے اس کا فی الحال کمرے سے جانا ہی بہتر تھا۔ میں جا رہی ہوں سحری کی تیاری بھی کرنی ہے۔“

”چپ کر کے بیٹھی رہو۔“ فخر عالم نے اس کی نازک کلائی جو کھینچی تو وہ اس پر آ رہی۔ ”مجھے ابھی ڈھیر دور باتیں کرنی ہے تم سے۔“ وہ اس کے شرمائے چہرے پر جھکا تھا تو ستارا نے شکر ادا کر کے رب کا اور آسودہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....

## میری مسکراہٹ میری

دوستوں نے خوب رنگ جمایا تھا۔

”اماں! ہماری ہوزان کتنی پیاری لگ رہی ہے ناں۔“ سلیقہ بیگم نے بیٹی اور اس کی دوستوں کو چائے دی بھی اور دوگ ٹرے میں رکھے تخت پر آن بیٹھی تھیں اور دوستوں کی چیخڑ چھاڑ سے سرخ پڑتی بیٹی کو دیکھ دھیسے لہجے میں ساس کو مخاطب کر گئی تھیں۔

”پیاری کیوں نہ لگے گی آخر پونی کس کی ہے۔“ وہ دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہتیں ایک فخر سے بولتی چائے کی چسکیاں بھرنے لگی تھیں سلیقہ بیگم نے آگے سے کچھ نہیں کہا تھا کہ وہ اختلاف کر ہی نہیں سکتی تھیں کہ یہ تو مسلم حقیقت تھی کہ ہوزان اپنی ماں پر نہیں اپنی دادی پر گئی تھی سلیقہ بیگم ایک معمولی شکل و صورت کی حامل خاتون تھیں جبکہ نرگس بیگم خود نہ صرف حسین تھیں کافی حسن پرست بھی تھیں ان کا ایک ہی بیٹا تھا ولید جسے دور پرانے کی رشتے دار سلیقہ سے محبت ہو گئی تھی نرگس بیگم کو سلیقہ ایک آنکھ نہیں بھائی تھی وہ اپنے بے حد خود پر دیشے کے لئے چاندی، بہو لانا چاہتی تھیں مگر وہ ماں کے قدموں میں آن بیٹھا تھا اس نے تمام عرماں کی فرمانبرداری کی بھی اور اپنی پسند کی شادی کیے لئے ماں کے مد مقابل نہیں آیا تھا محبت سے منت کی بھی اور وہ بیٹے کی بات نال نہیں پاتی تھیں بیٹے کی محبت میر ایک ناپسندیدہ لڑکی کو اپنی بہو بنالیا تھا بہو کے ساتھ ان کا رویہ روایتی ساس کا ہی تھا سلیقہ کو ساس سے ڈر ہی لگتا تھا کہ وہ ہر وقت اس کی معمولی شکل و صورت سے اسے سناتی ہی رہتی تھیں اور وہ اپنے نام کی طرح ایک سلیقہ مند خاتون تھیں اس نے گھر کو کچھ یوں سنبھالا

ڈھولک کی تھاپ پر سکھوں نے سہاگ کے گیت گانا شروع کئے تھے اور وہ تصور میں مبسام خان کا چہرہ چلیوں پر نقش کرنا محسوس کرتی مسکرا دی تھی اس نے جو چاہا تھا جسے ہر ایک دعا میں مانگا تھا وہ اسے پانے جا رہی تھی تو مسرور کیوں نہ ہوتی اس کے لبوں پر نقصال مسکراہٹ کو نوٹ کر لیا گیا تھا اور وہ سب اسے چھیڑنے لگی تھیں وہ یکدم ہی سرخ ہو گئی تھی اور نگاہ چراگئی تھی اس کی سکھوں میں ایک نیا جوش بھیر گیا تھا وہ بڑی ترنگ کے ساتھ گانے لگی تھیں گانے کے بول اور ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ ساتھ بھرتے قہقہے فضا بھی گنگنا نے لگی تھی وہ ان سب کے ساتھ مل کر بس دی گئی بے فکر ہی تھی جس میں پالنے کی خوشی کا احساس چھلک رہا تھا نرگس بیگم جو کچھ دور تخت پر بیٹھیں تھیں وہ بولنے کے جھگڑتے چہرے کو دیکھ کر ماشاء اللہ کہتیں اس کے چہرے سے نظر ہٹا گئی تھیں مبادا اسے ان کی نظر نہ لگ جائے اندرون کی خوشی کیسے انسان کو خوشی کی بہار بنا دیتی ہے وہ زرد جوڑے میں کھلی جا رہی تھی اور وہ کیوں نہ کھلی جاتی اس کی برسوں کی آرزو پوری ہونے جا رہی تھی مبسام خان اس کا ہونے جا رہا تھا وہ مبسام خان کی ہونے جا رہی تھی اس کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا شرم و حیا کا پاس تھا ورنہ اس کا بس چلتا تو وہ سکھوں کے ساتھ مل کر تالیاں پیٹ پیٹ کر گانے گاتی لڈی میں شریک ہوتی بھگتڑے ڈالتی وہ نظار ہارنل سنجیدہ سی بیٹھی تھی مگر اس کا روم روم خوشی سے جھوم رہا تھا مایوں کی تقریب بہت شاندار رہی تھی تقریب کے اختتام کے بعد اس کی





کہ وہ جہاں بہو کی کم صورتی کا اسے طعنہ دیتی تھیں وہیں اس کی سلیقہ مندی کی بھی معترف تھیں اور یہ بات سلیقہ کے لئے امید افزا بھی اسے ساس اتنی بری نہیں لگتی تھی اور اس دن تو سلیقہ نے ساس کو ماں کا درجہ دے دیا تھا جب کسی رشتے دار خاتون نے ان کی بہو کی عام صورت کو نشانہ بنا کر کہا تھا کہ ان کے بیٹے کو تو سلیقہ سے سوگنا اچھی لڑکی مل سکتی تھی سلیقہ کو یہی لگا تھا کہ اس کی ساس آگے سے اس عورت کی ہاں میں ہاں ملائے گی لیکن اس کی یہ سوچ باطل ہو گئی تھی انہوں نے اس عورت کو کافی سناٹے ہوئے بہو کی تعریف میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور رات میں اس نے اپنے ساس سر کی گتنگو بھی سن لی تھی اس کے سر جیراگی کا اظہار کر رہے تھے کہ کس طرح وہ بہو کی کم صورتی سے نالاں تھیں ان کے مزاجی خدا کو بھی یہی لگا تھا کہ وہ بہو کی برائی کریں گی مگر ہوا الٹ تھا اس لئے وہ حیرت کا اظہار کر گئے تھے جس کے جواب نے سلیقہ کے سارے گلے ہی مٹا ڈالے تھے اس دن کے بعد سے اس نے اپنی ساس کے ہر طعنے کو اپنی ماں کی پیار بھری بات سمجھ کر دل سے نہیں لگایا تھا گو وہ بات بہت معمولی تھی مگر بہت با معنی تھی۔

”ولید کے ابا! سلیقہ میری بہو ہے اس گھر کی عزت میں اپنی بہو کو طعنہ دوں اس کو ایک کی دس سٹاؤں یہ میرا حق ہے مگر میں باہر کے کسی بندے کو یہ حق نہیں دے سکتی کہ وہ میری بہو کو آدھا لفظ بھی کہے مجھے اپنی بہو کی کم صورتی کا گلہ ہے مگر یہ گلہ کسی اور کو کرنے کا میں حق نہیں دے سکتی میرے ولید کو کوئی آدمی بات نہیں کہہ سکتا تو میرے ولید کی عزت پر کیسے انگلی اٹھا سکتا ہے میری بہو میری بیٹی ہے میں اسے دس بار سٹاؤں گی مگر کسی اور کو ایسا کرنے نہیں دوں گی“ زنگس بیگم نے ثابت کیا تھا کہ ان کی تربیت نیک ہاتھوں میں ہوئی ہے انہوں نے بہو کو عزت دی تھی ہر آئے گئے کہ سامنے اس کی تعریف کرتی تھیں

یہی وجہ تھی کہ ان کے پوتا اور پوتی بھی دادی کے لاڈ لے تھے یا سر بڑا تھا اور باپ کی کاپی تھا وہی قد کاٹھ وہی گوری رنگت، ہتھکنے نین کش یا سر نے اپنے ابا کی طرح ڈاکٹریت کی ڈگری لی تھی اور ایک گورنمنٹ ہسپتال میں تعینات تھا جبکہ اس کے ابا ولید کا اپنا کلینک تھا جو وہ عمر رسیدگی کے وجہ اب نیک چارہ ہے تھے اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفاء رکھی تھی یا سر سے چھوٹی ہوزان تھی جو اپنی دادی کی کاربن کاپی تھی دو دھیا سفید رنگت سیاہ جھیل سی آنکھیں لمبی سٹواں ناک باریک عنبی لب متناسب سراپا ہوزان کو جو بھیج دیکھتا تھا وہ یہی کہتا تھا کہ یہ تو بنی بنائی دادی ہے زنگس بیگم نے خود پوتی کو دیکھ کر یہی کہا تھا اور اسے ہوزان نام دیا تھا جس کے معنی ہی زنگس جیسی کے تھے انہوں نے پوتی کو بچپن سے ہی بے حد عزیز رکھا تھا اور وہ بھی تو دادی پر جان چھڑتی تھی اس نے فرسٹ ایئر کے امتحانات دیئے تھے اور شادی طے ہو گئی زندگی میں بڑے نقیب و فخر آئے تھے اس کی خوبصورتی اس کے لئے مسئلہ بن گئی تھی مگر اس کی تربیت اتنی نیک تھی کہ اس کے قدم لڑکھائے نہیں تھے اور اس نے اپنوں کا بھرم ان کا اعتبار کبھی نہیں توڑا تھا یہی وجہ تھی کہ آنے والی ہر مشکل کو اس کے گھر والوں نے اس تک پہنچنے سے قبل ہی دور کر ڈالا تھا اور اس کی شادی اس کے ماموں زاد مہسام خان سے ہو رہی تھی مہسام جو دو بہنوں کا لاڈلا بھائی تھا مہسام خان نے ایم اے کیا تھا اور ایک پرائیویٹ کالج میں اردو کا لیکچرار تھا وہ ہوزان سے کوئی آٹھ برس بڑا تھا اس نے اگر کسی کو چاہا تھا کسی کو بحیثیت شریک سفر اپنی ہر ایک دعائیں مانگا تھا وہ ہوزان بھی چاندنی سی چمکدار زندگی سی حسین ہوزان مہسام کے دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتی تھی اس کی محبت ہی تھی کہ اس نے ہوزان کے کردار پر اٹھنے والی انگلیوں میں پھینکی جانے والی کالک میں اپنا مثبت حصہ ڈالا تھا جب سب لعن طعن کر رہے تھے اس

وقت اس نے آگے بڑھ کر ہوزان کے کردار کی گواہی  
 دی تھی اور اسے اپنا شریک سفر بنانے کا عندیہ دیا تھا  
 ہوزان جو مرنے کے قریب بھی پاک دامن پر لگتی  
 لپٹتی جو اس کی سانس کو سینے میں گھونٹنے کا سبب بن  
 رہی تھی اسے مہسام خان نے زندگی کی نوید دے ڈالی  
 مہسام وہ ساس بہو میں شادی کی تقریب کے حوالے  
 لے جایات کرنے لگی تھیں رات دھیرے دھیرے بیت  
 رہی تھی اس کی یکھیاں اپنے اپنے گھر چلی گئی تھیں وہ  
 آٹھ بارہ سال کی تھی جب اس کے والد کی وفات ہوئی  
 مہسام اور وہ تب سے ہی وادی کے کمرے میں ہوئی تھی  
 اس وقت بھی وہ وادی کے برابر لیٹی تھی وادی کافی دیر  
 اس سے باتیں کرتیں اسے نئی زندگی کے حوالے سے  
 تجاویز اسے سونے کی بیداری کر کے مگنی تھیں اور وہ  
 وادی کی بات پر عمل کرتی آنکھیں موند گئی تھیں پلکوں پر  
 مہسام خان کا ٹکس روشن ہو گیا تھا وہ اس خوبصورت  
 انسان کو سوچتی یکدم ماضی کی تکنیوں کو بھی ذہن پر دستک  
 دینے سے روک نہیں پاتی تھی وہ مہسام خان کے روشن  
 ماس سے باتیں کرتی یکدم ماضی میں اتر گئی تھی۔

☆☆☆☆

ہوزان کراچی کے ایک پرائیویٹ اسکول سے  
 میٹرک کر رہی تھی میٹرک میں ہی اس کی اٹھان اچھی  
 تھی بڑھتی عمر بھی لڑکپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا  
 سن منہ سے بولتا تھا نامکھ میں بھی تب اس کا پہلا  
 رشتہ آیا تھا شادی کے بعد تو رشتوں کی بلا مبالغہ  
 ان لگ جاتی تھی میٹرک کی کلاسز کا آغاز ہوئے کوئی  
 تین ماہ گزر گئے تھے اسے کچھ عرصہ سے یوں محسوس  
 رہا تھا جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے اس کی تمن  
 دلیاں تھیں دو ہم جماعت تھیں اور اس کی گلی کی  
 پہلی سڑک پر رہتی تھیں جبکہ عروسہ اس کی ہم  
 کلاسیک اور پڑون تھی وہ چاروں اسکول ساتھ ہی آتی  
 جاتی تھیں وہ دونوں صبح میں اٹھیں گلی کے کونے پر مل  
 جاتی تھیں جہاں سے وہ چاروں پیدل ہی اسکول

جاتی تھیں کہ اسکول ان کے گھر سے دس منٹ کی  
 مسافت پر تھا عروسہ اور وہ ساتھ گلی تک آتی تھیں اور  
 برابر برابر بنے اپنے گھر میں چلی جاتی تھیں یہ ان کی  
 کوئی چھ سال پرانی روٹین تھی یکدم ہی ہوزان کو وہم  
 ہو چلا تھا جس کا اس نے سب سے پہلے اپنی دوست  
 عروسہ سے ہی ذکر کیا تھا جو اس کا وہم کہہ کر بات کو  
 نال گئی تھی ہوزان نے بھی بات کو اپنا وہم ہی سمجھ لیا  
 تھا پڑھائی بھی کافی ٹھٹھٹھی جیسے جیسے امتحان قریب  
 آرہے تھے اسے پڑھائی کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں  
 آ رہا تھا وہ ایک ذہین طالبہ تھی ہم جماعت میں اس کا  
 اسے دن گریڈ آیا تھا وہ اب بھی سخت محنت کر رہی تھی  
 عروسہ کی طبیعت خراب تھی اس نے اسکول سے چھٹی  
 کی تھی ایسا جب بھی ہوتا تھا کہ عروسہ چھٹی کرتی تھی تو  
 اس کا بھائی یا سر اسے گلی کے کونے تک چھوڑ دیتا تھا  
 جہاں اس کی دونوں ہم جماعت دوستیں مل جاتی تھیں  
 اور وہ تینوں ساتھ اسکول پہنچ جاتی تھیں اور واپسی میں  
 وہ دونوں ہوزان کو گھر تک چھوڑ کر پھر اپنے گھر جاتی  
 تھیں مگر آج جب وہ یاسر کے ساتھ گلی کے کونے تک  
 پہنچی تو اس کی دوست امیرا اکیلے ہی اپنے ابو کے  
 ساتھ کھڑی تھی جو یہ غائب تھی وہ دونوں ساتھ  
 باتیں کرتیں اسکول پہنچ گئی تھیں مگر واپسی کے لئے  
 مشکل تھی کہ کیا کریں تب وہ دونوں اللہ کا نام لے کر  
 اکیلے اکیلے اپنی اپنی گلیوں کی طرف بڑھ گئی تھیں  
 ہوزان جو آیت الکرسی کا ورد کرتی گھر کی طرف بڑھ  
 رہی تھی قدموں کی چاپ پر ٹھٹھٹھ گئی تھی وہ جو کوئی بھی  
 تھا ہوزان کے دیکھتے ہی اس نے اسائل پاس کی تھی  
 اور اس کے ہم قدم ہو گیا تھا وہ جو پہلے اس کے اسائل  
 پاس کرنے پر گڑبڑاتی تھی رہی سہی کسر اس کے ہمدرد  
 ہو جانے پر پوری ہو گئی تھی وہ ذکر و قدرے فاصلے پر  
 ہوئی تھی اور ناگواری سے اسے دیکھا تھا جس نے خود  
 ہی دانت نکالے تھے وہ اس پر گھوری ڈالتی آگے بڑھ  
 گئی تھی مگر وہ اس کے ساتھ چلنے لگا تھا اسے اپنی بے

جو اس کے پیچھے لگا تھا وہ سلیقہ بیگم کو دیکھ کر خائف ہو گیا تھا وہ عروسہ کی موجودگی میں ہی بات کرنے سے ڈرتا تھا اب کیسے ہوزان کی ماں کے سامنے کچھ کہتا؟ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ہمت کر کے موقع ملے ہی اس کے سامنے جائے گا تو وہ ماں کے ساتھ آنے جانے لگے گی، تین ماہ سلیقہ بیگم نے ذمہ داری اٹھائی تھی پھر اسکول کی چٹھیاں پڑ گئی تھیں وہ کوچنگ وغیرہ تو جانتی نہیں تھی زیادہ مشکل آتی تھی تو وہ یاسر سے مدد لیتی تھی اور یاسر مصروف ہوتا تھا تو اس کا ماموں زاد مبسم خان اس کی ماں کے ایک کال پر آ جاتا تھا، مبسم خان اس سے بڑا تھا وہ اسے بھائی مبسم کہتی تھی، مبسم خوش شکل نوجوان تھا اس کے سمجھانے کا انداز بھی بہت اچھا تھا، اس نے اپنے پیپرز کی تیاری یاسر اور مبسم کی مدد سے ہی کی تھی اس کے پیپرز کے بعد مبسم کی سب سے بڑی بہن آمنہ کی شادی شروع ہو گئی تھی یہ قریبی عزیزوں میں پہلی شادی تھی اس نے ہر ایک فنکشن کے لئے بڑے اچھے جوڑے اور ساتھ ہی بیچنگ کی چیزیں لی تھیں اس کا حسن تو خود بولتا تھا اوپر سے زرق برق کپڑوں اور بے فکرے پن نے چار چاند لگا دیئے تھے وہ محفل کی جان بنی ہوئی تھی اس کی شرارتیں اس کے بے فکر قبضے اس کے سب کی نظروں میں ممتاز کر رہے تھے آمنہ کی شادی کے بعد تو گویا رشتوں کی لائن ہی لگ گئی تھی۔

”اماں یوں آئے ہر ایک رشتہ کو انکار کرنا کفرانِ نعمت ہوگا۔“ سلیقہ بیگم نے جب دیکھا کہ ساس ہر آئے رشتے کو منع کرتی جا رہی ہیں اور ان کے میاں صاحب سارے فیصلے ماں کو دیئے پرسکون سے بیٹھے ہیں، تب وہ ڈرتے ڈرتے ساس کے سامنے لب کشائی کر گئی تھیں۔

”ہر چیز کا ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے بہو،“ زمرس بیگم کے ترش لہجے نے ان پر یہ باور کروادیا تھا کہ ان کی ساس کو ان کی بات ذرا پسند نہیں آتی۔

قراری کی داستان سنانے لگا تھا وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ گذشتہ تین چار ماہ سے اس کے تعاقب میں تھا وہ اکیلی نہیں ہوتی تھی اس لئے آج سے پہلے وہ دور سے ہی اس کو دیکھ کر دیدار کی تمنا کو پورا کیا کرتا تھا بات کرنے کی آرزو آج پوری ہوئی تھی اس کے ساتھ یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ کوئی یوں اس سے کواس کر رہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے تھے اور اس نے اس لڑکے کو کچھ کہنے کے بجائے یکدم ہی دوڑ لگا دی تھی، وہ کہاں یہ امید رکھے ہوئے تھا کڑ بڑا کر اٹھے قدم واپس ہولیا تھا اور ہوزان نے پیچھے مڑ کر ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا اور گھر کا دروازہ پیٹ ڈالا تھا، دروازہ اس کی ماں نے کھولا تھا وہ جلدی سے دلبیز پار کر گئی تھی وہ کچھ پوچھ رہی تھیں مگر وہ اپنے کمرے سے نکلتیں زمرس بیگم کے سینے سے جا لگی تھی اور روتے ہوئے تمام واقعہ کہہ ڈالا تھا، وہ دونوں ساس بہو پریشان ہو گئی تھیں مگر زمرس بیگم نے پوتی کو پچکار کر اس کے کمرے میں پہنچ دیا تھا، سلیقہ بیگم نہایت مضطرب ہو چکی تھیں اور ان دونوں خواتین نے فی الحال گھر کے مردوں کو یہ بات نہ بتانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس سب سے بچاؤ کا یہ طریقہ نکالا تھا، کہ اگلے دن سے سلیقہ بیگم خود اسے چھوڑنے کے کام سرانجام دینے لگی تھیں اس کی دوستوں کو تشویش ہوئی تھی انہوں نے وجہ دریافت کی تھی مگر کسی کو بھی کچھ بھی بتانے سے اس کی دادی نے منع کر دیا تھا اس لئے وہ دادی کا بتایا ہوا بہانہ ان سب کے سامنے رکھ گئی تھی۔

”اماں کا کوئی سرول بڑھ رہا ہے ڈاکٹر نے واک کے لئے کہا ہے اس لئے دادی نے یہ حل نکالا ہے کہ اماں مجھے اسکول لانے لے جانے کی ذمہ داری اٹھالیں۔“ وہ سب ہی کم عمر سیدھی سادی لڑکیاں تھیں فوراً ہی دوست کی بات پر یقین کر کے بیٹھ گئی تھیں اور یوں سلیقہ بیگم نے بیٹی کے ساتھ ساتھ اس کی دوستوں کو بھی لانے لے جانے کی ذمہ داری اٹھائی تھی وہ لفٹ کا

داخلہ ہو گیا تھا اس لئے دین لگا دی گئی تھی وہ لڑکا جو ایک دفعہ کے بعد غائب ہو گیا تھا وہ اسے اب بلاناغہ کالج کے گیٹ پر نظر آنے لگا تھا وہ بس دور سے اسے دیکھا کرتا تھا تقریباً تین ماہ بعد کی بات ہے وہ دوستوں کے ساتھ دین کے انتظار میں کھڑی تھی کہ وہ لڑکا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا وہ چاروں ہی اس کو دیکھ کر حیران ہوئی تھیں ان تینوں کو ایک اجنبی کے سامنے آنے پر حیرانگی تھی اور وہ اس سے اتنی انجان نہیں تھی کہ سال بھر سے وہ اس کا تعاقب میں تھا اس لئے وہ پریشان ہو گئی تھی امیران چاروں میں سب سے زیادہ با اعتماد دوستی تھی اس نے کڑے تیوروں سے اس نووارد کو گھورتے ہوئے آمد کی وجہ دریافت کی تھی اور اس نے بڑے آرام سے وجہ کہہ ڈالی تھی ان چاروں کے ہی منہ حیرت سے کھل گئے تھے اور وہ تو سرنے کے قریب تھی جبکہ وہ نووارد بڑے جوش و خروش سے اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا وہ ابھی اپنی بے قرار یوں کی داستان کہہ رہی رہا تھا کہ ان کی دین آگئی تھی اور وہ سب سے پہلے لپک کر دین میں سوار ہو گئی تھی اس کی دوستوں کو ایک موضوع مل گیا تھا وہ اسے چھیڑ رہی تھیں وہ ان تینوں کو ڈپٹ گئی تھی مگر اب یہ سلسلہ رکنے والا نہیں تھا اس لڑکے کی ہمت بڑھ گئی تھی وہ روز اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا اور اس کی دوستیں اسے تنگ کرنے لگتی تھیں اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلہ سے کیسے نکلے وہ دادی اور ماں کو بتانا چاہتی تھی مگر ڈرو و جبک کے مارے کہہ نہیں پا رہی تھی اس لڑکے کی بکواس سننا بھی اس کے بس کا روگ نہ تھا وہ جو پہلے کالج کے گیٹ پر رک کر دین کا انتظار کرتی تھی دین آنے تک وہ اب کالج سے باہر ہی نہیں نکلتی تھی اس نے اپنی دوستوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ایسے لڑکوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی نہ ہی اسے ان سرک چھاپ لڑکوں کی محبت کا یقین ہے نہ ہی وہ یقین کرنا چاہتی ہے جو یہ کہ وہ لڑکا اتنا

”اماں! میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ۔“  
 ”تمہاری بات بھی غلط نہیں ہے، اول تو ابھی تک مجھے ہوزان کے قابل ایک بھی رشتہ نہیں لگا۔“ زمرس بیگم کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ دوسرے کی خوبی کو اس کی درست و اچھی بات کو نہ صرف تسلیم نہیں اظہار کرتے بلکہ بھی چوکتی تھیں وہ ساس کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں جو پر پوز لڑ آئے ہوئے تھے ان میں کئی تو ایسے تھے کہ انکار کرتے دس ہزار بار سوچا جاتا اور وہ اتنے آرام سے کہہ رہی تھیں کہ کوئی بھی رشتہ ان کی پوتی کے قابل ہی نہیں انہوں نے ساس کا ادب ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ذہن و دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔  
 ”میں جلد بازی کرنا غیر مناسب سمجھتی ہوں“ انٹر کے بعد بہتر رشتہ مل جائے گا ہوزان کو اتنی کم عمری میں اس سارے جھنجھٹ میں ڈالنا ٹھیک نہیں۔“ زمرس بیگم اپنا موقف سامنے رکھ کر بات ہی اینڈ کر گئی تھیں۔

☆☆☆☆

ہوزان کا میٹرک کا رزلٹ آ گیا تھا اس نے میٹرک بورڈ میں تیسری پوزیشن لی تھی جس کی خوشی میں زمرس بیگم نے گھر میں میلاد اور قرآن خوانی رکھی تھی سفید رنگ کے پرل کی موتیوں کے کام کے سوٹ میں وہ آسان سے آئی ہوئی کوئی پری لگ رہی تھی تقریب بے حد اچھی لگ رہی تھی رات کے اختتام تک ہوزان کو تیز بخار نے آ لیا تھا وہ لوگ اسے لے کر ہاسپٹل دوڑے تھے مگر اس کی جان تو جیسے لیووں پر آگئی تھی گیارہ دن ان سب کے لئے بے حد ٹھن تھے طبی علاج کے ساتھ اس کا روحانی علاج بھی ہوا تھا اسے شدید نظر لگ چکی تھی زمرس بیگم پہلے بھی معوذتین کا اہتمام رکھتی تھیں صبح و شام سورۃ الناس سورۃ الفلق اور آیۃ الکرسی پڑھ کر ہوزان پر دم کرتی تھیں جس میں اب مزید شدت آگئی تھی وہ اٹھتے بیٹھتے قرآنی آیات کا ورد کرتیں پوتی پر دم کرتی رہتی تھیں وہ رو بہ صحت ہو گئی تھی اس کا شہر کے بہترین سرکاری کالج میں

انجمن میں تھی کہ یہ سب ماں سے کہے یا نہ تقریب میں بھی اس کا حال برابری رہا تھا چند دن عافیت سے گزرے تھے کہ چھت پر سے کپڑے اتارتے ہوئے ایک رقعہ اور اس کے قدموں میں آن گرا تھا اس نے کچھ سوچ کر اس گول مول کاغذ کو کھولنے کی بجائے ساری بات ماں کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ماں کے کمرے میں آگئی تھی سلیقہ بیگم عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں وہ ان کے بستر پر بیٹھی ان کے فارغ ہو جانے کا انتظار کرنے لگی تھی۔

☆☆☆☆

سلیقہ بیگم کے تو بیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی وہ بی کو خفا نظروں سے دیکھنے لگی تھیں انہیں شکوہ تھا کہ وہ لڑکا اگر اسے پریشان کر رہا تھا تو اتنا عرصہ وہ چپ کیوں رہی وہ آگے سے کچھ نہیں بولی تھی ہر ایک بات سچائی کے ساتھ ماں کے گوش گزار کر گئی تھی اور اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا پچھلے رقعہ کی بات بتاتے ہوئے تازہ خط ان کے سامنے کر دیا تھا جسے انہوں نے کھولا تھا اور ان کی کان کی اویں تک تپ اٹھی تھیں۔

”تم اپنے کمرے میں جاؤ یہ سب میں خود سنیاں لوں گی۔“ وہ غصہ ضبط کرتیں اس خط کو ٹکڑے ٹکڑے کرتیں ہدایت دے گئی تھیں وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ سلیقہ بیگم نے کچھ سوچ کر تمام بات ساس کے گوش گزار کر دی تھی۔

”اب بانی سرے اونچا ہو گیا ہے بہو! ولید کو سب بتانا ہوگا۔“ نرگس بیگم صورتحال سے آگاہی کے بعد پر سوچ انداز میں گویا ہوئی تھیں اور سلیقہ بیگم ڈر گئی تھیں۔

”اماں! یا سر کے ابا کو بتانا مناسب نہیں ہوگا مرد ایسے معاملات میں مصلحت کو گردی رکھ دیتے ہیں۔“ سلیقہ بیگم نہایت خوفزدہ سی بولی تھیں۔

”بات تو تمہاری سولہ آنے درست ہے مگر اس سب کا مناسب حل نکالنا ہوگا وقت پر حل نہیں نکالا تو ہماری بچی کے حق میں یہ بات اچھی نہ ہوگی۔“ نرگس

برا نہیں لگا تھا وہ اسے غور کرنے پر اکسارہی تھی مگر ہوزان کا فیصلہ اٹل تھا وہ لڑکا اظہار محبت کے بعد اس کے پیچھے کئی ماہ خوار ہونے کے بعد بہت غصہ میں آچکا تھا اس کی نام نہادانا بلبلانہ جاک اٹھی تھی۔

”تمہیں اپنی پارسائی کا بڑا زعم ہے میں تمہارا سارا غرور خاک میں ملا دوں گا۔“ اس نے دین میں سوار ہوتی ہوزان کی پست کو گھورتے ہوئے نفرت سے سوچا تھا اس کے فرسٹ ایئر کے امتحانات چل رہے تھے آخری پیپر کی دوپہر وہ اس کے سامنے پھر آیا تھا اور وہ اس کی باتوں پر توجہ دے بغیر آگے بڑھ گئی تھی شام میں مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ ماں کے ساتھ کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی تھی وہ آج کئی دن بعد خود کو پرسکون محسوس کر رہی تھی مگر اگلے دن اس کا سارا سکون درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا وہ محسن کی جھاڑو لگا رہی تھی کہ اس کے قدموں میں کاغذ کا گولہ آن گرا تھا اس نے حیرت کے ساتھ اس گول مول ہوئے مڑے تڑے کاغذ کو کھولا تھا اور اسے اتنا دل بند ہوتا محسوس ہوا تھا وہ سمجھ نہیں پاری تھی کہ کیا کرے کہ اس محبت نامہ کو بڑے ہی کھلے ڈالے لفظوں میں قلمبند کیا گیا تھا خط میں مخاطب کرنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

”میری جان ہوزان! فقط تمہارا عاشق نامداڑ عاشق حسین۔“ بیچ کا سارا متن وہ جذب کر گئی تھی کہ چند سطروں کو پڑھ کر ہی وہ سرخ پڑ چکی تھی اسی بل قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی تھی اور وہ ماں کو دیکھ کر کاغذ کو فی الفور پھٹلی میں چھپا گئی تھی وہ بی کی حالوں سے انجان اسے صفائی کے بعد تیار ہو جانے کا کہہ رہی تھیں کہ ان کے کسی عزیز کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی تھی اور آج عقیقہ کی تقریب بھی جس میں ان سب نے ہی شریک ہونا تھا وہ جیسے تیسے جھاڑو پوری کر لی کمرے میں آئی تھی اس نے کاغذ کے پرزے پرزے کر کے کوڑے دان میں ڈال دیئے تھے وہ اس

قدموں میں کانڈ کا ایک گولہ آٹن گرا تھا، وہ ہر اسان سی اٹھانے کو بجھتی تھی کہ اس سے ٹبل ہی ایک رشتہ دار خاتون اس کو لے کو اچک گئی تھیں اور کانڈ سیدھا کر رہی تھیں کہ ہوزان کی جان لبوں کو آگئی تھی ماتھے پر شبنمی قطرے ابھرنے لگے تھے خاتون اردو پڑھنا جانتی تھیں ان کی نظریں کانڈ پر پھسل گئیں اور طوفان آگیا تھا، اچھی بھلی محفل خراب ہو گئی تھی پوری محفل ہوزان پر تھو تھو کر رہی تھی اور وہ بولنے جوگی نہ رہی تھی سلیقہ بیگم اور نرگس بیگم بھی کہاں اس افتاد کے لئے تیار تھیں کوئی نرگس بیگم کو سنا رہا تھا تو کوئی سلیقہ بیگم کی تربیت پر انگلی اٹھا رہا تھا۔

”ادبہ! صورت مومنہ حرکتیں کا فرماں۔“ ایک خاتون کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی اور وہ لپک کر دادی کا بازو تھام گئی تھی۔

”دادو! آپ جانتی ہیں ناں میں ایسی نہیں ہوں۔“ وہ سسکی تھی اور چوگیاں کی منگاہ بڑھ گئی تھیں مرد بھی چھت سے اتر کر حن میں چلے آئے تھے ولید صاحب کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی تھی۔

”ایسی کی ہے بیٹی کی پرورش کے عاشقوں کے خط گھر تک آتے ہیں۔“ محلہ کی ایک خاتون نے محل فشان کی تھی وہ ہوزان کی حسین صورت سے نفرت کرتی تھیں کہ وہ خود عام شکل و صورت کی تھیں اور دونوں بیٹیاں بھی قبول صورت تھیں بڑی بیٹی کے رشتے کی بات چل رہی تھی اور عین موقع پر ہوزان کھیر کی پیالی لئے ان کے پاں پہنچ گئی تھی لڑکے والوں نے ان کی لڑکی تو پھر دیکھی بھی نہیں اور تمام توجہ ہوزان پر لگ گئی وہ تو اسی وقت کھٹک گئی تھیں اگلے دن رشتہ سے یہ کہہ کر کہ لڑکی کا رنگ بہت کالا ہے رشتہ سے انکار ہو گیا تھا اور اس کے اگلے ہی دن وہ لوگ ہوزان کا رشتہ لے کر پہنچ گئے تھے انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے لڑکے کی ماں کو ہوزان کے گھر کی دہلیز پار کرتے دیکھا تھا تب سے ہی انہیں

بیگم دور تک کی سوچ رہی تھیں اور وہ اپنے تئیں سارا جامہ ساس کے سپرد کرتیں اپنے کمرے میں آگئی تھیں۔ نرگس بیگم نے بیٹے کو بتانے کا تہہ کر لیا تھا مگر اب تک ہی یاسر کے رشتے کی بات چل نکلی تھی اس لئے ان کا فیصلہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا نرگس بیگم کی ایک منہ بولی بہن تھیں جو کافی عرصہ سے بیمار تھیں وہ ان کی حیادت کو گئی تھیں وہاں ان کی نو اسی جو ذواب شاہ میں نیم تھی اسے دیکھا تھا بے حد حسین اور نازک سی اشمالہ انہیں پہلی نظر میں پوتے کے لئے ایک دم مناسب لگی تھی انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لگے ہاتھ رشتہ ہی ڈال دیا اور گھر آ کر اپنے فیصلہ سے آگاہ کر دیا ولید تو تھے ہی ماں کے فرمانبردار بہو نے بھی کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا اور جس کی شادی کی بات چلائی گئی تھی وہ بھی دادی کے ہر فیصلے پر لپک کہنے کو جان و دل سے راضی تھیں چٹ مٹنی پٹ بیاہ والی بات ہوئی تھی آٹا نانا رشتہ طے ہوا اور کشمالہ کی مانی کی طبیعت کے پیش نظر محض پندرہ دن بعد کی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی تھی سلیقہ بیگم کو اتنی جلدی پر امتراض ہوا تھا مگر نرگس بیگم بہو کے کسی ایک اعتراض کو خاطر میں نہ لائی تھیں گھر میں شادی کے ہنگامہ جاگ اٹھے تھے سلیقہ بیگم نے بڑی شاندار بری تیار کی تھی اور مایوں کا دن آن پہنچا تھا مایوں میں بس چند ایک رشتے داروں اور محلے کی چند لڑکیوں کو ہی مدعو کیا گیا تھا چونکہ زیادہ لوگ نہ تھے اس لئے خواتین کے لئے صحن میں اور مردوں کے لئے چھت پر انتظام کر دیا گیا تھا ہوزان بے حد خوش تھی اور بڑے لہک لہک کر ہزے کے گیت گار رہی تھی سبز رنگ کے ہیلے کرتے اور زرد باجامہ میں زرد و سبز چڑی کا پٹہ پہنے کھنیرے لمبے بالوں کو پراندے میں قید کئے وہ گاؤں کی مٹیاں لگ رہی تھیں یاسر کی مایوں کی زم ہوئی تھی جس میں ہوزان پیش پیش تھی وہ عروسہ کے اشارے پر اس کی جانب بڑھی تھی کہ اس کے



ہے، بیٹی کی پشت پناہی کرنے کے بجائے اس کی نیک تربیت کی ہوئی تو آج یوں رسوا نہ ہو رہے ہوتے۔“

احسن صاحب کی زبان بھر انگارے اگلنے لگی تھی۔

”ابھی میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے مگر میری بیٹی پاکدامن ہے اس کی سوچ آئینہ کی طرح شفاف ہے اور یہ وقت ضرور ثابت کرے گا آپ سب لوگ جاسکتے ہیں۔“ ان کا دل کر رہا تھا کہ وہ احسن صاحب کا منہ توڑ دیں مگر مصلحت کا تقاضہ تھا کہ وہ چپ رہے اس لئے انہوں نے انہوں نے ملا متی نظر ان صاحب پر ڈالتے ہوئے انہیں جانے کا کہہ دیا تھا۔

”ہاں ہم جا رہے ہیں، جس گھر کی لڑکی کو یوں بھری محفل میں مگلا بی عا شقانہ محبت نامہ ملتے ہوں اس گھر کا پانی بھی ہم جیسے ثریفیوں پر حرام ہے۔“ احسن صاحب باہر کی طرف بڑھے تھے۔

”کوئی تھو کے گا بھی نہیں اب تمہارے گھر پر جو کارنامہ تمہاری بیٹی سرانجام دے چکی ہے اس کے بعد تو تمہاری دلہیز پر ہی بوڑھی ہوگی کہ اس جیسی لڑکیوں کو کوئی نہیں اپناتا۔“ وہی بڑوں جو بیٹی کا رشتہ ختم ہو جانے پر خار کھائے بیٹھی تھیں نفرت سے پھنکار تیں باہر کی طرف بڑھی تھیں چند ایک اور قدم آگے بڑھے تھے کہ ایک ٹھہری مردانہ آواز نے ہر اتھتے قدم کو جکڑ لیا تھا۔ حیرانگی سے گردنیں مڑی تھیں اور مبسام خان پر حیرت بھری نگاہیں ٹھرنی لگی تھیں۔

”اس بھری محفل میں کوئی یہ ماننے نہ ماننے کہ ہوزان ولید معصوم اور باکردار ہے میں مبسام خان اس بات کو نہ صرف تسلیم کرتا ہوں بلکہ ثبوت کے لئے میں ہوزان سے شادی کے لئے بھی تیار ہوں کوئی نہ اپنائے میں اپناؤں گا۔“ وہ ہر ایک زہر اگتی ہوئی زبان کو یکدم خاموش کر دیا گیا تھا، نرس بیگم اور سلیقہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو ٹھہرنے لگے تھے یا سر اور ولید صاحب کو ایک دم لگا تھا جیسے وہ پھر سے سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

ہوزان سے ایک طرح کا ہیر ہو چلا تھا اور اس نفرت کو نکالنے کا انہیں آج بہترین موقع ہاتھ لگا تھا اس لئے وہ لگے ہاتھ بہتی گنگا میں ہاتھ دھو گئی تھیں کوئی کچھ کہہ رہا تھا تو لکسی کی زبان زہر اگل رہی تھی۔

”آپ سب جب کر جائیں مجھے میری بیٹی پر پورا بھروسہ ہے یہ ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتی جس سے ہماری عزت پر آج آئے۔“ ولید صاحب دھم سے مگر سکون سے بولے تھے کیونکہ انہیں اپنی بیٹی پر پورا بھروسہ تھا۔

”آج آنے کی بات کرتے ہو میاں تمہاری بیٹی تمہاری عزت خاک میں ملا چکی ہے اس کے عاشق نامدار کے خط کا بغور مطالعہ کر لو لگ جائے گا پتہ تمہاری بیٹی کتنی دودھ کی دھلی ہے۔“ خط ایک ہاتھ سے ہوتا دوسرے ہاتھ تک کا سفر کرتا چلا جا رہا تھا کہ احسن صاحب تک بھی پہنچ گیا تھا، احسن صاحب ان کے محلے میں رہتے تھے ان کی اہلیہ وفات پا گئی تھیں ان کی اپنی پرچون کی دکان تھی جس کو اب میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کا بیٹا بھی ان کے ساتھ مل کر چلانے لگا تھا اور احسن صاحب نے اپنے بیٹے کے لئے ہوزان کا رشتہ ڈالا تھا جس سے معذرت کر لی گئی تھی اور وہ اس بات کو گانٹھ بنا کر دل میں رکھے بیٹھے تھے اور اب بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے ولید صاحب نے بس ایک تیز نظر ان پر ڈالی تھی اور ان کے ہاتھ سے وہ کاغذ جھپٹ لیا تھا۔

”اس کاغذ میں جا ہے کچھ بھی لکھا ہو آپ سب چاہے کچھ بھی سوچیں سمجھیں مگر مجھے اپنی بیٹی پر پورا بھروسہ ہے۔“ وہ کاغذ ہوا میں لہرا کر چیتے تھے ان کی آواز اس قدر بلند تھی کہ یکدم ہی سکوت چھا گیا تھا۔

”جیسے اس خط پر یقین ہے وہ ابھی اسی وقت یہاں سے جاسکتا ہے مجھے ایسے کسی بھی انسان سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا جو میری بیٹی کے کردار پر انگلی اٹھائے تہمت لگائے۔“ ولید صاحب کا انداز بے چلک تھا۔

”تہمت کوئی نہیں لگا رہا صاف سامنے کی بات



پہلے ہی ہوزان کے بے گناہ ثابت ہو جانے پر مطمئن  
تھا اور اس نے اس آوارہ لڑکے کی تلاش شروع کر دی  
تھی جس کے باعث ہوزان کی زندگی بھر کی نیک نامی  
خاک میں مل گئی تھی مبسام خان کی ماں نے بڑی  
عجلت میں محض ڈھائی دن میں بیٹے کی بری تیار کی تھی  
وہ روایت کے مطابق سات دن مایوں نہیں بیٹھی تھی  
آج اس کی مایوں تھی اور صبح برات وہ ساری بات  
صاف ہو جانے اور محبت ملنے کی خوشی سے سرشار تھی  
مبسام خان بھی بے حد خوش و مطمئن تھا اس نے وقت  
پر ہوزان پر بھروسہ کر کے سب کا ہی نہیں ہوزان کا  
بھی دل جیت لیا تھا وہ ماضی سے نکلی تھی اور کھڑکی بند  
کرتی واپس بیڈ پر آ کر لیٹ گئی تھی اس کی آنکھوں  
میں مبسام خان کا چہرہ تھا وہ مسکراتی تھی اور اس نے  
آنکھیں موند لی تھیں جاگتی آنکھوں سے خواب سجا  
وہ خواب میں بھی بے حد خوش و مطمئن تھی۔

☆☆☆☆

مبسام خان قلیل وقت میں بھی بڑی دھوم دھام  
سے بڑی شان سے برات لے کر آیا تھا مبسام خان  
کی ماں اور بہنیں ہر رسم میں پیش پیش تھیں مبسام  
خان وائٹ شیر وانی اور میرون کلمے میں اگر شہزادہ  
لگ رہا تھا تو ہوزان سرخ رنگ کے شرارے میں  
زیورات پہنے آسمان سے اتری ہوئی کوئی پری لگ  
رہی تھی سہاگ کے جوڑے نے اس کی خوبصورتی کو  
چار چاند لگا دیئے تھے اذہر سے محبت کو پالنے کی خوشی  
سب کی نظروں میں سرخرو ہو جانے کا احساس اس  
بکے لبوں پر الوی مسکراہٹ سجا گیا تھا ہوزان ولید  
نکاح کے عین یوں کے ساتھ ہوزان مبسام بن گئی  
تھی 'فونویشن' ہوا تھا اور رخصتی کے وقت وہ والدین  
سے مل کر بہت روٹی تھی 'دادی سے مل کر تو اس کی  
ہچکیاں بندھ گئی تھیں یا سر نے ہی ایسے سنبھالا تھا اور  
وہ مبسام خان کے ساتھ رخصت ہو گئی تھی مبسام خان  
کے والد تو خیر حیات نہیں تھے مگر اس کی والدہ شہناز

”ارے میاں تم تو باؤ لے ہو گئے ہو جوانی کا  
بش ہے سارا کہ ہوزان کی خوبصورتی کو دیکھتے ایسا  
ذمہ لے کر چلے ہو جو تمہاری نسلوں کو تباہ کر دے گا“ تم  
ایک ایسی عورت جس کو سر محفل رقصے ملیں اپنی نسلوں کا  
این بنانا چاہتے ہو شایہ تم پر مگر اپنی ماں سے  
پوچھ لو وہ اس آوارہ بد چلن لڑکی کو بہو بنانے کے لئے  
راستی بھی جس یا نہیں۔“ کسی دور کی رشتہ دار خاتون  
نے زبان کے جوہر دکھائے تھے۔

”مجھے ہوزان پر اتنا ہی بھروسہ ہے جتنا اپنی بیٹی  
پر ہے۔“ مبسام خان کی ماں کی بات نے تمام فیصلہ  
کر دیا تھا مخالفین ناک بھوس چڑھاتے باہر نکل گئے  
تھے ہوزان نے بس ایک نمناک نگاہ مبسام خان پر  
ڈالی تھی اور وہاں سے نکل گئی تھی۔

ہوزان نہ جانے کب سے مبسام خان کو اپنے  
دل میں بسائے ہوئے تھی آج اس کا بھری محفل میں  
نکا سر ڈھانپ کر اس نے گویا محبت کی لاج رکھ لی تھی  
مبسام خان کو ہوزان سے محبت تھی مگر مگروں کا فرق  
اور مالی حیثیت کا فرق ایسا تھا کہ وہ محبت کو دل میں  
پھپھائیے بیٹھا تھا مگر ہوزان پر اٹھیں انگلیاں ہر فرق کو  
بملائی تھیں ولید صاحب نے مبسام خان اور اس کی  
ماں سے دوبارہ پوچھا تھا مگر وہ اپنے فیصلے پر قائم تھے  
یہ نے والے تماشے کے باعث یا سر کی شادی ختم ہو گئی  
تھی لڑکی والوں نے رشتہ سے صاف انکار کر دیا تھا  
اور جس ہال میں یا سر کا ولیمہ ہونا تھا اس میں ہوزان  
کی برات ہونا مقرر کر دی گئی تھی ہوزان کی دوستیں جو  
یا سر کی مایوں میں شریک نہ ہوئی تھیں کہ بہت ہی مختصر  
انہوں کو بلایا گیا تھا عروسہ البتہ اپنے کزن کی شادی  
میں حیدر آباد آگئی ہوئی تھی واپسی پر اسے پتہ چلا تھا  
ابہ اور جویریہ سے بھی کچھ جیچا نہیں رہا تھا ان تینوں  
نے ہی ہوزان کی گواہی دی تھی دودھ کا دودھ پانی کا  
پانی دیا گیا تھا مبسام خان کی والدہ کے سامنے ان  
تینوں نے ہر بات کہہ دی تھی مبسام خان شادی سے

خان بخوبی بیٹے کے جذبات سے واقف تھیں، انہیں بھی ہوزان پسند تھی، جن حالات میں شادی ہوئی تھی اس کے باوجود انہوں نے بہو کے استقبال میں کوئی کمی نہیں رکھی تھی ان کے چھوٹے سے گھر میں ہوزان کا شاندار استقبال ہوا تھا، مبسام خان نے اپنی محبت کی داستان حرف بہ حرف کہہ ڈالی تھی، ہوزان شرمائی رہی تھی اس کے منہ سے یہ نہیں نکل سکا تھا کہ وہ بھی مبسام خان سے بے حد محبت کرتی ہے، مبسام نے اسے منہ دکھائی میں سونے کی انگلی دی تھی ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆

مبسام خان کے کہنے پر اس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا تھا اور سیکنڈ ایئر کی کلاسز کا آغاز ہوتے ہی وہ کالج جانا شروع ہو گئی تھی ساس کو کوئی اعتراض نہ تھا اور آگے بھی انہیں کوئی اعتراض نہ ہوا اس لئے وہ کالج جانے سے قبل سب کا ناشتہ بناتی تھی، اس کی ایک نند شادی شدہ تھی جبکہ دوسری چھوٹی نند عالیہ نے مگر رجسٹریشن کیا تھا اور گھر پر ہی ہوتی تھی، دوپہر کے کھانے کی ذمہ داری کھانا بنانے سے کچن کی صفائی تک عالیہ کے سپرد تھی اور وہ رات کا کھانا اور ناشتہ بنایا کرتی تھی اور کوئی مہمان آجائے یا اس کی بڑی نند تمام تر ذمہ داری اس کے ہی سپرد تھی وہ کم عمری کے باوجود نیک تربیت کے ساتھ ہر ایک کی ذمہ داری کو احسن طریقے سے سرانجام دے رہی تھی اس کی ساس اور نند کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی زندگی بڑے خوشگوار انداز میں آگے بڑھ رہی تھی مبسام صبح کالج جاتا تھا اور شام میں اکیڈمی گھر کا نظام اچھے سے چل رہا تھا، رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہونے والا تھا اور ہوزان دوسرے جی سے بھی روزہ رکھ کر کالج جانا پھر سحری و افطار کے ساتھ رات کے کھانے کی تیاری اس کی طبیعت کچھ کمزور تھی ڈاکٹر کی ہدایت پر اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی روزے چھوڑ

دیئے تھے وہ بستر کی بو کر رہ گئی تھی ایسے میں اس کی ساس اور نند کا منہ بنا ہوا تھا بگڑتے منہ اس کو بہت کچھ سمجھا رہے تھے اور وہ حوصلہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی جتنی عبادت اس کے بس میں تھی وہ کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ گھر کو لے کر چل رہی تھی جمعہ کا روزہ بھی رکھ لیتی تھی بیوی کی حالت پھر اس پر اتنے کام مبسام کو بہت کچھ نظر آ رہا تھا مگر وہ مصلحتاً خاموش تھا کہ ماں سے کیا کہنا، بہن کو ایک بار بھابھی کا ہاتھ بٹانے کا کہہ گیا تھا اس کا ہی افسانہ بن گیا تھا اور وہ اب چلی لگا کر بیٹھ گیا تھا، رمضان کا مہینہ بخیر و عافیت گزر گیا تھا، عید پر مہمانوں کی آمد کا سلسلہ تھا اس کی پہلی عید بھی مگر وہ آج عید کا تیسرا دن ہونے کو آیا تھا اپنے میکے نہیں گئی تھی مبسام کو سب نظر آ رہا تھا مگر وہ بیوہ ماں سے کہتا تو کہا، بیوی کو ہی صبر کی تلقین کرتا عید کے تیسرے دن کوئی سات بجے کے بعد اسے میکے لے کر آیا تھا، اس کی رنگت کھلائی تھی، آنکھوں کے نیچے حلقے تھے زکس بیگم تو پوتی کو دیکھ کر ہی تڑپ اٹھی تھیں، انہوں نے مبسام کو بڑی شکوہ کناں نگاہ سے دیکھا تھا اور وہ شرمندہ ہو گیا تھا، ۱۹۹۷ء جیسے تیسے گزر رہے تھے ہوزان نے ایک بے حد خوبصورت بچی کو جنم دیا تھا، مبسام اور ہوزان بے حد خوش تھے مگر اس کی ساس کا منہ بنا ہوا تھا وہ آئے گئے کے سامنے پوتا نہ ہونے کا شکوہ لے کر بیٹھ جاتیں تھیں اور ہوزان تو بس شہناز کے ہرون کے ساتھ بدلتے رویے پر ہی حیران تھی وہ نجیث ماما ایک شفیق خاتون تھیں اور شادی کے بعد ساس بھی اچھی ثابت ہوئی تھیں اس کی نند بھی اچھی تھی مگر دیکھتے دیکھتے ان کے رویے بدل گئے تھے وہ وہہ سمجھنے سے قاصر تھی، اس کی نند کی عمر تیس برس ہو گئی تھی اور اب تک شادی نہیں ہوئی تھی رشتے آتے تھے اور دیکھ کر چلے جاتے تھے اور وہ جو بے سوچ کر حیران و پریشان ہوتی تھی کہ شہناز خان اتنی بدل کیسے گئیں یہ معہ بھی حل ہو گیا تھا، عالیہ کو دیکھنے کچھ لوگ آ رہے

کر دیا گیا تھا اس کی ایمانداری اس کی زندگی کو کھنسن بنا گئی تھی جو کچھ جمع ہو چکی تھی وہ عالیہ کی شادی پر خرچ ہو گئی تھی عید تہوار بہنوں کے گھر عید الگ پہنچانی جانی تھی ان کے میکے آنے اور قیام کرنے کا الگ خرچہ تھا پیوی اور بیٹی کی ذمہ داری الگ تھی بیٹی کے اسکول کی فیس اور ماں کی دوائیوں کا خرچہ کیس بجلی کے بل اور مینے بھر کے راشن کی فکر سب بڑے آرام و سہولت سے چل رہا تھا کہ نوکری ختم ہوئی تھی کہ زندگی ٹھن ہو چلی تھی اکیڈمی سے ملنے والی سٹری ناکافی تھی مہسام خان دوڑ دوپ میں لگا تھا مگر جاب تھی کہ مل کر نہیں دے رہی تھی اوپر سے بیوی تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی تھی گھر کے حالات انتہائی خراب ہو چکے تھے ہوزان جس نے انٹر ریگولر کرنے کے بعد گزشتہ سالوں میں پرائیویٹ گریجویٹ کر لیا تھا اس نے گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے گھر کے نزدیک اسکول میں بچنگ اشارٹ کر دی تھی حالات وہی تھے کہ پرائیویٹ اسکول والے اتنی سٹری تو دیتے نہیں کہ اس کے دن یکدم خوشحالی میں بدل جاتے مہسام کے لئے یہ سب تکلیف دہ تھا مگر حالات نے اسے چپ رہنے پر مجبور کر دیا تھا اس نے کئی ایک جگہ اپلائی کیا ہوا تھا مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا اس نے فیکٹری میں کام کرنا شروع کر دیا تھا جس کی ٹائمنگ صبح آٹھ سے رات آٹھ بجے تک کی تھی سٹری مناسب تھی اس لئے اس نے اکیڈمی کی جاب چھوڑ دی تھی وقت گزر رہا تھا اس نے بیوی کو کہہ دیا تھا کہ وہ جاب چھوڑ دے مگر مہسام کی اتنی مشقت طلب جاب کے باوجود سٹری پہلے جتنی نہ تھی اس لئے اس نے جاب جاری رکھی تھی ساس کا رویہ اب کافی بہتر تھا وہ گھر کے کاموں میں اس کی مدد بھی کر دیا کرتی تھیں اور پری دس تو اب زیادہ رہتی ہی دادی کے پاس بھی وقت تیزی سے گزر رہا تھا اس کی ڈیلیوری کا آخری ماہ تھا مہسام زور ڈال رہا تھا کہ وہ اسکول کو خیر باد کہہ دے

تے اور انہوں نے ہوزان کو میکے جانے کا کہہ دیا تھا اس کے بعد اس پر کھلا تھا کہ عالیہ کے لئے جو بھی رشتہ آتا تھا وہ ہوزان کو دیکھ کر مایوسی سے پلٹ جاتا تھا اس کی خوبصورتی جو پہلے اس کے لئے عذاب ہوئی تھی اب اس کی نند کے رشتوں کی راہ میں حائل ہوئی اس کے لئے مشکلات پیدا کر گئی تھیں وہ ساس کو بچہ کہنے کے بجائے میکے چلی آئی تھی اور پھر یہی سلسلہ چل پڑا تھا عالیہ کے لئے کوئی رشتہ آتا تو وہ میکے سدھار جاتی اسے اپنی ساس کا رویہ اب اتنی تکلیف نہیں دیتا تھا کہ اسے اپنی ساس کی مجبوری کا احساس ہو گیا تھا وہ جو ہر آئے گئے کے سامنے عالیہ کے گمن گانے لگی تھی اس نے خود کتنے ہی لوگوں کو رشتہ کے لئے کہا ہوا تھا اور ماہ و سال کی کوشش کے بعد جو بیس برس کی عمر میں عالیہ اپنے گھر کی ہو گئی تھی عالیہ کی ساس ننڈیں اٹھتے بیٹھتے اسے سنایا کرتی تھیں۔

”لوگوں کی اتنی حسین چاندی بھابھیاں ہوتی ہیں ایک ہمارے بھائی کی قسمت کہ سانوی سلونی سی لڑکی پلے بندھ گئی۔“ عالیہ کی شادی کے بعد ہوزان کو لگا تھا کہ اب عالیہ کا رویہ ٹھیک ہو جائے گا مگر چند سال تبدیلی نہ آئی تھی بلکہ کچھ اور بگاڑ پیدا ہو گیا تھا ساس الگ اکھڑی اکھڑی رہتی تھیں۔ تین سال گزر گئے تھے اس کی بیٹی پری دس و سال کی ہو گئی تھی آج کل وہ بھرا امید سے تھی تیسرا مہینہ چل رہا تھا کہ اچانک ہی مہسام خان کی جاب ختم ہو گئی تھی اس پر طلبہ کے مارکس کے حوالے سے دباؤ تھا پرائیویٹ کالج تھا ہر طلبہ کا طالب علم کالج میں زیر تعلیم تھا دو لڑکے ہائی سائنس سے تعلق رکھتے تھے پڑھنے میں ناکارہ اور آوارگی میں نمبروں مہسام خان نے ان دونوں کو ان کے پیپر کو مد نظر رکھ کر ان کی محنت کے عین مطابق مارکس دیئے تھے جو ان دونوں کو بھی پسند نہیں آئے تھے اس پر مارکس بوجھانے کا دباؤ تھا اور اس کے انکار کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا تھا کہ اسے نوکری سے برخاست

مگر اس نے مبسام کو راضی کر لیا تھا اس نے ایک بہت پیارے گول مثل سے بچے کو جنم دیا تھا اس کی ساس بہت خوش تھیں انہوں نے محلہ درشتہ داروں میں مٹھائی بانٹی تھی سو امینے کے بعد اس نے اسکول پھر سے جوائن کر لیا تھا اسبام اپنی دادی کے پاس رہتا تھا جبکہ پری وٹس اسکول چلی جاتی تھی رمضان المبارک کی آمد آمدھی اس نے اپنی سیکری جوائن دن جمع کر کے رکھی ہوئی تھی مبسام کے ہاتھ پر رکھ دی تھی اور وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

”آپ کہتے تھے ناں کہ جاب چھوڑ دو تو میں اس لئے نہیں چھوڑ رہی تھی کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی میں قلیل آمدن کے ساتھ روزمرہ کی ضروریات پوری ہو جانی ہیں یہی بہت ہے کہ عید کی تیاری اوپر سے بہنوں کی عیدی کا انتظام ہو جائے۔“ اس نے پیسے دینے کی وجہ بتائی تھی مبسام کی غیرت پر چوٹ تو تھی مگر حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ خاموشی سے وہ رقم لے گیا اور ماں کو دے دی تھی رمضان سے پہلے پہلے ہی شہناز خان نے بیٹیوں اور نواسیوں کے لئے کپڑے جوئے خرید کر عیدی کا انتظام کر لیا تھا رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہو گیا تھا وہ گھر جاب اور عبادات سب کو ساتھ ساتھ لے کر چل رہی تھی اس کے لئے مشکل تھا مگر رب نے اسے ہمت عطا کر دی تھی آخری عشرہ سے قبل مبسام کو ہی نہیں ہوزان کو بھی سیکری مل گئی تھی اس نے شوہر کی سیکری تو اٹھا کر ہمیشہ کی طرح ساس کے حوالے کر دی تھی کہ اب تک وہی گھر کا نظام چارہاں تھیں اپنی سیکری سے اس نے دونوں بچوں اور ساس کے لئے عید کے کپڑے بنائے تھے اب اس کے ہاتھ میں اتنی بھی رقم نہیں تھی کہ وہ اپنے یا مبسام کے لئے عید کے کپڑے بنا لیتی، مگر وہ مطمئن تھی اس نے کبھی بھی حالات کا رونا رونا کر رب کی ناشکری نہیں کی تھی وہ ہر حال میں رب کا شکر ادا کرنے والی ایک صابر شاکر عورت تھی اس نے مبسام کو کبھی کسی بھی بات کے لئے

پریشان نہیں کیا تھا ساس نند کے برے رویے کی کبھی شکایت نہیں کی تھی اور برے حالات میں اس کی ڈھال بن کر کھڑی ہوئی تھی وہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں طاق راتوں میں قیام و عبادت کا خصوصی اہتمام کر رہی تھی سلیقہ یکم اپنی بہو کے ساتھ اس کی عیدی لے کر آئی تھیں نرگس یکم بہت بوڑھی ہو گئی تھیں۔ بڑھاپا اوپر سے بیماری وہ کہیں آنے جانے سے قاصر تھیں سال بھر پہلے یا سکر شادی ہوئی تھی نفد ایک اچھی لڑکی تھی بڑوں کا احترام کرنے والی ایک فلسفہ گھر پلو لڑکی جیسے اس گھر کی بیٹی ایک اچھی بہو ثابت ہوئی تھی ویسے ہی ان کی بہو اچھی بہو سے بڑھ کر ایک بیٹی ثابت ہو رہی تھی کہ جو خود غلوں و چاہت کی روشنی بکھیرتے ہیں ان کی زندگی میں کبھی اندھیرے نہیں آتے رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ فیوض و برکات سے ان کی زندگی منور کرتا اختتام کی جانب بڑھ رہا تھا الوداع کا جمعہ تھا اس نے بچوں کو نہلا کر تیار کیا تھا آج اس کی آنکھ بار بار نم ہو رہی تھی اسے اپنے میکے کی یاد آ رہی تھی اسے میکے میں گزارے رمضان کے دن اور جمعہ الوداع کا خوبصورت دن شدت سے یاد آ رہا تھا اس کی دادی سالہا سال کپڑے نہیں بناتی تھیں وہ رمضان کے ہر جمعہ کے چار جوڑے اور عید کا ایک جوڑا بناتی تھیں اور یہ پانچ جوڑے ان کے پورے سال چلتے تھے سلیقہ یکم پر پابندی نہیں تھی وہ سالہا سال جب بھی موقع بے موقع دل کرتا کپڑے بنالیا کرتی تھیں مگر ان کے بھی یہ پانچ جوڑے لازمی تھے جو نرگس یکم خود ہو کر بنا کر دیتی تھیں اور آج وہ بچوں کو تیار کرتے ہوئے جب خود دہی پرانا سوٹ پہن کر کھڑی ہوئی تھی تو آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے رمضان کے چار جوڑے پہننے والی نے گزشتہ دو سال سے ایک نیا جوڑا نہیں بنایا تھا رمضان کے تین جمعہ بھی یونہی گزر گئے تھے الوداع کے جمعہ پر اس کا دل بھر بھر آیا تھا اس کی بے حد

نہایتی کوشہناز خان نے ہی نہیں مبسام نے بھی محسوس کر لیا تھا مگر وہ ہنس کر ٹال گئی تھی مگر مبسام خان بھند نہ کیا تھا اور اس نے کہہ دیا تھا کہ دادی یاد آرہی ہیں اور وہ اسے میٹھے لے جانے کے لئے تیار ہو گیا تھا اس کا دل تو کیا تھا کہ وہ اڑ کر میٹھے پہنچ جائے اپنی دادی ماں اور باپ کے پاس لیکن وہ ایسا نہیں کر پائی تھی۔

”پھر بھی چلیں گے مبسام! آج طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔“ وہ فکر مند ہوتے شوہر کو دیکھتے نہ زری سے بولی تھی۔

”کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے کہ میں تمہاری اسی کا سبب جان سکوں۔“ وہ بیوی کا ہاتھ تھامتے نہ پے پر شکوہ انداز میں بولا تھا۔

”سارے حق آپ کے ہی تو ہیں مبسام! آپ پریشان نہ ہوں سچ میں کوئی بات نہیں ہے بس آج میٹھے کی بہت یاد آرہی تھی جمعہ الوداع کے دن دادو بہت اہتمام کرتی تھیں انظارِ حلقہ میں بڑائی تھیں رمضان المبارک کے جمعہ الوداع کی ظہر کی نماز سے قبل صلوة الخیر کا اہتمام کرتی تھیں دادو بلند آواز سے پڑھتی تھیں اور میں اور اماں ان کے ساتھ ساتھ پڑھتے تھے دادو چلیں ضرور منگوائی تھیں آج دادو بہت یاد آرہی ہیں۔“ وہ شوہر کو فغا ہوتے دیکھ کر زری سے بولی چلی گئی تھی اور وہ کم گو زبان کی اتنی طویل گفتگو کا خاموشی سے سن رہا تھا۔

”میں تو کہہ رہا ہوں چلو دادو سے مل آتے ہیں تم ہی منع کر رہی ہو۔“ وہ کچھ دیر قبل ہی تو عشاء کی نماز اور تراویح سے فراغت کے بعد گھر آیا تھا وہ بیوی کے نہ بہ صورت چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”وقت زیادہ ہو گیا ہے سحری میں اٹھنا بھی ہوتا ہے ہم بھی پریشان ہوں گے اور دادو وغیرہ بھی اس لئے چلیں گے۔“ وہ بڑی سہولت سے ٹال گئی تھی۔

”دل ہونے کے باوجود جانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ آج پانے کیڑے پہن کر اپنے گھر جا کر اپنے شوہر کی بے عزتی نہیں کروانا چاہتی تھی نہ ہی وہ میٹھے والوں کو

پریشان کرنا چاہتی تھی اس لئے وہ جاہت کو دل میں دبائے مسکراتی تھی مگر جانے کیا بات تھی کہ اسے آج صبح سے ہی نرسنگ بیگم بہت یاد آرہی تھیں مبسام اس کے منع کرنے پر اس سے پرانی باتیں سن رہا تھا کہ اس کا سیل منگلتا نہ لگا تھا رات کے دس بجے یا سہر کی کال دیکھ کر اسے پریشانی ہوئی تھی اور اس نے کال ریسیو کی تھی اور جو کچھ یا سرنے کہا تھا اسے تڑپا کر رکھ دیا گیا تھا ہوزان نے یکدم بہت پریشان ہو جانے والے مبسام کو دیکھا تھا اور اس نے بیوی کا ہاتھ تھام کر اسے دل دکھادینے والی خبر سنائی تھی۔

”دادو! اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔“ ہوزان کو یقین ہی نہیں آیا تھا وہ تڑپ اٹھی تھی اسے سنبھالنا مبسام کے لئے مشکل ہو گیا تھا ہوزان کو کہاں اندازہ تھا کہ آج صبح سحری کے وقت سے اسے جو دادی بات بے بات یاد آرہی تھیں تو اس لئے کہ وہ اب زندگی میں ان سے مل ہی نہیں پائے گی نرسنگ بیگم کی موت کا صدمہ ان سب کے لئے جان لیوا تھا باقی روزے اداسی کے ساتھ گزرے تھے چاند رات کو مبسام نے اسے مہندی اور چوڑیوں کے لئے مارکیٹ چلنے کا کہا تھا اور وہ روتے روتے گئی تھی۔

”دادو کی موت کا دکھ ہمیشہ تازہ رہنے والا ہے ہوزان مگر جانے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا۔“ وہ بیوی کا سر کا نہ سے لگائے دکھ سے بولا تھا۔

”مبسام! اپنوں کو کھونے کا عمل ایک لمحہ کا ہوتا ہے جو تمام عمر پر محیط ہو جاتا ہے صبر آتے آتے زمانے گزر جاتے ہیں۔“ وہ مبسام کے کا نہ سے پر سر رکھے سک رہی تھی مبسام جانتا تھا کہ وہ دادی سے بہت زیادہ بچ تھی اس لئے اسے اتنی جلدی صبر نہیں آنے والا تھا۔

”ہوزان کچھ خوشی کے لمحے ایسے ہوتے ہیں جن میں پوری زندگی قید ہو جاتی ہے اور وہ خوشی کے لمحے بھولے لئے نہیں ہیں ہر مشکل گھڑی میں وہی چند خوشی کے بل زاوراہ ثابت ہوتے ہیں۔“ وہ بیوی کو مثبت سوچ

دے رہا تھا اسے دکھ اور فرسٹریشن سے نکلنے کی راہ دکھا رہا تھا وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ دادی کے ساتھ گزارے ایسے دنوں کو یاد رکھے اور ان کی مغفرت کی دعا کرے اس نے اپنے جیون سا بھی کو دیکھا تھا اسے دادی کی بات یاد آئی تھی جو انہوں نے اس سے مہسام سے اچانک رشتہ طے ہو جانے کے بعد کہی تھی۔

”مہسام! بے شک تم سے عمر میں بڑا ہے اس کے گھر غربت ہے مگر تم اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزار دگی کہ مرد اگر عورت کو عزت دینا جانتا ہو تو عورت کی زندگی بڑی سہل ہو جاتی ہے۔“ اس نے مسکرا کر مہسام کو دیکھا تھا اور دادی کی بات دہرائی تھی۔

”مجھے تم سے محبت تھی ہوزان اور میری آخری سانس تک مجھے تم سے محبت رہے گی“ تم میری زندگی ہو۔“ وہ ہوزان کا ہاتھ تھام کر محبت سے بولا تھا وہ اپنے رویے کے ساتھ ساتھ لفظی اظہار کرتے بھی کبھی نہیں چوکتا تھا وہ بے حد سرخ پڑ گئی تھی ہوزان کو یاد تھا کہ شادی کے تین ماہ بعد جب وہ ایک دن اپنے میکے آئی تھی واپسی پر اس کی نگاہ اسی شخص پر پڑ گئی تھی جو اس کا نام نہاد عاشق تھا جس کے سبب اس کی زندگی میں طوفان آ گیا تھا اس نے کچھ کہا نہیں تھا س مہسام کو اشارہ کیا تھا اور وہ سب سمجھ گیا تھا اور مہسام نے بھی اس نو جوان کو پہچان لیا تھا وہ ہوزان کی گلی کی پچھلی روڈ پر بنے مکانوں میں سے ایک میں رہتا تھا اور کافی بدنام تھا اس کا بھی کام تھا وہ لڑکیوں کو اپنے چال میں محبت کو مہرہ بنا کر پھنساتا تھا اور جب وہ اس کی چال بازی میں آ جاتی تھیں تو پھر وہ انہیں بلک میل کرتا تھا ان سے رقم ہوتا راز راز یہ معاش کوئی تھا نہیں اسی طرح وہ زندگی گزار رہا تھا مہسام نے اسے کچھ نہیں کہا تھا کہ ایسے لوگوں کو کچھ کہنا فضول ہوتا ہے اس کے دل میں اگر کوئی پھاس تھی تو وہ نکل گئی تھی۔

”شرابی ہوئی بے حد اچھی لگتی ہو۔“ وہ شرارت سے بولا تھا اس کی پلٹیں عارضوں کو سجدہ کرنے لگی

تھیں۔ مہسام نے اسے مارکیٹ لے جا کر چوڑیاں اور عید کا جوڑا دلویا تھا اور وہ مہندی لگو کر گھر آئے تھے صبح عید بے حد اس بھی دادی کی دغالت کا غم تھا مگر وہ سب کے ساتھ مل کر خوش ہو رہی تھی اپنے بچوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”اکیلے اکیلے کیوں مسکرایا جا رہا ہے۔“ وہ جو بیٹی کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی وہ منظر سے بھاگی کا ہاتھ تھا غائب ہو گئی تھی اور مہسام اس کے سامنے آن ٹھہرا تھا۔ ”آپ بھی مسکرائیں میں نے منع تو نہیں کیا۔“ وہ شرارت سے بولی تھی۔

”میری مسکراہٹ تو تم ہو۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے ہوا سے اڑتی اس کی درازت کو پہنچ کر بولا تھا اور وہ ایک دم کلھکلارہی تھی عید کا دن تو خوشی کا پیامبر بن کر آیا تھا اس نے اپنے شوہر کو دیکھا تھا مہسام اپنے نام کی طرح تھا ہر وقت مسکراتے والا وہ مسکراہٹ کی چھایا میں چھپا لینے والا اس نے مسکراتے ہوئے شوہر کے سامنے عیدی کے لئے ہاتھ پھیلا یا تھا مہندی سے نچلی مہسام حیدر کے سامنے پھیلی تھی۔

”اللہ نے تمہاری عقلی پر میری تقدیر لکھ دی تھی تم میری شریک حیات“ میری مسکراہٹ ہو تم۔“ وہ اس کے پھلے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ گیا تھا ہوزان کو یقین تھا کہ آئے بھی زندگی میں اگر بھی کوئی آزمائش آئے گی تو وہ مہسام خان کے ساتھ اس کی مسکراہٹ تلے آرام سے اس آزمائش سے نکل آئے گی کہ جب جیون سا بھی ساتھ بھاگے والا ہو تو زندگی بہت خوبصورت گزرتی ہے وقتی پریشانیاں دکھ معنی ہی نہیں رکھتے۔

”اور میری ہر خوشی میری مسکراہٹ آپ سے ہے مہسام!“ وہ ہنر رنگ کی پیشواز میں شرمائی شرمائی سی اس کے سامنے کھڑی لب چاتے ہوئے بولی تھی ”فضا میں مہسام خان کا قہقہہ بھر گیا تھا ہوزان کو لگا تھا اسے اس کی عیدی مل گئی وہ بھی مسکرا دی تھی۔

☆.....☆.....☆





# دروازہ لکڑی بھیر

اس جانب ہی آرہی تھی بچہ اب بھی گلا پھاڑ رہا تھا خاتون کے ڈانسنے کی آوازیں بھی مسلسل آرہی تھیں۔ ”سنو یہ غبارہ بھائی کو دے دو وہ رو رہا ہے ناں۔“ وہ دروازے پر کھڑی بچی کو غبارہ پکڑا کر آگئے بڑھ گئی بچی بے یقینی سے اس اجنبی لڑکی کو دیکھنے لگی لڑکی گلی کے آخری سرے میں جا کر دائیں جانب مڑ گئی جبکہ بچی پر مسرت انداز میں گھر کے اندر بھاگی تھی گھر کا دروازہ کھل گیا تھا اور عین اس لمحے اس کے دل کے دروازے پر گنگناتل بھی کھل گئے تھے۔

☆☆☆☆

”جزاک اللہ امی“۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو امی نے فوراً اسے بانی کا گلاس بھر کے دیا تھا وہ پانی پینے کے بعد ان کی شکر گزار تھی۔

”آج تو بہت گرمی ہے سورج تو باہر آگ پر سا رہا ہوگا۔“ وہ عبا یا کا اسکارف سر سے اتارتے گویا تھی دھوپ کی حد سے رخسار سرخ ہو رہے تھے۔

”کیا پکانا ہے مجھے بتائیں۔“ وہ عبا یا اتار کر جگہ پر رکھتی گویا تھی۔

”تم کچھ دیر آرام کر لو میں پکالوں گی۔“ سعیدہ بیگم نے کہا تھا۔

”نہیں امی آرام کیا کرنا ہے آپ بتائیں میں جلدی سے کھانا بنا لیتی ہوں۔“ وہ کہتی ہوئی کمرے کی جانب بڑھ گئی منہ ہاتھ دھو کر وہ قدرے پرسکون ہو چکی تھی اور اب کچن میں کھانا بنانے کے لیے جت گئی تھی سعیدہ بیگم نے بغور اسے دیکھا تھا سبحان صاحب کے انتقال کے بعد وہ اپنے بھائی بہنوں کے لیے کیا

”اف کیا مصیبت ہے۔“ گاڑی میں بیٹھا ہارن پہ بارن دیئے جا رہا تھا مگر گھر میں موجود نفوس کے کانوں میں شاید جوں تک نہ رینگی تھی وہ سخت بیزار ہوا تھا سخت دھوپ دیکھ کر اس کی ہمت نہ ہوئی کے اسے سی کی ٹھنڈک کو چھوڑ کر باہر نکلے اور دروازے پر دستک دے۔

”شہر کے سارے ٹیلرز مرقعے ہیں جو بھابی نے ان خاتون کو پکڑے سینے کے لیے دیئے ہیں۔“ وہ اکتا گیا تھا کافی انتظار کے باوجود دروازہ نہ کھلا تو مارتا کیا مارتا کے مصداق وہ گاڑی سے نکل آیا اور دروازہ بجائے لگا اسکاٹی بیلیونی شرٹ بیلیو جینز پہنے اسکاٹی بیلیو سن گلاسز آنکھوں پر چڑھائے وہ بے حد ہنڈم لگ رہا تھا وہ بدستور دروازے پر کھڑا تھا جب گلی میں ایک غبارے والے کا گزر ہوا اسنے گھر سے ایک چھوٹا بچہ

”کھٹ سے دروازہ کھول کر غبارے والے کے پیچھے بھاگایا ہے پکڑنے کی نیت سے ایک بچی اس کے پیچھے دوڑی تھی اور کھینچ تان کر اسے واپس لے کر گئی تھی دروازے پر کھڑی بچوں کی والدہ بچے کو زبردستی گھر کے اندر کھینچ چکی تھیں احتجاجاً بچہ ڈھاڑیں مار کے رونے لگا تھا غبارے والا گلی کے کنارے پر کھڑا تھا اس نے کوفت سے تمام مناظر دیکھے تھے بچے کے رونے کی آواز اس کے اعصاب پر، تھوڑے کی طرح لگنے لگی تھی اس نے ایک زور وار دستک دی تھی اب ایک لڑکی

غبارے والے سے غبارے خرید رہی تھی اس نے لڑکی کو دیکھا اسے اس لڑکی کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا تھا سیاہ اسکارف کے ہالے میں اس کی گلابی کھلی سفید بے داغ رنگت کو اس نے بغور دیکھا تھا وہ غبارہ پکڑے



”نہیں آپ سب ریڈی ہو جائیں ہم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں۔“ اس نے کائی میں بندھی کھڑکی پر وقت دیکھتے ہوئے کہا ارم خاصہ بن سنور کے آئی تھی مگر وہ دانستہ اس کی جانب دیکھنے سے اجتناب برت رہا تھا ارم کو اس کا انداز بری طرح کھلنے لگا اس کے پاکستان آنے کے بعد وہ کئی بار اس سے مل چکی تھی ہر بار روحان اس سے خوشی سے ملا تھا اور بہت پر شوق نظروں سے اسے دیکھا کرتا تھا اسے لگا وہ روحان کو اپنا گرویدہ بنا چکی ہے جیلہ بیگم بھی بیٹی کی اس کا یہ سبابی پر خوش تھیں اور روحان پر واری صدقے ہو رہی تھیں مگر اب روحان کے انداز ان دونوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرنے لگے تھے۔

☆☆☆☆

”یہ کیا کر رہی ہو بیٹا۔“ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ سلائی مشین نکالنے لگی تھی جب انہوں نے استفسار کیا۔

”کپڑے سینے ہیں امی۔“ اس نے دھاگہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”مگر کیوں“ سعیدہ بیگم اس کے برابر بیٹھنے لگی تھیں۔

”عید آنے والی ہے امی آپ کو کوپتا ہے فریجہ کو نئے کپڑوں کا کتنا شوق ہے وہ عید کس اہتمام سے منانے کی عادی ہے اس لیے میں نے اپنے اسٹوڈینس کو کہا تھا کہ اگر کوئی کپڑے سلوانا چاہے تو مجھے دے دے میں ٹیلر سے کم پیسوں میں سی دوں گی۔“

”آج ایک اسٹوڈنٹ نے چار جوڑے دیئے ہیں ابھی تو رمضان شروع ہونے میں دوپہنٹے باقی ہیں میں چاہ رہی ہوں رمضان تک اضافی رقم کا انتظام کر لوں تاکہ فریجہ اور سیر کی شاپنگ اچھی طرح ہو جائے۔“ وہ فیوزنگ پر گلے کا نشان بناتے گویا تھیں۔

”اتنا مت تھکاؤ خود کو بیٹا فریجہ اور سیر بچے نہیں رہے وہ بھی گھر کے حالات سے واقف ہیں۔“ اس کی

کیا جتن کرتی تھی اس بات کا انہیں بخوبی علم تھا دو پلاٹ پر بنا چھ کمروں کا مکان چار نفوس کے لیے کافی تھا اس لیے مکان کا ایک حصہ کرائے پر چڑھایا گیا تھا سبحان صاحب نے ایک دوکان بھی خریدی تھی اس کا کرایہ بھی ہر ماہ مل جاتا تھا یوں سبحان صاحب کی غیر موجودگی میں زندگی کا پیسہ سچھانچان کر چل رہا تھا گھر اور دوکان کے کرائے سے گھر کے اخراجات پورے نہیں پڑتے تھے اس لیے تسبیح سبحان گھر سے غریب وکیشنل سینٹر میں لڑکیوں کو سلائی کڑھائی سیکھایا کرتی تھی جس کے عوض اسے مہینے کے آخر میں ایک معقول رقم مل جایا کرتی تھی شام کو بچے ٹیوشن پڑھنے آیا کرتے تھے ان پیسوں سے اچھے خاصے خرچے نکل جایا کرتے تھے تسبیح سبحان اپنے بھائی بہن کی خوشیوں کے لیے ہر وقت کوشش کیا کرتی تھی مگر بچویشن کے بعد اس نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی مگر اپنے بہن بھائی کی بہتر تعلیم کے لیے وہ دن رات محنت کیا کرتی تھی اپنی ادھوری خوشیوں کے باوجود وہ اپنے پیاروں کو مکمل خوشیاں فراہم کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆☆

”لے آئے میرے کپڑے؟“ روحان کو دیکھتے ہی فرحین نے استفسار کیا تھا۔

”جی آپ کے اس جوڑے نے بہت تھکا یا کل سے آج تک میں ان آٹنی کے گھر کے کتنے ہی چکر لگا چکا ہوں جو بوتلی زیادہ اور سستی کم ہیں۔“ وہ ہیزاری سے کہتے صوفے پر ڈھکے گئے۔

”پانی۔“ ارم نے مسکراتے ہوئے پانی کا گلاس اسے تھمایا تھا۔

”پانی کیوں بچے کو جوس بنا کر دو۔“ جیلہ بیگم نے بیٹی کو پانی دینے پر کہا۔

جیلہ روحان کی والدہ کی دور پرے کی رشتہ داروں میں تھیں مگر جب روحان پاکستان آیا کرتا تو وہ زیادہ تر ان کے ہی گھر میں پانی جاتی تھیں۔

”چلو تا بہت مزہ آرہا ہے۔“ ٹائٹ ٹراؤزر اور بے حد فننگ کی میض بھیگ جانے کی وجہ سے اس کے جسم سے مزید چپک گئی تھی دوپٹہ گھلا ہو جانے کی وجہ سے رسی بن چکا تھا جسے پھیلانے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی گئی تھی وہ اس کے سراپے سے بے اختیار نظر چرا رہا تھا۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا آپ جا کر مزے کرو۔“ اس کی دعوت پر صاف انکار کر کے وہ اٹھ گیا آنکھوں میں سیاہ اسکارف کے ہالے میں ایک خوبصورت چہرہ آن بسا پھر جیسے ہر شے ہر منظر نے دلکشی کو دی اسے اپنا آپ بھولنے لگا یاد رہا تو بس ایک پر نور چہرہ۔

☆☆☆☆

”طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی؟“ وہ جوڑا طے کر کے اپنے بیگ میں رکھ رہی تھی جب فریخہ کو بیڈ پر براجمان دیکھ کر استفسار کیا۔

”نہیں۔“ لہجے میں بے چارگی تھی۔

”میڈیسن“ کھالی ہے نا؟“ وہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار چیک کرتے ہوئے گویا تھی۔

”جی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”آؤ میں آئل لگا کر مساج کر دوں۔“ وہ تیل کی شیشی کے ہمراہ اس کے برابر براجمان ہو گئی اور سر کی مالش کرنے لگی۔

”آہی مجھے اپنا نمبر بدلنا ہے آپ مجھے نئی سم لے دیں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”کیوں؟“ اس کے مساج کرتے ہاتھ تھم گئے اس نے پریشانی سے فریخہ کی پشت کو دیکھا تھا۔

”آہی ایک راتگ نمبر سے مجھے تھج آتے ہیں وہ پتہ نہیں کون ہے جو میرا نام بھی جانتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے میں بہت پریشان ہوں۔“ اس نے اپنا مسئلہ بتایا تھا۔

”اچھا یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟“ سنجیدگی

باتوں کے جواب میں سعیدہ بیگم نے اسے سمجھانے کی سعی کی۔

”مگر میں نہیں چاہتی امی کے میرے بھائی بہن چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو ترسیں۔“ وہ سلائی کرتے مصروف انداز میں گویا تھی۔

”کیا کر رہی ہیں آپ؟“ فریخہ آنکھیں ملتی محن میں آئی تھی۔

”سلائی کر رہی ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے آنکھیں کیوں سو جی ہوئی ہیں؟“ فریخہ سعیدہ بیگم کی گود میں سر رکھے لیٹ گئی تھی تسبیح نے بغور اسے دیکھتے سوال کیا۔

”سر میں بہت درد ہے۔“ اس نے جواب دیا اچھا! میں چائے بنا دیتی ہوں انشا اللہ آرام آجائے گا اگر شام تک طبیعت ٹھیک نہ ہو تو ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اس لڑکی کو اپنے علاوہ ہر کسی کی فکر ہے۔“ سعیدہ بیگم نے اسے کچن میں جاتے دیکھ کر کہا۔

”آہی بہت اچھی ہیں امی۔“ فریخہ کے لہجے میں بہن کے لیے محبت تھی۔

”ہاں بس اللہ اس بچی کے نصیب اچھے کرے۔“ سعیدہ بیگم نے دل کی گہرائیوں سے اسے دعا دی تھی۔

☆☆☆☆

”کیا ہوا تم پانی میں کیوں نہیں اترے؟“ بلیو جینز وائٹ شرٹ میں بلیوس آنکھوں پر اسکاکی بلیوس

گلاسز چڑھائے خوبصورت میسر اسٹائل کے ساتھ ایک بڑے پتھر پر اسٹائل سے بیٹھے وہ کوئی ماڈل لگ

رہا تھا اسے الگ ٹھگ بیٹھا دیکھ کر آرام اس کے پاس چلی آئی۔

”یونہی۔“ کولڈ ڈرنک کاشن لیوں سے لگائے وہ بے نیازی سے گویا تھا۔

سے سوال کیا۔ ”پچھلے ایک ہفتے سے“ اس نے رخ تسبیح کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔“ انداز پر سوچ تھا۔

”میں اپنا نمبر بدل لوں گی۔“ فریحہ نے لب کشائی کی۔

”پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تم اس نمبر کو بیک لسٹ پر لگا دو ایسے عاشق ہر گلی، محلے میں پائے جاتے ہیں جو کسی طرح نمبر حاصل کر کے لڑکیوں کو بے وقوف بناتے ہیں تم کیمنشن نہ لو جواب نہ ملنے پر جلد ہی اکتا کر کسی اور طرف چل پڑے گا اف بھنورا صفت لوگوں کی سرشت میں گلی گلی منڈلا نا ہی ہوتا ہے۔“

”اس نے فریحہ کو سمجھایا۔“

”لیکن آپ اپنی نمبر بدل لوں گی تو زیادہ بہتر ہوگا

نا۔“ فریحہ نے اپنا نظریہ پیش کیا۔

”فریحہ خرابی کسی چیز میں نہیں ہوتی بلکہ ہماری

ذات کے اندر موجود ہوتی ہے جب تم اپنا ذہن صاف

رکھو گی تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں خراب نہیں کر سکے گی

تم نے سن رکھا ہوگا اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ موبائل

سے لڑکیاں خراب ہو رہی ہیں مگر میرا ماننا یہ ہے کہ

لڑکیوں نے موبائل کا غلط استعمال کر کے لوگوں کو موع

دیایے لوگ موبائل کو خرابی کی وجہ سمجھیں چیزیں بھی

بھی صحیح یا غلط نہیں ہوتیں ہمارا استعمال اسے صحیح یا غلط

ثابت کر دیتا ہے اگر تمہاری ذات کے اندر خرابی نہ ہو تو

تم اچھائی میں بھی برائی ڈھونڈ نکالو گی نمبر بدل لینا یا

کسی بھی چیز کو تبدیل کر لینے سے اس وقت تک کچھ

حاصل نہیں ہوتا جب تک ہم خود کو تباہ نہیں بے جان

شے ہمیں غلط کام کرنے پر نہیں اکسایا کرتیں یہ ہمارا

نفس ہے جو ہمیں برائی کی جانب دھکیلتا ہے بدلنا ہی

چاہتی ہو تو اپنی سوچ کو بدل دو کہ صحیح کیا ہے یا غلط۔ وہ

کہہ کر زرا دیر گوری تھی۔

”آپنی میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے

آپ لوگوں کا سر شرمندگی سے جھک جائے۔“ فریحہ

نے یقین دلایا۔

”مجھے تم سے یہی امید ہے فریحہ اس لیے تم بے

فکر ہو کر یہی نمبر استعمال کر دیکھیں یاد ہے فری جب پاپا

نے مجھے سیل فون لے کر دیا تھا جب امی کتنا خفا ہوئی

تھیں لیکن جب میں نے موبائل کو صرف ضرورت

کے تحت استعمال کیا تو امی نے خود ہمیں سیل فون دلا

دیا تھا اگر ہم کوئی غلط کام کرتے ہیں نا تو اپنے ساتھ

ساتھ دوسروں کے لیے بھی بہت سے دروازے بند کر

دیتے ہیں اسی طرح ہمارا اچھے کاموں کی جانب بڑھا

ہوا قدم دوسروں کے لیے بھی راہیں ہموار کر دیا کرتا

ہے ہمیشہ کوشش کرنا کہ تمہاری وجہ سے دوسروں کی راہ

میں رکاوٹیں کھڑی نہ ہو جائیں۔“ وہ اس کے بالوں

میں انگلیاں پھیرتے سمجھا رہی تھی اس نے قدرے

پر سکون ہو کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆☆

”ویز آر یو بے بی، میں صبح سے تمہیں کال کر

رہی ہوں تم نے جواب ہی نہیں دیا۔“ انیلا کی کال

اینڈ کرتے ہی اس کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔

”آئی واس بڑی۔“ (میں معصوف تھا) مختصر

جواب دیا انداز جان چھڑانے والا تھا۔

”مجھے ایک Text ہی کر دیتے۔“

”غلطی ہو گئی معاف کر دو۔“ اس کی باتوں کے

جواب میں بیزار دی سے کہا۔

”کیا کر رہے ہو؟“ اس کا شاید تفصیلی بات

کرنے کا دل تھا مگر جانے کیوں آج اسے اس کی

بنادنی باتوں سے بہت دشت ہونے لگی تھی رہ رہ کر

ایک چہرہ اس کے ذہن کے پردوں پر جھلکانے لگا اور

دل یک دم ہر شے سے اکتا گیا تھا ہر چیز سے اس کی

دلچسپی ختم ہونے لگی ذہن ددل عجیب کیفیت سے

دوچار تھے کسی سے بات تک کرنے کا جی نہیں چاہ رہا

تھا وہ تنہائی میں اس حسینہ کو سوچتا چاہتا تھا۔

”میں باہر ہوں بعد میں بات کرتا ہوں۔“ اس

نے بہ کرکال کاٹ دی اور سیل آف کر دیا۔

سعیدہ بیگم نے کہا۔

”آئی اللہ کا کرم ہے ہمارے بھائی کو کسی چیز کی ضرورت نہیں آپ بے فکر ہو کر دو جوڑے میں بیٹی کو رخصت کر دیں۔“ اسفر نے کہا۔

”آپ بے فکر ہو کر رشتہ کر لیں آئی میرا دیور ماشا اللہ بہت محنت کرنے والا سب کا خیال رکھنے والا ہے آپ کی بیٹی بہت خوش رہے گی۔“ فرحین نے اسفر کی تائید کی۔

”آپ دونوں کی بات تو ٹھیک ہے بیٹا مگر امریکہ بہت دور ہے میں اپنی بچی کو اتنی دور کیسے بھیج دوں۔“ سعیدہ بیگم رنجیدہ ہوئیں۔

”آئی اب تو ٹیکنالوجی بہت فاسٹ ہو گئی ہے ایک مین کلک کرو اور ویڈیو کال پر اپنا مطلوبہ بندہ آپ کے سامنے زندگی آسان ہو گئی اب دوریاں نہیں ہیں ٹیکنالوجی نے فاصلے سمیٹ لیے ہیں۔“ اسفر نے دلائل دے کر قائل کرنے کی سعی کی وہ خاموش ہو گئیں۔

”آپ نسلی سے سوچ لیں آئی ہم کل پھر آئیں گے مگر جواب مثبت دیجئے گا پلیز ہم بہت آس لئے آپ کے پاس آئے ہیں سیدہ ہمیں بے حد اچھی لگی ہے۔“ اٹھتے ہوئے فرحین نے سعیدہ بیگم کو ساتھ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆☆

”ای یہ کیسے ممکن ہے؟“ وہ سعیدہ بیگم کی باتیں سن کر حق دق رہ گئی۔

”بیٹا اتنی جلدی یہ سب آسان تو نہیں مگر رشتہ ہر لحاظ سے اچھا ہے۔“

”اچھا نہیں امی بہترین کہیں اتنا اچھا رشتہ آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔“ فریحہ نے کہا تھا۔

”ہاں آپ آئی آپ امریکہ گئیں تو پھر میں بھی وہاں آ جاؤں گا ورنہ ایسے تو امی مجھے بھی امریکہ نہیں جانے دیں گی۔“ سمیر بھی خوش تھا۔

”کون بھی وہ لڑکی اور آخر اس نے ان بچوں کو کیا غبارے خرید کر دیئے کیا آج کے زمانے میں بیٹی کوئی اتنا بے غرض ہو سکتا ہے؟ مطلب پرستی کی باتیں کیا کسی کے پاس اتنا خوبصورت دل آج بھی موجود ہے؟“ روحان فریدی جو پچھلے آٹھ سالوں سے امریکہ میں تھا اس کے آگے پیچھے لڑکیاں تیلیوں کی طرح منڈلاتی تھیں وہ جب کبھی پٹھیاں گزارنے پر اتان آتا لڑکیاں تو لڑکیاں ان کی مائیں بھی اس لئے آگے بچھ جاتیں سب کی کوشش یہی ہوا کرتی کہ اس طرح روحان کا انتخاب نظر ان پر ٹھہر جائے مگر وہ ان کے دل میں لڑکیوں کو دیکھ کر بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ وہ انہیں اپنی زندگی میں شامل کرے کیوں کہ وہ ان لڑکیوں کی نیتوں سے خوب واقف تھا وہ بہترین مستقبل کی خواہش میں اس کے آگے پیچھے پھیرا کرتی ہیں اس لیے وہ ان کے ساتھ محض وقت گزاری کرتا اور واپس لوٹ جاتا مگر آج اس انجان حسینہ نے جانے کیسے اس کے دل تک رسائی حاصل کر لی اور دل کا دروازہ دستک دینے بنائی کھل گیا اس کو دیکھ کر دل کی دنیا ہی بدلی ہوئی محسوس ہونے لگی دل جانے کیسی کیسی خواہش کرنے لگا تھا گھر بیوی بچے ایک نہ انوار پر سکون زندگی وہ اپنی سوچ پر خود ہنس رہا تھا آج سے پہلے اس نے کبھی شادی کے لیے سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا مگر اس لمحے اسے شادی کی شدید خواہش ہونے لگی وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کا اتنی فیصلہ کر چکا تھا اور اب کافی حد تک پر سکون ہو گیا حال میں کچھ دیر قبل ہونے والی بے نام سی بے چینی انہیں ان میں بدلنے لگی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے اس کے لب مسلسل مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆☆

”بیٹا ہم اتنی جلدی شادی کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔“ اسفر اور فرحین کی باتوں کے جواب میں

دیں۔“ میر نے کہا تھا۔  
 ”تمہارے بہن بھائی اب چھوٹے نہیں رہے  
 بیٹا۔“ سعیدہ بیگم نے سیمہ کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا  
 تھا وہ بیگم پلوں کے ساتھ مسکرا دی۔

☆☆☆☆

قسمت کی دیوی کس طرح مہربان ہوتی ہے کوئی  
 روحان فریدی سے پوچھتا محبت اس کے دل میں جوں  
 ہی دے پاؤں داخل ہوتی تو خوش نصیبی نے اس کا خیر  
 مقدم کیا وہ دونوں کی جاسوسی کے بعد اس نے سیمہ کے  
 گھر کا یہ معلوم کیا اور اس کے متعلق تمام معلومات  
 اکٹھی کر چکا تھا، فرمین اور اسفر نے بھائی بھائی ہونے  
 کا فرض بے حد خوش اسلوبی سے نبھایا تھا اور شادی کی  
 تاریخ طے کر آئے تھے وہ خوبصورت دن بھی اس کی  
 زیست میں جلد ہی آگیا جب سیمہ سہان، روحان  
 فریدی کی دہن بن کر اس کی زندگی میں خوشیوں کے  
 رنگ بھرنے آگئی۔

”شدید گری ہے۔“ اے سی کی کو لنگ بڑھاتے  
 ہوئے فرمین نے کہا تھا بھاری بھر کم جوڑے اور  
 جیولری سے مزین دہن بنی سیمہ نے ماتھے سے پسینہ  
 صاف کیا تھا۔

”تم ایزی ہو کر بیٹھو میں روحان کو بھیجتی ہوں  
 تاکہ وہ ہماری بھر کم جیولری سے رہائی دلانے میں  
 تمہاری مدد کر سکے۔“ فرمین شوخی سے گویا تھی۔  
 اس کے رخسار دھک اٹھے رخسار پر حیا کی لالی  
 بکھر گئی جسے دیکھ کر شرمین (فرمین کی بہن) کو آگ  
 لگ گئی تھی۔

”تم بھی باہر آ جاؤ۔“ فرمین شرمین کو کہہ کر باہر  
 نکل گئی جبکہ شرمین فرمین کی بات کو ان سا کر کے سیمہ  
 کے مقابلہ برا جمان ہو گئی۔

”بہت شرماری ہو کیا بات ہے؟“ شرمین اسے  
 بنوڑ دیکھتے گویا تھی۔

”ہاں بھی شرمانا بھی چاہیے موصوف بھی جی بھر

”لیکن امی میں آپ سب کو چھوڑ کر کیسے  
 چلی جاؤں؟ ابھی تو میرے بھائی بہن بھی  
 چھوٹے ہیں۔“ وہ کسی طور بھی شادی کے لیے  
 راضی نہ تھی۔

”بیٹا تمہارے بابا بھی تو چلے گئے ان کے بغیر  
 بھی تو مگر رہی ہے زندگی اور بیٹیوں کو والدین  
 کب تک اپنے گھر میں رکھ سکتے ہیں جلد یا دیر ان  
 کو رخصت کرنا ہی پڑتا ہے تم ہماری فکر نہ کرو اللہ  
 بہت بڑا ہے رشتہ بہت مناسب ہے اس سے اچھا  
 رشتہ نہیں ملے گا۔“ سعیدہ بیگم اسے قائل کرنے کی  
 کوشش کرنے لگیں۔

”لیکن امی میں.....“

”بس چپ ہو جاؤ میں اپنی ضرورتوں کے لیے  
 تمہاری خوشیاں قربان نہیں کروں گی وہ لوگ آج پھر  
 آئیں گے میں انہیں مثبت جواب دوں گی۔“ ان کا  
 انداز دو ٹوک تھا۔

”امی.....“ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب  
 ہلائے تھے۔

”آبی میرا BSC آرزو مکمل ہو گیا ہے اور اب  
 میں پڑھائی سے بور ہو گئی ہوں تمہارا ایک دینا چاہتی  
 ہوں میری فرینڈ کے والد کا اسکول ہے وہاں پچھری  
 ضرورت ہے میں نے اس سلسلے میں بات کی تھی اپنی  
 CV بھی دے دی تھی انکل نے مجھے بطور منیجر اپائنٹ  
 کر لیا ہے سیکریٹری بھی بہترین ہے اور میری  
 کارکردگی دیکھ کر سیکریٹری مین مزید اضافہ بھی ممکن ہے  
 آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔“ فریم نے اس کے  
 شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کو تسلی کر دائی۔

”اور آپ میں بھی انٹر کے پیپرز سے فارغ ہو چکا  
 ہوں اور اب بچوں کو ہوم ٹیوشن دینے کا ارادہ رکھتا  
 ہوں اب میں اپنی پڑھائی کا خرچہ خود اٹھانا چاہتا ہوں  
 آپ نے ہمیشہ ہماری خوشیوں کے لیے سوچا ہے آپ  
 اب ہمیں آپ کی خوشیوں کے لیے کچھ کرنے

بری طرح سے اس کے ٹکٹے میں پھنسی تھی اور درد سے کراہ رہی تھی۔

”میں تم جیسی گھٹی عورتوں کی جان لے لوں گی چند پیسوں کے عوض اپنی سوانیت کو تار تار کرتی ہیں۔“ اس نے اپنے ناخنوں کو اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو مجھے۔“ وہ اپنے بالوں کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی سعی کرنے لگی۔

”اتنی بھی کیا جلدی ہے ذرا میرے شوہر نامدار کے ساتھ وقت گزاری کا خراج تو وصول کر لو۔“ وہ اس کے گالوں پر پھپھڑوں کی بارش کرتے گویا ہوئی اس پر تو گویا خون سوار تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی تکیہ پوٹی کر دے۔

”تسبیحہ.....“ روحان کمرے میں داخل ہوا تھا اور اندر کی صورتحال دیکھ کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا وہ آگے بڑھا تھا تسبیحہ کو اپنی طرف کھینچ کر اس نے شرمین کو پرے دھکیلا تھا وہ فرش پر جا گری۔

”پوچھ“۔ شرمین کہہ کر کمرے سے نکل گئی جب کے تسبیحہ اب روحان کو گھور رہی تھی تیور خطرناک تھے۔

”کون ہے یہ لڑکی اور کیا بکواس کر رہی تھی؟“ وہ خاموش رہا کے اس سوال کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے؟“ اس کی خاموشی پر وہ مزید کھول اٹھی۔

”جو کچھ کہہ رہی تھی کیا وہ سب سچ ہے؟“ اس نے ایک بار پھر سوال کیا اس کا سر شرمندگی سے جھک گیا اس کی خاموشی اسے مجرم بنارہی تھی تسبیحہ کو سمجھنے میں لمحہ نہ لگا۔

”جب آپ اس طرح کی چپ حرکتیں کرنے کے عادی تھے تو آپ کو اپنے ہی ٹائپ کی کسی لڑکی کا انتخاب کرنا چاہیے تھا مجھے کیوں چنا آپ نے۔“ وہ

لے رہا تھک ہیں۔“ اس نے ایک ادا سے کہا اس کی بے باکی پر تسبیحہ ششدر رہ گئی۔

”اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو۔“ شرمین کا انداز اتنا تیز تھا۔

”تمہارے شوہر کو ہر لڑکی کے ساتھ رومنس نبھاؤنے کا شوق ہے خاصے رنگین مزاج واقع ہوئے ہیں۔“ وہ اس کے قریب ہو کر سرگوشی کے انداز میں گویا بھی تسبیحہ نے ناگواری سے اسے دیکھا اور چیخے ہوئی۔

”کمال ہے تمہارے شوہر نامدار تو میرے نزدیک آنے سے زرا نہیں ہچکچاتے تھے اور تم ہو کے نہ سے دور ہو رہی ہو۔“ وہ ڈھٹائی سے گویا تھی۔

”بکواس بند کرو تم۔“ اس کا ضبط جواب دے آیا پہلے تو وہ اس کی باتوں کا مفہوم ہی نہ سمجھ سکی مگر جب اس کے لفظوں کا پس منظر جان گئی تو اس کا خون لہولہا اٹھا۔

”مجھ پر کیوں چلا رہی ہو ہمت ہے تو اپنے میاں کو سنبالو۔“ جولیا شرمین نے اس کی جان جلا دی۔

”میں کیسے مان لوں کے تم سچ بول رہی ہو؟“ اس کے چہرے پر نظر گاڑیں وہ گویا بھی۔

”میرے پاس یادگار لکھوں کی کچھ یادیں موجود ہیں۔“ اپنا موبائل اس کی آنکھوں کے سامنے ہرایا تھا اس نے ایک نظر دیکھ کر منہ پھیر لیا اپنے شریک سفر کو کسی اور کے ساتھ دیکھنے کا یارا نہ تھا۔

”منہ کیوں پھیر لیا؟ عادت ڈال لو بنے بی اب تو ایسی پبلیشن کا آئے دن سامنا کرنا پڑے گا آخر وہ عرصہ عرصہ دراز سے امریکہ میں مقیم ہیں۔“ وہ کہہ کر بیڈ سے اٹھ گئی تھی۔

”تم تو امریکہ میں نہیں رہیں پھر کیوں کرتی رہیں یہ سب؟“ وہ زخمی شیرینی کی طرح شرمین پر تپتی تھی اس کے بالوں کو شخصی میں جکڑ کر وہ بے دری سے کھینچ رہی تھی شرمین کو اس حملے کی توقع نہ تھی وہ

ہاتھوں سے چوڑیاں اتار کر پھینکتے ہوئے گویا تھی  
کانوں کے اویزے اتار کر اس نے روحان کو دے  
مارے۔“

”خود جو مرضی کرتے پھر بس مگر بیوی پاک  
صاف ہونی چاہیے اپنے جذبے غیروان پر لٹاتے یہ  
خیال نہیں آتا کے اس ”پاکیزہ“ لڑکی کے بھی کچھ  
ارمان ہوں گے اس کی بھی خواہش ہوگی کے اس کے  
نزدیک سفر پر صرف اس کا ہی حق ہو اپنے جذبوں کو  
سمیٹ کر رکھنے والی لڑکی کیوں کر برداشت کرے گی  
کے اس کا سفر اس کا حق ہر کسی کو بانٹنا پھرے صرف  
لڑکیوں پر ہی یہ پابندی کیوں عائد کی جاتی ہے کہ وہ  
اپنی حدود میں رہیں اپنی حد سے تجاوز نہ کریں خود کو  
زمانے کی گندگی سے بچا کر رکھیں تو لڑکوں پر یہ قانون  
لاگو کیوں نہیں ہوتا کہ وہ بھی اپنے جذبات اوروں پر  
نہ لٹائیں خود کو زمانے کی غلامت سے دور رکھیں میں  
نے خود کو اس لئے سنبھال کر نہیں رکھا تھا کہ آپ جیسا  
شخص میرا مقدر بنے اس لئے مجھ سے دور رہیں میں  
آپ کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔“ وہ تمام زیورات  
اتار کر پھینک چکی تھی اور الماری سے اپنے لئے جوڑا  
نکال کر واش روم میں بند ہو گئی وہ بے جان قدموں  
سے کمرے سے نکل آیا۔ تسبیح کے سوالوں کے جواب  
اس کے پاس تو نہ تھے مگر ان سوالوں نے سوچ کے کئی  
دورا کر دیئے تھے جب لڑکے اپنی شریک سفر کے لئے  
اتنے حساس ہوتے ہیں تو پھر لڑکے یہ کیوں نہیں  
سوچتے کہ لڑکیوں کے بھی اسے شریک سفر کے حوالے  
سے کچھ خواب ہوں گے ان کی بھی کوئی خواہش ہوگی  
اسے اپنے وجود سے کراہیت ہونے لگی تھی اس نے  
ایک نرم و نازک جذبات رکھنے والی لڑکی کے ارمانوں  
کا خون کیا تھا یہ احساس اذیت دینے لگا تھا جس ہستی  
کو اس نے بہت چاہ سے اپنی زیست میں شامل کیا تھا  
اس لڑکی سے جانے کیوں اسے حد درجہ محبت تھی جانے  
کیوں وہ اس کو بے حد چاہنے لگا تھا وہ اس کی نفرت

سبنے کی ہمت کہاں سے لائے گا سوچ سوچ کر اس کا  
ذہن ماؤف ہونے لگا اس پر پچھتاوے بھی اسے  
گھیرے ہوئے تھے۔

☆☆☆☆

”تم نے یہ سب کیوں کیا تمہیں ذرا شرم نہ  
آئی؟“ شرمین کی ایسی حالت دیکھ کر اسے سخت  
صدمہ ہوا تھا اور جب اسے تمام صورتحال کا پتہ لگا تو  
وہ ششدر رہ گئی۔

”تم جانتی ہو اس کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں؟“  
فرحین غم و غصے کی کیفیت میں تھی۔

”نتائج جو بھی ہوں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“  
بے نیازی سے کہا تو فرحین اسے گھورنے لگی۔

”مگر مجھے فرق پڑتا ہے اسفر کی چند ہزار کی تنخواہ  
میں کسی طور پر گزارہ ممکن نہیں اگر روحان ہمیں ہر  
مہینے رقم نہ بھیجے تو ہم کبھی اتنی عیاشی سے زندگی  
نہیں گزار سکتے اس نے ہمیشہ بھائی کو سپورٹ کیا  
ہے اسفر کو جب پیسوں کی ضرورت ہو ان کی ایک  
کال پر وہ پیسے بھیجوا دیا کرتا ہے اگر آج میں اس گھر  
میں عیش کر رہی ہوں تو صرف اور صرف روحان کی  
وجہ سے۔“ فرحین نے اسے روحان کے احسان  
گنوائے جو اس نے کئے تھے۔

”تم عیش کر رہی ہو میں تو نہیں۔“ شرمین نے  
ڈھٹائی سے کہا تھا۔  
”صبح ہوتے ہی تم دفعہ ہو جانا میں مزید تمہاری  
موجودگی برداشت نہیں کر سکتی روحان مجھے نبھائیوں کی  
طرح عزیز ہے اگر اس کی زندگی میں کچھ بھی غلط ہوا تو  
میں تمہارا شہر کر دوں گی۔“ فرحین سختی سے کہہ کر  
کمرے میں جا چکی تھی وہ دل سے دعا گو تھی کہ تسبیح  
روحان کی سابقہ غلطیوں کو معاف کر دے۔

☆☆☆☆

فرحین نے تسبیح کا ناشتہ بنا دیا تھا وہ خاموشی سے  
ناشتہ کرنے لگی جس پر فرحین نے شکر کا کلمہ ادا کیا وہ

مصروف تھے اور امی کچن میں اس کے لئے جانے کیا کچھ بنا رہی تھیں۔

”کیوں کر رہی ہیں اتنا میں کوئی مہمان ہوں۔“ وہ کچن میں چلی آئی۔

”اب مہمان ہی ہو بیٹا شادی کے بعد تو بیٹی پرانی ہو جاتی ہے۔“ سعیدہ بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”مگر ابھی تو میں یہیں ہوں امی۔“ اس نے سلی کرائی۔

”بے شک یہاں ہو مگر لوٹنا تو اپنے ہی گھر ہے نا بیٹیاں اپنے گھروں میں ہی بھلی گنتی ہیں۔“ امی نے کہا تو وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

☆☆☆☆

رمضان کا چاند نظر آ جانے کی خبر سن کر جانے کتنے سال بعد وہ مسجد آیا تھا مسجد میں قدم رکھتے اس کے پیر لڑنے لگے گناہوں سے تضرع و جود اللہ کے سامنے کھڑا ہونے کی ہمت خود میں نہیں پاتا تھا اسے لگا اس کو اللہ پاک مسجد میں داخل ہونے ہی نادید گئے وہ لڑتے قدموں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گیا اور نماز کی نیت کرنے کے بعد نماز ادا کرنے لگا دل میں ہزار سو سے آئے تھے کئی خدشے تھے سر جھکے میں جھکائے وہ روتا رہا تھا اللہ نے اس کے پیروں سے زمین نہیں کھینچی تھی کہ وہ اس تک نہ پہنچ سکے وہ اس کرم پر بے طرح خوش تھا وہ دل سے شکر گزار تھا کہ اللہ اپنے بندوں کے لئے کبھی اپنے دروازے بند نہیں کرتا وہ کبھی اپنے بندوں کو نہیں دھکتا وہ کبھی اپنے بندوں کے گناہوں پر اس سے باز پرس کر کے شرمندہ نہیں کرتا کبھی طعنے بھی نہیں دیتا اس احساس کے تحت اس کی آنکھیں برستی رہیں دل کا درد آنسوؤں کے ذریعے بہنے لگا وہ اپنے گناہوں پر شرمندہ اپنے رب سے معافی کا طلب گار تھا نفس کی غلامی کر کے اس نے اپنی ذات پر بھی ظلم ڈھائے تھے اس کے گناہوں نے اس کی زیست کی خوشیوں کو نگل لیا تھا وہ مان گیا تھا کہ رب کی مافرمائی کر کے انسان

نہ خاموش تھی فرحین اس کی خاموشی پر پرسکون تھی بلکہ وہ جان کو اس کی خاموشی چسب رہی تھی وہ اسے اجنبی ہی کہہ دیتی سخت سنا دیتی تو اس کے دل کو قرار آ جاتا مگر وہ خاموش تھی۔ روحان نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تو وہ ان سے کمرٹی محبوب ہستی کی ناراضی اسے بہت بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بے حد دگر رفتہ تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا“ روحان تسبیحہ ایک تہجد اڑا رہے تھے۔ اس کی دگر رفتگی کو دیکھ کر فرحین گویا تھی وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ ایسے کے بعد بھی ان کے درمیان سرد مہری کی دیوار مائل تھی جو تسبیحہ نے کھڑی کی تھی اور روحان کی کوششوں کے باوجود اس نے سرد مہری کی دیوار کرائی نہیں تھی۔

”اگر تم اس رشتے سے خوش نہیں تو تمہیں مزید اذیت نہیں دوں گا“ انجانے میں میں پہلے ہی تمہیں تکلیف پہنچا چکا ہوں اب میں تمہیں قیدی بنا کر نہیں رکھنا چاہتا یہ رشتہ اگر تمہارے لئے بوجھ ہے تو میں تمہیں جلد اس رشتے سے آزاد کر دوں گا۔“ شادی کے ہفتے بعد بھی ان دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار قائم تھی ان دنوں وہ مسکراتا ہی بھول چکی تھی وہ اسے دیکھی نہیں دیکھ سکتا تھا اس لئے اس نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا وہ مزید اس کے لئے اذیت کا باعث نہیں بنے گا وہ اس کی باتوں کے جواب میں خاموشی سے چند جوڑے اپنے بیک میں ڈالنے لگی تھی یہ دیکھ کر روحان کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں دل میں بسنے والی اس کا گھر چھوڑ کر جا رہی تھی۔

☆☆☆☆

رمضان کا چاند نظر آ چکا تھا سب بے حد پر جوش تھے اس پر تسبیحہ کی آمد نے ان کو مزید خوشی دی تھی فریہ اور سمیرا اس کے ساتھ بیٹھے خوش گپوں میں



”مگر جاؤ گے کہاں؟“ اس نے سوال کیا۔  
 ”اتنی ساری جگہیں ہیں گھومنے کی“۔ میر نے بتایا تھا۔  
 ”تم لوگوں کی فرمائشیں کبھی ختم نہیں ہوں گی“  
 میر کے کہنے پر سعیدہ بیگم نے کہا۔

”کیا ہے ای آپ کی کو چند ماہ میں روحان بھائی  
 امریکا بلوائیں گے پھر جانے آپ کب آئیں ہم اس  
 عید کو یادگار بنانا چاہتے ہیں۔“ فریجہ کی بات پر تیزی  
 سے سلامتی کرتے ہاتھ ہم گئے تھے۔

”ہاں بیٹا تم کب تک امریکا جاؤ گی بات ہوئی  
 روحان سے وہ تمہیں ساتھ لے کر جائے گا یا اکیلے  
 واپس جائے گا؟“ سعیدہ بیگم کے سوال پر وہ چپ  
 سی ہو گئی۔

”کیا بات ہے بیٹا میں دیکھ رہی ہوں تم اس  
 موضوع پر کوئی بات نہیں کرتیں تم اتنے دنوں سے  
 یہاں ہو ایک بار بھی روحان گھر نہیں آیا سب ٹھیک تو  
 ہے؟“ سعیدہ بیگم کے سوال پر ماحول میں یکدم  
 سنجیدگی طاری ہو گئی فریجہ اور میر کو بھی صورتحال کی  
 سنگینی کا احساس ہونے لگا اسے سمجھ ہی آیا کہ وہ کیا  
 جواب دے سعیدہ بیگم بغور اسے دیکھ رہی تھیں وہ  
 کچھ کہنے کے لئے لب واکرنے لگی تھی جب اس کا  
 موبائل بج اٹھا۔

”السلام علیکم!“ سیل فون کان سے لگا ہی بتایا تھا۔  
 ”کیا بات ہے سیدہ تم تو ہمیں بھول ہی گئی ہو۔“  
 دوسری طرف فرحین تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے بھابھی۔“ اس نے کہا۔  
 ”رہنے دو تمہیں تو ہماری یاد ہی نہیں آتی۔“  
 فرحین کا غصہ بجاتھا۔

”آپ کیسی ہیں؟“ اس نے بات بدل دی۔  
 ”میں تو ٹھیک ہوں مگر روحان کی طبیعت کچھ  
 ٹھیک نہیں اسے بخار ہے سیدہ تم میری جھوٹی بہن کی  
 طرح ہو میں مانتی ہوں روحان کی کچھ عادتیں بری  
 تھیں مگر وہ فطرتاً ہی انسان نہیں بس غلط صحبت کی وجہ

کسی کا کچھ نہیں بگاڑتا اپنی جان پر ہی ظلم کرتا ہے اپنی  
 ذات پر اس نے جو ظلم کئے تھے وہ اس ظلم سے دہائی  
 کے لئے اپنے رب سے دعا گو تھا اپنے رب سے  
 معافی کا طلب کر رہا تھا جو اس کی بے پناہ نافرمانیوں  
 کے باوجود اس کی التجا بغور سن رہا تھا اس کے رب نے  
 گناہ سے لتھڑے وجود کو دھکا دیا نہیں تھا اس کے  
 پکارنے پر وہ اس کی فریادیں سن رہا تھا پوری دنیا اس سے  
 خفا ہو سکتی تھی اس کی حرکتوں پر اسے لعن طعن کر سکتی تھی  
 مگر وہ تو رب تھا جس نے اسے ایک لفظ کہہ کر شرمندہ  
 نہ کیا وہ تو اس کا منتظر تھا کہ وہ کب گناہوں سے  
 اکتائے اور اس کے پاس لوٹ آئے اور وہ رحم کرنے  
 والی ذات اپنی رحمتوں سے اس کے گناہوں کو بخش  
 دے اپنے رب کے آگے ہاتھ پھیلا کر دعا مانگ لینے  
 کے بعد اس کے دل میں سکون اور طمانیت کا احساس  
 بھرنے لگا وہ اب باقاعدگی سے نماز ادا کرنے لگا تھا  
 اب نماز پڑھتے ہوئے اس کے دل میں اپنے رب  
 کے لئے محبت محسوس ہونے لگی گناہوں کے  
 باوجود اس کے رب نے اس کی جانب سے منہ نہیں  
 موڑا اس کو طعنہ بھی نہیں دیا دھکا دیا بھی نہیں بلکہ سکون  
 اور طمانیت اس کے حوالے کر دیا تھا وہ کیوں اس رب  
 سے محبت نہ کرتا گناہوں سے دور ہوتے ہی وہ رب  
 سے بے حد قریب ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆

”آپ آپ عید ہمارے ساتھ ہی کریں گی؟“ وہ  
 ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد قرآن شریف کی تلاوت  
 کر کے فارغ ہوئی تھی اور سلامتی مشین نکالنے لگی تھی۔  
 ”ہاں کیوں؟“ وہ دھاگہ پروتے گویا تھی۔

”آپ پھر تو اس بار عید پر کچھ خاص ہونا  
 چاہئے۔“ میر پھلوں کا شاہ پرچمن میں رکھتے گویا تھا۔  
 ”خاص کیسے؟“ مصروف انداز میں سوال کیا۔

”ہر سال عید میں ہم بہت بور ہوتے ہیں اس بار  
 عید پر آؤ ننگ ہونی چاہئے۔“ میر نے کہا۔

دشمن جاں سرخ جوڑے میں ملبوس سرخ چوڑیاں کٹائی  
میں سجائے وارڈ روم میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی  
روحان کے حیرانی سے دیکھنے پر تسبیح نے مسکراتی نظر  
اس پر ڈالی تھی اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آیا وہ اپنی  
آنکھیں مسلنے لگا۔

”اتنی بے یقینی؟“ وہ اس کے مقابل کھڑی  
مسکراتے ہوئے گویا تھی۔

”تم یہاں؟“ وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ اچانک کیسے آ گئی۔

”میرا گھر ہے مجھے تو یہیں ہونا چاہئے تھا نا؟“

اس نے انسا سوال کیا۔

”بالکل یہ تمہارا اپنا گھر ہے تسبیح۔“ اس کے

سوال پر اس نے بے حد اپنائیت سے کہا تھا۔

”اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے آپ بھی

صرف میرے ہیں نا؟“ وہ بغور اس کا جائزہ لیتے گویا

نئی بڑھی ہوئی شیوا پر ابھرے بالوں پر نظریں مرکوز

کئے وہ جواب کی منتظر تھی۔

”تسبیح میں ایک بے حد برا انسان ہوں مگر میں

نے تمہیں بے حد چاہا ہے اور بہت چاہت سے اپنی

زیست میں شامل کیا ہے تم وہ پہلی لڑکی ہو جسے دیکھ کر

مجھے احساس ہوا کہ میں بھی ایک انسان ہوں مجھے بھی

شادی کرنی چاہئے اپنی ایک الگ دنیا بسانی چاہئے

اب تک میں حشینی زندگی گزارتا آیا ہوں جس میں

اپنے لئے میں نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں مگر تم کو دیکھ کر

احساس ہوا کہ زندگی خوبصورت ہے میں تمہارے

ساتھ اپنی پوری زندگی گزارنا چاہتا ہوں کیونکہ تم

ادروں سے بہت مختلف ہو تمہارا جو مقام ہے وہ کبھی

کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا میں نے بہت گناہ کئے مگر تم

سے ملنے کے بعد میرے دل میں برائی کا خیال تک

نہیں آیا مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے تسبیح میرے

لئے تم ہی سب کچھ ہو اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں

کہ میں صرف تمہارا ہوں۔“ وہ اس کا ہاتھ ہاتھوں

میں لئے گویا تھا وہ بغور اسے سن رہی تھی۔“ میں

... بڑ گیا تھا، کم عمری میں ماں باپ کا سایہ سر سے  
اندھ لیا کوئی تھا نہیں جو اسے ایتھے برے کی تیز سکھاتا  
افرنی سارا دن جاب پر ہوتے تھے پھر روحان نے  
امریکا کے ویزے کے لئے اپلائی کر دیا اور جھوٹی عمر  
میں ہی امریکا جیسے ملک میں رہنے لگا جس کی وجہ سے  
اس نے صحیح اور غلط میں فرق محسوس کرنا ہی چھوڑ دیا  
مگر اب اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے وہ  
اپنے کئے پر شرمسار ہے تسبیح ہو سکے تو اسے معاف  
کر دو غلطیاں تو انسانوں سے ہی سرزد ہوا کرتی  
ہیں اس نے نادانی میں غلطیاں کیں اب تم دوسری  
فائل کی نہ کر معاف کر دو اسے اور لوٹ آؤ اپنے گھر  
ہم منتظر ہیں۔“ فرحین نے کہا تھا۔

”میں بہت جلد آؤں گی۔“ اس نے لمحے میں

فیصلہ کر لیا تھا جب وہ اپنے کئے پر شرمندہ تھا تو وہ

ایوں نہ اسے معاف کرتی کہ اپنی غلطیوں پر معافی

مانگنے پر اللہ بھی اپنے بندوں کو معاف کر دیا کرتا ہے۔

”سچ؟“ فرحین کی چیخ بے ساختہ تھی۔

”جی مگر آپ یہ خبر اپنے تک ہی رکھئے گا۔“ زیر

اب مسکراتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

سعیدہ بیگم کے دل میں صرا بھارتے دوسوے اس

لی بات کے اختتام پر دم توڑ گئے تھے انہوں نے

مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا ان کے لئے یہ کافی تھا کہ

وہ خوشی اپنے گھر جانے کے لئے تیار تھی۔

☆☆☆☆

انظار میں وقت نے حد کم رہ گیا تھا وہ عصر کی نماز

ادا کرنے کے بعد آرام کی غرض سے بیڈ پر لیٹا تھا اور

اب نیند نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا اسے خبر

ہی نہ ہوئی اس کی آنکھ کسی شور کی آواز سے کھلی تھی

کھڑی پر نظر دوڑائی تو مغرب کی اذان میں کچھ ہی

وقت باقی تھا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، چوڑیوں کا شور اس کی

پشت پر ایک ہار پھر بلند ہوا اس نے رخ موڑ کر دیکھا

تھانہ جیسے پتھر کا ہو گیا اس کی سانسیں رکنے لگیں وہ

ماضی میں کی گئی حرکتوں پر بے حد شرمندہ ہوں مجھے معاف کر دو۔“ اس نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیئے۔

”آپ میرے نہیں اللہ کے مجرم تھے ان کی نافرمانی کی تھی جب آپ کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے اور آپ نے اللہ سے معافی مانگ لی تو پھر ایسا کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کو معاف نہ کروں میں نے آپ کو معاف کیا روحان۔“ وہ اس کے آنسو شہادت کی انگلی سے صاف کرتے گویا تھی۔

”آئندہ خیال رکھیے گا یہ آنسو دوبارہ آپ کی آنکھوں میں نہ آئیں کیونکہ میں آپ کو دکھ دینے کے لئے نہیں آئی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے گویا تھی۔

”تم تو میرے لئے خوشیوں کا جہان ہو؟“ اس کے ہاتھوں کو لبوں سے لگاتے اس نے کہا تھا مغرب کی اذان کی آواز فضا میں گونجنے لگی تھی۔

”چلیں روزہ کھول لیں آج ہم دعا بھی نہیں مانگ سکتے۔“ وہ کمرے سے نکلتے گویا تھی۔

”اللہ نے تو بتانا سب کچھ عطا کر دیا ہے۔“ وہ بھی اس کے پیچھے کمرے سے نکل آیا۔

☆☆☆☆

نماز ادا کر کے گھر لوٹا تو چاند نظر آنے کا شور سنائی دیا اس نے گاڑی کا رخ تسبیح کے گھر کی جانب موڑ دیا۔ سیدہ بیگم کے انکار کے باوجود وہ ان لوگوں کو اپنے گھر لے آیا۔

”امی۔“ وہ روحان کے ہمراہ اپنے ماں بہن بھائی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اس کو اپنے گھر والوں سے بے پناہ محبت تھی اور اس کا شریک سفر بنا کر کہے اس کے گھر والوں کی خوشیوں کا خیال کر رہا تھا اس کے دل میں روحان کے لئے عزت بڑھنے لگی۔

”آج رات ہم ذر باہر کریں گے اور دیر رات تک باہر انجوائے کریں گے اور کل نماز کے بعد ہم

فارم ہاؤس کا رخ کریں گے۔“ وہ چائے کی ٹرے لئے لان میں آئی تھی جب روحان سمیر اور فریحہ سے مخاطب تھا۔

”داؤ عید کے دن ہلکے؟“ سمیر کی خوشی دیدنی تھی۔ فریحہ کے چہرے پر بھی خوشی تھی امی بھی پرسکون انداز میں مسکرا رہی تھیں اپنے پیاروں کو مسکراتا دیکھ کر ان کے رگ و جاں میں اطمینان سرایت کر گیا تھا روحان کے لئے محبت اس دل کی زمین سے پھوٹنے لگی اس نے بے حد محبت سے روحان کو دیکھا جو چائے کاگ لبوں سے لگائے سمیر کی کسی بات پر ہنستا ہوا دوستوں کی طرح اس کے ہاتھوں پر ہاتھ مار رہا تھا اسے صبح معنوں میں کل عید کا گمان ہونے لگا۔ عید کا تعلق تو خوشیوں سے ہے اپنے پیاروں کی خوشیوں کی وجہ سے وہ عید کے لئے زندگی میں پہلی بار اس قدر پر جوش نظر آ رہی تھی۔

”چلو لڑکیوں جلدی سے تیار ہو جاؤ مہندی لگوانے پارلر جانا ہے پھر میں نماز پڑھنے جاؤں گا۔“ چائے کاگ رکھتے اس نے فریحہ اور تسبیح کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”میں تو تیار ہوں۔“ فرحین فوراً اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”تم دونوں بھی ریڈی ہو جاؤ امی آپ بھی لگوائیں مہندی۔“ اس کے لبوں سے امی کا لفظ سن کر اس کی سرتوتوں میں مزید اضافہ ہوا تھا۔

”نہیں بیٹا بچیاں لگوا آئیں۔“ اس کے امی کہنے پر سیدہ بیگم بھی نہال ہو گئیں فریحہ اور تسبیح ہی سر پر دوپٹہ جمائے اٹھ کھڑی ہوئیں تسبیح کے خوش سے چمکتے چہرے کو دیکھ کر روحان کے دل میں سکون اتر آیا وہ زندگی میں پہلی بار عید کو اپنوں کے ساتھ اس اہتمام کے ساتھ منانے جا رہا تھا اس مرتبہ صبح معنوں میں دلوں کی عید ہونے جاری تھی۔

☆.....☆.....☆

☆.....☆



برف اٹھنی کرتے تھے گرمی کے مارے لوگ انسانیت اور ہمدردی میں روز برف بھی دیتے تھے کے چلو کسی کا بھلا ہو جاتا ہے تو کیا برا ہے۔

☆☆☆☆

اس روز گرمی کی شدت معمول سے قدرے زیادہ تھی باقی رہی سہی کسر لوڈ شیڈنگ نے پوری کر دی سب گرمی سے بے حال بجلی والوں کو کوسے اور ہسٹ فین جھلنے میں مصروف تھے۔ برف لینے والے بچوں نے ایک گھر کا دروازہ بجایا جہاں سے روز ایک مارا جی بڑے پیار سے دو کٹورے برف دیتی تھیں دو تھیں بار کنڈی، بجانے پر اندر سے گرمی اور لوڈ شیڈنگ کا مارا رزم باہر نکلا جو چھٹی کی وجہ سے گھر پہ تھا۔ ”برف ہے؟“ بچے نے بھرے بالوں وا۔ لڑکے سے پوچھا۔

”لائٹ بج رہی ہے بند ہے برف کیا پودوں پہ آگ رہی ہے یا دھوپ میں بن رہی ہے؟“ جواباً رزم کاٹ کھانے والے انداز میں بچے سے سوال کیا بچے نے نظر اس کے غصے بھرے چہرے کو دیکھا وہ منہ بناتا ادائے بے نیازی سے اگلے گھر کے دروازے کو بجانے لگا۔

”دامخ خراب کیا ہوا ہے سب نے“۔ وہ غصے سے دروازہ زور سے بند کر کے اندر چلا گیا۔ بلا آد تین گھنٹے کے صبر آتما انتظار کے بعد لائٹ آئی آگ سے شرابور جسم پر چٹکے کی ہوا بڑی ٹھنڈی لگ رہی تھی وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا دو تین منٹ ہی گزرے

جون کی چلچلائی دوپہر میں گرما کا تپتا سورج آگ برساتا فلک یہ جلوہ افروز تھا اس کی دہشت ہی اتنی تھی کے انسان، چرند پرند بھی اپنے اپنے ٹھکانوں تک محدود رہنے پر مجبور تھے، کاروبار زندگی شدت گرمی کے باعث قدرے ست پڑ گئے تھے ہر کوئی ٹھنڈی اور پرسکون جگہ چاہتا تھا رزم سر درد کی وجہ سے آفس سے جلدی گھر آ گیا تھا اور اب کونے والے قدرے کم گرم کمرے میں آرام کر رہا تھا جب کوئی زور دار دستک سے دروازہ ٹھوک کر اس کے آرام میں خلل ہوا تو اس نے بد مزاج ہو کر گھڑی کی طرف دیکھا۔

”اتنی گرمی میں کون آ گیا؟“ ڈھائی بج رہے تھے وہ بڑبڑاتا ہوا سیلر میں ہاؤس اسٹاپا ہر کی طرف بڑھالبا کھانچن آج سے پہلے بھی اتنا برا نہیں لگا تھا جتنا اب لگ رہا تھا چھٹی ہوئی دھوپ نے اسے مزید بے زار کر دیا۔

”کون ہے؟“ اس نے قریب جا کر پوچھا۔

”برف ہے؟“ جواباً جو سوال ہوا اس نے اس کے تن بدن میں آگ بنی لگادی۔

”نہیں ہے“۔ اس نے غصے سے جواب دیا اور تقریباً بھاگتا ہوا واپس کمرے تک آیا۔

”ساری نیند خراب کر دی آوارہ گردوں نے خود تو ان ڈھیٹوں کو گرمی سردی اٹھ نہیں کرتی“۔ وہ بڑبڑاتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆☆



آج کل اماں خالہ کے گھر مگنی ہوئی تھیں کہ خالہ کی

”اوہ ..... سوری ..... میں سمجھا وہ ..... مانگنے والے بچے ہیں۔“ اسے خود پر غصہ آیا کہ وہ بغیر پوچھ

بھیج دیا گیا اور یوں ان کا رابطہ ختم ہو گیا تھا اب سالوں بعد قسمت نے انہیں پھر ملا دیا آٹھ ماہ پہلے سیما آئی کے شوہر کا انتقال ہوا تھا اور اس سے زیادہ ان کے سرال والوں نے ان ماں جی کو برداشت نہیں کیا اور گھر سے نکال دیا ایک ہی جی ہے انوشے جس کا حال ہی میں بی اے کا رزلٹ آیا ہے۔ اماں کو سیما آئی کے سرال والوں پر بڑا غصہ آیا کہ اکیلی عورت کو جوان لڑکی کے ساتھ بے گھر کر دیا۔

”ارزم بیٹا! تم اس بچی کے لئے کوئی کام دیکھو اسے دفتر میں سیما تو کہہ رہی تھیں کہ وہ سلائی کرے گی مگر سلائی سے بھلا کہاں گزرا ہوتا ہے۔“ کھانے کے دوران اماں نے ارزم کو مخاطب کیا وہ کل سے فکر مند تھیں۔

”اماں! دفتر میں تو مشکل ہے بی اے بہت کم ہے آپ انہیں کہیں کسی پرائیویٹ اسکول میں ٹرائی کریں پیچنگ ٹھیک رہے گی۔“ ارزم نے بتایا تو اماں فکر میں پڑ گئیں۔

”اچھا تو بیٹا تم ہی کسی اسکول سے پتہ کر دو نا وہ بے چاری کہاں خوار ہوتی رہیں گی۔“ اماں کے کہنے پر ارزم نے اگلے چند دنوں میں قریبی پرائیویٹ اسکول میں اسے جاب دلوا دی 6000 تنخواہ ابھی سیما آئی اسی پر بھی بہت خوش ہوئیں اور ارزم کا شکریہ ادا کرتے نہ رکھیں سیما آئی کے گھر فریق نہیں تھا تو اماں روزانہ کو بڑا کنوڑا برف دیتی تھیں ارزم آفس میں بڑی رہتا اس کے بعد اس کی سیما آئی سے ملاقات نہ ہوتی۔

☆☆☆☆

رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ گرمی کی شدت میں اضافہ ہوا تو گھر سے ٹکنا مزید دو بھر ہو گیا روزے میں پیاس کی شدت سے برا حال ہو جاتا۔

”آج تو بہت ہی گرمی ہے ارزم! دیے اس وقت تک تو روزہ تیش کم ہو جاتی ہے۔“ اماں نے تبت

لی شروع ہو گیا تھا۔

”کوئی بات نہیں برف ہے؟“ لڑکی نے سبز اپنے کے پلو سے چہرے پر آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے پوچھا تو ارزم نے اس سوال پر بے اختیار اس لڑکی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا، شلوار قمیص، دوپٹہ تینوں کے رنگوں کا دور دور تک ایک دوسرے سے لونی لعلق نہ تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے سالوں پرانے پٹریے ہیں جن کا رنگ بھی اب وہ نہیں رہا تھا جو بھی ہوا کرتا تھا۔

”چہرے سے تو نہیں لگتی مانتے والی مگر حلیہ تو دیا ہے۔“ ارزم نے حیرت سے سوچا۔

”جی وہ دراصل ہم آپ کے ساتھ والے گھر میں بنے آئے ہیں صفائی کر رہے تھے کہ بجلی چلی گئی، ٹنڈا پانی بھی نہیں تھا تو اماں نے کہا کہ آپ کے گھر سے پتہ کر لوں اگر برف ہو تو۔“ لڑکی ارزم کے دینے کے اعزاز سے فوراً سمجھ گئی کہ وہ اس کے حلے سے اسے کچھ سمجھ رہا ہوگا اس لئے فوراً وضاحت دی اس سے پہلے کہ وہ اسے معاف کر دیکھ کر دروازہ بند کر دے اس کا حلیہ بھی تو ایسا تھا اسے شرمندگی ہوئی کہ وہ اس حلے میں گھر سے باہر آگئی یہ سوٹ اس نے گھر کی صفائی سہرائی کے وقت پہننے کے لئے رکھا ہوا تھا۔

”اوہ۔“ وہ اپنی سوچ پر مزید شرمندہ ہو گیا۔

”آپ نمبر ہیں میں ابھی لاتا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولتا اندر گیا اور بڑا کنوڑا برف لا کر اسے تھمائی تو وہ شکر یہ ادا کرئی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆☆

دو دن بعد اماں آگئیں ارزم نے انہیں نئے بیوں کا بتایا تو وہ خود جا کر ان سے مل کے آئیں ابھی پروہ بہت خوش تھیں نئی پڑوسن سیما آئی اماں لی نیکی کے محلے کی ہمسائی نکلیں دونوں اسکول انکھی ہائی تھیں پھر ان کی پڑھائی چھڑوا کر انہیں پیادیں

پوچھا۔

”وہ برف چاہئے“ لڑکی نے جھکتے ہوئے بتایا۔  
 ”سوری برف نہیں ہے۔“ اس نے جلدی سے  
 جواب دیتے ہوئے دروازے کی کھڑکی کی طرف  
 ہاتھ بڑھایا کہ اس سے پہلے مزید کوئی برف والا آئے  
 دروازہ بند کر لوں۔

”جی مگر..... آئی تو روز برف دیتی ہیں اماں  
 کو۔“ لڑکی کے سوال پر غور سے اسے دیکھا تو مزید  
 شرمندہ ہو گیا وہ ساتھ والی آئی کی بیٹی انوشے بھی  
 ارزم نے اسے پہچانا ہی نہ تھا کیونکہ آج وہ بچپن  
 ملاقات سے قدرے مختلف حلقے میں تھی لان کے لیسن  
 کمر کے سوٹ میں نیوی بلیو بڑا دوپٹہ پہرے کے گرد  
 سلیٹے سے لپیٹا ہوا تھا پھر ارزم سے ایک بار ہی تو  
 ملاقات ہوئی تھی۔

”اوہ آئی ایم سوری میں نے آپ کو پہچانا ہی  
 نہیں تھا۔“ ارزم نے معذرت کی تو وہ مسکرائی اسے  
 بھی سمجھ آ گئی تھی۔  
 ”ویسے روزوں میں برف؟“ ارزم نے سوال  
 کیا۔

”جی وہ افطاری کے لئے کچھ دیر پہلے ڈالیں تو  
 افطاری تک ٹھنڈا پانی ہوتا ہے۔“ جواباً اس نے  
 وضاحت دی تو وہ مسکرایا۔

”اچھا آپ ٹھہریں میں ابھی لے کے آتا  
 ہوں۔“ وہ تیزی سے بولتا اندر چلنا۔ اندر اماں کے  
 پوچھنے پر اس نے بتایا تو اماں خفا ہوئیں۔

”بچی کو غیروں کی طرح دروازے پر کیوں روکا  
 ہوا ہے اندر لے آؤ اتنی گرمی ہے باہر۔“ لہذا ارزم  
 بھاگ دوڑا باہر گیا اور انوشے کو لے کر اندر آیا۔

”بیٹھو بیٹھو! یہ ارزم بھی ناچکا ہے بالکل خواہ  
 مخواہ تمہیں اتنی گرمی میں باہر کھڑا کر دیا۔“ اماں نے  
 ارزم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ارزم نے منہ بتایا  
 انوشے ہی۔

پریشانی ہیٹ پاؤ ڈر چہرے اور گردن پر لگاتے ہوئے  
 کہا تو ارزم نے فائلوں سے سر اٹھایا۔  
 ”مگر اللہ کا شکر ہے کہ بجلی ہے ورنہ جب بھی  
 زیادہ گرمی ہوتی ہے بجلی والے بھی ناک میں دم  
 کر دیتے ہیں۔“ ارزم نے مسکراتے ہوئے کہا تو اماں  
 نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا وہ دونوں یونہی باتیں کر رہے  
 تھے جب دروازے پر دستک ہوئی۔

”ان برف والوں کو تو روزوں میں بھی چین نہیں  
 ہے قسم سے اماں! بڑے ہی ڈھیٹ بچے ہیں۔“  
 ارزم فحش سے بولا تو اماں نے ایک نظر بیٹے کے فحش  
 بھرے چہرے پر ڈالی آج تیسرا روز تھا ارزم کے  
 آفس کی ٹاسٹنگ کل ہی تبدیل ہوئی تھی اب وہ روز  
 اس ٹاسٹنگ ہوتا تھا۔

”تو کیا اب وہ بے چارے افطاری کے لئے  
 برف بھی جمع نہ کریں۔“ اماں نے ارزم کو جواب دیتے  
 ہوئے فریج سے برف کا کٹورا نکالا تو اس نے اماں کی  
 طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر اماں کے ہاتھوں سے  
 برف لے کر شاہ پر میں ڈال کر دروازے کی طرف  
 بڑھا۔

”اتنی تھوڑی۔“ برف دیکھ کر بچے نے حیرت  
 سے آنکھیں پھیلائیں۔

”اور برف ہے؟“ دوسرے بچے نے سوال کیا تو  
 ارزم نے اسے گھورایا۔

”نہیں اتنی ہی تھی اب جاؤ۔“ اس نے سختی سے  
 جواب دے کر دروازہ بند کیا اور تیزی سے اندر کی  
 طرف بڑھا پیچھے سے پھر دستک ہوئی۔

”بہت ہی ڈھیٹ ہیں یہ تو سیدھی زبان سمجھ نہیں  
 آتی انہیں۔“ ارزم غصے سے چلنا۔

”اب کیا تکلیف ہے؟“ اس نے غصے سے  
 دروازہ کھول کر پوچھا تو سامنے کھڑی لڑکی گڑبڑا گئی

ارزم ایک مرتبہ پھر اپنی حرکت پر شرمندہ ہوا۔  
 ”جی فرمائیے۔“ اس نے قدرے نرم لہجے میں



گری میں احتیاط کرتے ہیں جاؤ ارزم۔“ اماں نے انوشے کو سمجھاتے ہوئے ارزم کو باہر نکلنے کا کہا تو وہ دونوں باہر آ گئے۔

”ارزم جی۔“ دروازے پر پہنچ کر انوشے نے اسے پکارا تو ارزم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”سوری“ میں نے آپ کو کھڑی بیٹی کہا آپ کو برا لگا۔“ انوشے کے شرمندہ انداز پر ارزم اسے دیکھتا ہی رہ گیا، جھکی پلکیں شرمندہ لہجہ اسے خاموش پا کر انوشے نے اسے دیکھا تو ارزم چونکا۔

”اے اوکے۔“ وہ مسکرایا تھا اس معصوم معذرت پر وہ اندر چلی گئی تو ارزم واپس آ گیا، مگر کچھ خالی پن محسوس ہوا جیسے کچھ کھو گیا ہے۔

☆☆☆☆

ارزم کے دوست حسن کے ہاں ان سب دوستوں کی اظہار یارنی تھی ارزم عصر کے بعد پہنچ گیا۔ ”یار ایک کام کرو باہر سے برف تو لے آؤ یہ کم ہوگی اتنے میں باقی سامان میں ریڈی کرتا ہوں۔“ وہ دونوں شربت بنارہے تھے جب حسن نے کہا تو ارزم برف لینے چلا گیا، گلی کے کونے پر ہی اسے برف نظر آ گئی دو بچے ایک دکان کے باہر دری بچھائے برف بچ رہے تھے ارزم نے غور کیا تو حیران رہ گیا کہ یہ دونوں لڑکے تو وہی برف والے تھے جنہوں نے اس کی ناک میں دم کیا ہوا ہے روز دن میں دو بار محلے میں برف مانگنے آتے ہیں۔

”یہ برف لے کے یہاں بیچتے ہیں۔“ ارزم کو انہیں دیکھ کر غصہ آیا۔

”چلو کوئی بات نہیں ہماری مدد سے کسی کا بھلا ہو جاتا ہے تو ہمارا کیا جاتا ہے۔“ ایک دم ہی اسے اماں کی بات یاد آئی تو مسکرا کر سر جھٹکا آگے بڑھ گیا ان لڑکوں کی برف ارزم کے پہنچنے تک بک گئی تھی اب وہ دری اٹھا کر شاہر میں ڈال رہے تھے ارزم آگے نکل گیا کہ کہیں اور سے پتہ کرلوں۔ کچھ دیر بعد وہ برف

”ارے تم یہیں کھڑے ہو جاؤ جا کے انوشے نے لئے ٹھنڈا پانی کے لاؤ۔“ اماں نے اسے پیچھے برف پکڑے کھڑا دیکھ کر جلدی سے کہا تو تیزی سے پلٹتے ہوئے رکا اور حیرت سے اماں کو دیکھا۔

”اماں! رمضان ہے۔“ ارزم نے اماں کو یاد دلایا تو اماں نے بے اختیار سر پر ہاتھ مارا انوشے نے سہلراتے ہوئے منہ نیچے کر لیا ارزم بھی مسکرایا۔

”اس گری نے مت مازی ہوئی ہے مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔“ اماں گری کو کوستے ہوئے بولیں تو ارزم جو برف تھا سے کھڑا تھا برف کی ٹھنڈک مزید برداشت نہ کرتے ہوئے فوراً آگے بڑھا اور برف والا شاہر انوشے کے سامنے میز پر رکھ دیا انوشے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ کچن کی طرف بڑھا۔

”یہ میرا ارزم نامیرا بیٹا بھی ہے اور بیٹی بھی۔“ اماں نے پیار سے بتایا۔

”کھڑی بیٹی۔“ انوشے کے منہ سے بے اختیار نکلا تو کچن میں کھڑے ارزم نے فوراً پلٹ کے اسے دیکھا انوشے گھبرا کر فوراً کھڑی ہو گئی۔

”اچھا آئی“ میں چلتی ہوں اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔“ انوشے نے شاہر اٹھاتے ہوئے کہا تو اماں نے سر ہلایا۔

”ارزم بیٹا! چھتری لے کے انوشے کو گھر تک پہنچاؤ آؤ دھوپ بہت تیز ہے۔“ اماں نے اسے پکارا۔

”بچی کو خود نہیں پتا کہ دھوپ تیز ہے آئی تو ایسے ہی تھی۔“ ارزم غصے سے بڑبڑاتا ہوا پاپا آیا اور اماں کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے چھتری اٹھائی ساتھ ہی ایک اپنی نظر انوشے پر ڈالی۔

”نہیں آئی! میں چلی جاؤں گی چھتری کی ضرورت نہیں ہے شکریہ۔“ انوشے اسے چھتری کھولنا دیکھ کر جلدی سے بولی۔

”کیوں ضرورت نہیں ہے باہر اتنی گرمی ہے بیٹا“

لے کر واپس آ رہا تھا تو اس کی نظر اتفاق سے پھر انہی لڑکوں پر پڑی ارزم کو انہیں دیکھ کر غصہ آیا کیونکہ وہ سگریٹ پی رہے تھے۔

”میں سمجھا شاید برف کی کمائی گھر لے کر جاتے ہوں مگر یہ تو اپنی فضول حرکتوں کے لئے یہ کام کرتے ہیں، گھنٹیا لوگ۔“ ارزم نے غصے سے دیکھتے ہوئے سوچا، جواب اسنو کر کلب میں گھس گئے تھے جہاں پر لڑکے اسنو کر اور دیگر گیمز کے ساتھ فلمیں بھی دیکھتے تھے۔

”آئندہ آئیں تو سہی اچھی طرح سے برف دوں گا دونوں کو۔“ ارزم نے خطکی سے فیصلہ کیا گھر آ کر اس نے حسن کے ساتھ ذکر کیا تو اس نے بتایا۔

”ان لڑکوں کو اسی وجہ سے ہمارے محلے والے اب برف نہیں دیتے یہیں سے لے کر یہیں بیچتے ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک بری عادت ہے ان لڑکوں میں۔“ ارزم نے گھر آ کر اماں کو بتایا تو انہیں بہت دکھ ہوا۔

”ایسے لوگ ہمارے معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتے ہیں ان کی وجہ سے اصل حق دار محروم رہ جاتے ہیں اور یہ مفت خور ہے ان کا حق مار لیتے ہیں۔“ اماں دکھ سے بول رہی تھیں۔

”مگر عوام بھی کیا کرے اماں! ایسے لوگ ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں، مستحق لوگوں تک رسائی بھی مشکل ہے، بھلا ہم لوگ کیسے ان مفت خوروں اور اصل مستحق لوگوں میں فرق ڈھونڈ سکتے ہیں، سب ایک سے ہی لگتے ہیں۔“ ارزم نے بھی اپنا خیال ظاہر کیا۔

”یعنی پھر اب یوں دروازے پر آنے والوں کو کچھ نہ دیں بلکہ اپنے آس پڑوس میں ضرورت مندوں کو دیں جو ضرورت کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔“ اماں نے نتیجہ اخذ کیا تو ارزم نے بھی اماں کی بات سے اتفاق کیا۔

☆☆☆☆

کہتے ہیں نابرے وقت میں رشتوں کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے کونسا اپنا کس حد تک اپنا ہے اور کون صرف اچھے وقت تک اپنا ہے سب واضح ہو جاتا ہے۔

ارزم پر بھی خونی رشتوں کی حقیقت اس وقت ظاہر ہو گئی تھی جب وہ گریجویشن کر رہا تھا اور اس کے ابا کا انتقال ہو گیا مگر کار خراج جواب کی خواہ سے ہی چلتا تھا اس کو چلانے کے لئے ارزم کی اماں نے خونی رشتوں کی طرف دیکھا کہ شاید کوئی ان کا سہارا بنے گا مگر اس وقت ان پر یہ تلخ حقیقت آشکار ہوئی کہ ان کا اپنا تو

کوئی تھا ہی نہیں سب اس اسٹیشن اس دولت کی وجہ سے تھے جو ارزم کے ابا کے دم سے تھی۔ وہ لوگ اپنی ذاتی کوٹھی میں رہتے تھے جس پر ابالون لے کر اور کچھ سیونک ڈال کر اپنا کاروبار شروع کر رہے تھے ابا کے جاتے ہی کاروبار بھی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا وہ دونوں ماں بیٹا مجبوراً کوٹھی فروخت کر کے اس چھوٹے سے مکان میں آ گئے ارزم نے ٹیوشن شروع کی جو وقت کے ساتھ اکیڈمی بن گئی ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا جس کے نتیجے میں وہ آج اس مقام پر تھا کہ اگر وہ چاہتا تو اپنی کوٹھی دوبارہ خرید سکتا تھا مگر اب ان ماں بیٹا کو بڑے گھر کی چاہ نہیں رہی کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا کہ گھر بڑے ہو جائیں تو دل چھوٹے ہو جاتے ہیں غیر بھی سگوں سے بڑھ کر اپنے بن جاتے ہیں، اور انہیں اب ایسے اپنوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

ارزم ایک مشہور کمپنی میں اعلیٰ پوسٹ پر تھا ان کے مالی حالات بہتر ہونے کی وجہ سے دولت زدہ رشتوں کا خون پھر سے جوش مارنے لگتا تھا خالہ ناموں، پھپھو تایا آتے جاتے تھے شاید وہ چاہتے تھے کہ سب پہلے جیسا ہو جائے وہ لوگ تو ان کو گھر بد لینے کا مشورہ بھی دے چکے تھے اس میں بھی ان کا ہی نفع تھا کہ یہاں تنگ گلیوں، چھوٹے محلوں میں آنے سے ان کی عزت میں فرق آتا تھا، چچا تو

”جیسے آپ کی مرضی اماں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“  
اس نے تا بعد اری سے سر جھکایا تو اماں مسکرائیں۔  
”اچھا تو پھر میں کہاں بات چلاؤں تمہاری  
خالہ اور تمہارے تایا دونوں ہی اشاروں میں اپنی  
لڑکیوں کا کہہ چکے ہیں دونوں ہی اچھی۔“

”ایک منٹ اماں! میں ان رشتے داروں سے  
مزید کوئی رشتہ نہیں جوڑنا چاہتا جو چڑھتے سورج کے  
پجاری ہیں نفرت ہے مجھے ان مطلب پرست خود  
غرضوں سے اماں میں صرف آپ کی خاطر آپ کی  
خوشی کی خاطر ان لوگوں کا اس گھر میں آنا جانا برداشت  
کرتا ہوں مگر ایک مزید زندگی بھر کا رشتہ ناممکن۔“ ارزم  
نے سنجیدگی سے اماں کی بات کاٹ کر اپنا فیصلہ سنایا تو  
اماں نے پرسوج انداز میں ارزم کو دیکھا۔

”اماں ہم نے انہی رشتوں کے ہوتے ہوئے  
اتنا کڑا وقت کاٹا ہے جب کوئی ہمارے پاس نہیں  
آیا سب دور ہوتے گئے اپنی خوشیوں میں ہمیں شامل  
کرنا بھول گئے تو ہم کیوں اب اپنی خوشیاں ان کے  
ساتھ جوڑیں آتے ہیں تو شوق سے آئیں بیٹھیں  
مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر مزید کوئی رشتہ جوڑنے کی  
کوئی بھی ہم سے امید نہ رکھے۔“ ارزم نم لہجے میں  
بول رہا تھا اماں نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے  
بیٹے کو سینے سے لگالیا۔ اتنے میں دروازے پر دستک  
ہوئی تو وہ آنسو پونچھتے ہوئے سیدھا ہوا دستک کی  
آواز پر آنکھیں چمک اٹھی تھیں اماں نے بغور اس کی  
آنکھوں کو دیکھا۔

”آپ بہو کی بات کر رہی تھیں نا اماں! تو اس کو  
ہی لے آئیں نا جو روز دروازے پر دستک دیتی  
ہے۔“ ارزم نے بھیگا چہرہ صاف کرتے ہوئے  
مسکرا کر کہا تو اماں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ارزم..... تم.....“ اماں کو سمجھ نہ آیا کہ کیا بولیں۔  
”پہلے میں دروازہ کھول آؤں پھر آپ کہیں گی  
کہ بچی کو غیروں کی طرح دروازے پر کھڑا کر رکھا

دے لفظوں میں نیا رشتہ جوڑنے کی بھی بات کر چکے  
تھے کچھ ایسا ہی ارادہ خالہ کا بھی نظر آ رہا تھا اب پڑھا  
لکھا اتنا کم از کم لڑکا ایسے ہی تو نہیں چھوڑ سکتے تھے اماں  
اس سلسلے میں ارزم سے بات کرنا چاہ رہی تھیں وہ  
سیدھی سادی عورت اپنوں سے دوبارہ جڑنے پر سب  
کچھ بھلا کر پھر سے ان کی ہموکی تھیں۔

”ارزم! میں سوچ رہی تھی کہ اب گھر میں بہو  
لے آؤں۔“ ارزم فالتوں میں سروئے بیٹھا تھا جب  
اماں نے اسے مخاطب کیا۔  
”ہوں تو لے آئیں۔“ اس کا دھیان مکمل طور پر  
کام کی طرف تھا۔

”مگر مسئلہ یہ ہے کہ کون سی لاؤں نظر میں تو کافی  
ہیں سب ہی اچھی سمجھی ہیں۔“ اماں غور فکر کر رہی تھیں۔  
”نکل میرے ساتھ بازار چلے گا اچھی طرح  
چیک کر کے جو آپ کو پسند آئے لے لیجے گا۔“ ارزم  
ہنوز فالتوں کی طرف متوجہ ہونے کے ساتھ جواب  
دے رہا تھا۔

”ارزم۔“ اس کا جواب سن کر اماں نے اسے  
زور سے پکارا تو وہ چونکا۔  
”جی اماں۔“ وہ اماں کے اسی طرح پکارنے پر  
گڑبڑا گیا۔

”میں بہو کی بات کر رہی ہوں تم کیا اول قول بول  
رہے ہو لڑکے؟“ اماں نے غصے سے اسے دیکھا۔  
”کس کی بہو؟“ اس نے حیرت سے ان کے  
غصے بھرے چہرے کو دیکھا۔

”یا اللہ ارزم! میں اپنی بہو کی بات کر رہی تھی۔  
تمہاری شادی کی؟“ اماں نے سر پکڑ لیا تو وہ جھل  
ہو گیا۔

”اوہ سوری اماں! میرا دھیان ذرا کام کی طرف  
تھا مجھے پتا نہیں چلا۔“ وہ شرمندہ ہو رہا تھا۔  
”خیر تمہارا شادی کے بارے میں کیا خیال ہے  
بھئی میں تو اس تہائی سے بے زار ہو گئی ہوں۔“

انوشے لہجہ کر تیزی سے بولتی دروازے کی طرف بڑھی۔  
”ارے برف تو لیتی جائیں۔“ وہ پیچھے سے  
پکارتا آگے آیا۔

”نہیں شکریہ..... آج..... گرم پانی سے ہی۔“  
”بڑا ہی چھونڈل ہے آپ کا انوشے جی خود تو  
آپ روز آ جاتی ہیں آج ہم نے کچھ مانگا تو آپ نے  
ارادہ ہی بدل لیا دس از ناٹ فمز۔“ ارزم نے انوشے  
کے راستے میں آتے ہوئے شکوہ کیا تو اس نے چونک  
کر اسے دیکھا وہ مسکرا کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”چلیں جائیں کیا یاد کریں گی آج ہم خود  
برف دینے آئیں گے بلکہ ایسا کریں کہ افطاری کی  
اچھی سی تیاری بھی شروع کر دیں آج ہماری افطاری  
آپ کی طرف ہے۔“ وہ شرارت سے بولتا ہوا مسکرا کر  
سائیڈ پر ہوا تو وہ تیزی سے دروازہ پار کر گئی وہ اس کی  
اس حرکت پر مسکرایا۔

صحن کے اختتام پر کمرے کے دروازے میں  
کھڑی اماں نے مسکرا کر اپنے بیٹے کی خوشیوں کے  
دائگی ہونے کی دعا کی انہیں اپنے بیٹے کی پسند پر فخر ہوا  
جیسا وہ صاف دل اور پیارا تھا ویسی ہی اس کی پسند  
بھی پیاری صاف دل اور سادہ سی مٹی اماں کو انوشے  
شروع دن سے ہی اچھی لگتی تھی مگر وہ ان کے لاڈ لے کو  
بھی اچھی لگتی ہے اس بات کا انہیں اندازہ نہیں تھا وہ  
لوگ بھی ان کی طرح خونی رشتوں کے ڈ سے تھے۔

”اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے میرے نصیب میں  
ایسی سعادت مند اور نیک اولاد لکھی بس میرے بچوں  
کے نصیب بھی اچھے کرنا اور انہیں کسی کی نظر نہ لگے  
آمین۔“ اماں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دعا  
کی۔ وہ اپنے پروردگار کی مشکور تھیں کہ جس نے ہمیشہ  
انہیں نوازہ مشکلات میں مبر سکھایا اور حوصلہ دیا بے شک  
وہ ذات غفور و رحیم ہے جو اپنے بندے کا اس وقت بھی  
ساتھ دیتی ہے جب سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

ہے اتنی گرمی میں۔“ ارزم نے شرارت بھرے لہجے  
میں اماں کا کہا جملہ دہرایا تو اماں مسکرائیں اور پیار  
سے بیٹے کو دیکھا۔

”اندر لے کے آؤں گا ڈائننا ضرور ہے کہ برف  
لیتے لیتے آپ کے اکھوتے بیٹے کا دل بھی لے گئی۔“  
ارزم نے جاتے جاتے اماں کو تہنید کی تو وہ ہنسنے  
لگیں۔ دروازے پر اسے کھڑا دیکھ کر ارزم کے لب  
خوشی سے مسکرائے۔

”سوری کہ آپ کو گرمی میں ویٹ کرنا پڑا بیٹ  
آئی پر اس آئندہ آپ کو انتظار نہیں کراؤں گا۔“  
ارزم نے اس کے صبح چہرے کو نظروں کے حصار میں  
لیتے ہوئے ذومنی انداز میں کہا تو اس نے حیرت سے  
اسے دیکھا وہ کافی خوش لگ رہا تھا وہ عموماً اس ناظم  
وہ غصے میں ہی دروازہ کھولتا تھا۔

”جی وہ۔“ اس نے بولنا چاہا۔  
”برف ہے آپ آئیں نا۔“ ارزم نے سائیڈ پر  
ہوتے ہوئے اسے اندر آنے کی دعوت دی تو وہ  
خاموشی سے اندر آ گئی۔

”انوشے۔“ صحن سے گزرتے ہوئے ارزم نے  
اسے پکارا تو وہ چونک کر کھڑی۔

”آپ روز ہم سے برف لیتی ہیں آج اگر میں  
آپ سے کچھ مانگوں تو؟“ ارزم نے اس کی آنکھوں  
میں جھانکتے ہوئے تمہیر لہجے میں سوال کیا۔

”جی۔“ اس نے ارزم اور اس انداز پر نا سمجھنے  
والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”آپ ہمیشہ کے لئے اس گھر میں آ جائیں نا  
تاکہ میرے بجائے آپ کو روز دروازے تک آنا  
پڑے میرے لئے دروازہ کھولتے۔“ وہ اسی انداز میں  
گہر رہا تھا انوشے نے شپٹا کر نظریں چرائیں۔

”برف دیتے دیتے نبائے کب میرا دل آپ کے  
پاس چلا گیا مجھے پتہ ہی نہیں چلا اس واردات کا۔“

”آ..... وہ..... میں جلتی ہوں۔“ ارزم بول رہا تھا

# اکبرچہ

پنکھا آہستہ آہستہ چلا ہوا دے رہا تھا۔ دن کی نسبت رات میں موسم کافی ٹھیک ہو گیا تھا۔ ورنہ دن کی گرمی تو پسینے میں ہی نہلا دینے کے لیے کافی تھی۔ نجم، سعد اور کنیز نور تینوں بچے اپنے پاپا کا انتظار کرتے کرتے سو چکے تھے۔ آج سٹائیسویں روزے کی شب تھی۔ اعزازہ تھا کہ تین دن بعد عید ہو جائے گی۔



اسے پہلی بار اتنا غصہ آیا تھا اور وہ بھی شیم عثمانی پر۔  
 بچے کے پردے ہی گھوم رہے تھے۔ اس نے  
 اپنی نظروں کا مرکز بدلا۔ اس کی نگاہیں جا کر سوئی ہوئی  
 معصوم سی کنیز نور پر جا ٹھہریں۔ نور ہو اپنے والد شاہ  
 زین کی کاپی تھی۔

”کتنا خوش تھے ہم چاروں اپنے گھر میں۔ شاہ  
 زین، کنیز نور میں اور میری امی۔“ اس نے دل میں  
 سوچا آنکھوں کے کنارے ٹپلے ہو گئے۔

”نا اس رات شاہ زین امی کے ساتھ بایک پر  
 جاتے اور تا یہ سب کچھ ہوتا۔“ اس کے دل نے دہائی

لیہا تینوں بچوں سمیت پلنگ پر لیٹی ہوئی چھت پر  
 لگے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ بچے کے گھومتے پردوں کے  
 ساتھ اس کی آنکھیں بھی ویسے ہی گھوم رہی تھیں۔  
 اسے بے حد غصہ آ رہا تھا شیم عثمانی پر۔ اسے لگتا تھا  
 سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی  
 مگر فی الحال اس کے پاس سوچنے کے علاوہ کرنے کو  
 کوئی اور کام نہ تھا اور اگر کوئی کام ہوتا بھی تو وہ ابھی  
 اس کنڈیشن میں بالکل بھی نہیں تھی کہ کچھ کام کرتی۔  
 ابھی وہ غصے سے بھر پور تھی اس کی آنکھیں غصے کے  
 مارے سرخ ہو رہی تھیں۔ اتنا غصہ عام بات نہیں تھی۔



دی اور آنسو چٹک پڑے۔

آج نیا چاند طلوع ہوا تھا مگر ایبہا کے چہرے کے  
گہرے تیور جوں کے توں تھے۔ وہ بیماری بیماری قدم  
اٹھاتا گھر سے نکل گیا۔

شیم عثمانی کے جانے کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر  
رونے لگی جولاد اکل شب سے اس کے دل میں پک رہا  
تھا۔ آج کسی آتش فشاں کی طرح اس کی آنکھوں سے  
جاری ہو گیا۔ دو سالہ۔ ہمدانی ماں کو یوں روتے دیکھ کر  
خود بھی ناہنجی میں رونا شروع ہو گیا۔

وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ صبر اور برداشت کے  
الفاظ اس نے اپنی زندگی کی کتاب سے نکال باہر کئے  
تھے۔ اتنی محرومیاں سنبھالنے کے بعد اسے ان لفظوں سے ہی  
نفرت ہو گئی تھی تو بھلا کیسے یہ ساری صفات اس کی  
شخصیت میں موجود ہوتیں۔ اس نے شیم عثمانی سے  
نکاح کے بعد اپنی زندگی کا یہ اصول بنایا تھا کہ جو میرا  
ہے وہ میرا ہے اور جو نہیں ملتا اسے چھین لو۔

☆.....☆

شاہ زین اس کا پہلا شوہر تھا۔ اسی گھر میں کچھ سال  
پہلے تک وہ اس کا شوہر شاہ زین، اس کی بیٹی کنیز نور اور  
اس کی امی رہا کرتے تھے۔ زندگی پرسکون گزر رہی  
تھی۔ شاہ زین سے اس کی شادی کو تین ہی سال ہوئے  
تھے۔ ان تین سالوں میں اس نے شاہ زین کے ساتھ  
بہت اچھا وقت گزارا۔ شاہ زین ہر ماہ تنخواہ لاکر اس کی  
بہتیلی پر رکھ دیتا تھا۔ شہزادیوں کی طرح رکھا تھا اس نے  
ایبہا کو اور وہ خوشی سے نہال ہوئی جاتی۔

اس رات موسم اس کے ساتھ برای کر رہا تھا۔ صبح  
سے ہی اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ غلطی ہو رہا تھا۔

بھی کھانا پکاتے ہوئے مصالحو زیادہ پکانے سے  
جل گیا۔ صبح دودھ اہل پڑا۔ آفس جانے کے لیے شاہ  
زین کی فیورٹ شرٹ استری کرتے ہوئے اس کے  
ہاتھ سے جل گئی۔ دوپہر میں اس نے خبی کنیز نور کو  
نہلانے کے لیے پانی گرم کیا تو برتن ہالٹی میں انڈیلنے  
ہوئے آدھا گرم پانی اس کے پیروں پر آگرا۔ وہ

ٹن.....ٹن.....ٹن گھڑی نے تین بجائے رات  
کے تین۔ ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔  
اسے پتا تھا وہی لوٹ کر آیا ہے۔ وہ کمرے کا دروازہ  
کھول کر راہداری عبور کرتی صحن میں آگئی تھی۔ مین  
میت کھول کر واپس راہداری کی طرف مڑی۔

”آپ نے اتنی دیر کیوں کر دی آنے میں؟ آپ  
نے کہا تھا س دیکھ کر واپس آ جاؤں گا۔ آپ کو پتا تھا نور  
نے آج پہلا روزہ رکھا تھا اور اسے آنسکریم کھلانے کا  
 وعدہ کرنے کے باوجود آپ انٹالٹ آئے ہیں کہ تینوں  
بچے سو گئے۔“ وہ تینوں بچوں پر آواز کو اونچا کر کے  
بولی۔ اس کا غصہ آج عروج پر تھا۔ اس سے پہلے اس  
نے سبھی اتنا غصہ نہیں کیا تھا۔ شیم عثمانی پر۔ آج اسے اپنا  
شوہر بٹا ہوا نظر آیا تھا۔

”فصہ کا اپنڈکس کا آپریشن تھا۔ باپ ہوئے  
کے ناتے میرا دیاں رہتا ضروری تھا۔“ اسے اپنی آواز  
کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی مگر وہ کمرے اسی کے  
سامنے تھا۔ ایک مجرم کی طرح جس کی کوئی معافی بھی نہ  
ہو اور نہ ہی نہ ہو۔ جو بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصور  
دار تھا۔ نمرہ بٹ اور ایبہا سلوٹی کی نظروں میں مجرم۔

وہ دونوں گھروں میں توازن برقرار نہیں رکھ پارہا  
تھا۔ اس ندامت اور شرمندگی سے اس کا دل ڈوبا جا رہا  
تھا۔ ایبہا سلوٹی کے سامنے بھی اس کی احساس ندامت  
سے وہی حالت تھی اور کچھ دیر پہلے نمرہ کے سامنے بھی  
اس کی ویسی ہی حالت تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ نمرہ  
اسے کچھ نہ کہتی اور ایبہا اسے کچھ کہنے ہی نا دیتی تھی۔

اگلے کافی لمحوں تک ایبہا اسے لعن طعن کرتی رہی  
مگر وہ کچھ سن ہی نا سکا۔

اگلی صبح جب وہ بغیر سحری کے اپنے کام پر جانے لگا  
تو اس وقت تک نور، نجم اسکول جا چکے تھے اور دو سالہ  
سعد ایبہا کی گود میں بیٹھا کھیل رہا تھا۔ کل کا چاند واصل  
چکا تھا۔

انتقال کر گئیں۔ شاہ زین صحیح سلامت تھا۔ وہ گرا تھا بایک دور جاگری تھی۔ وہ اٹھا اور دوڑ کر پی کے پاس گیا تھا ای بے حس و حرکت سڑک پر پڑی تھیں۔ بے تحاشہ خون بہہ رہا تھا۔ شاہ زین جیسا حساس دل برداشتہ نہ کر سکا اور وہ پکرا کر اسی لمحے سڑک پر گر پڑا۔ اسی وقت جب کہ ایسا سلوٹی اور کینز نور پر سکون نیند کے مزے لے رہی تھیں۔ کینز نور یتیم ایسا سلوٹی بیوہ ہو چکی تھی۔

شوہر کے مرنے کے بعد کینز نور کی بیوہ ماں کو شوہر کی حیثیت سے سہارا دینے والا شیم عثمانی پہلے سے شادی شدہ اور پانچ بیٹیوں کا باپ تھا۔ اسٹیٹ انجینی میں بروکر کا کام کرتا تھا۔

ایسا سے اس کی ملاقات اس طرح سے ہوئی کہ وہ اپنے شوہر اور ماں کی وفات کے بعد اپنی دو سالہ بیٹی کے ہمراہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اور اپنے شوہر کا یہ گھر جس میں وہ چاروں خوش و خرم زندگی بسر کرتے تھے۔ اب ان کے انتقال کے بعد اسے کاٹ کھانے کو دوڑنا تھا اور ویسے بھی اکیلے اس کا رہنا مناسب نہ تھا۔ اس لیے اس نے اس گھر کو بیچ کر کسی فلاحی ادارے میں سکونت اختیار کرنے کا سوچ لیا تھا اور اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے اپنے گھر کی قریبی اسٹیٹ انجینی کا رخ کیا تاکہ گھر بیک جائے۔

پھر ایسا ہوا کہ شیم عثمانی کو انجینی کے مالک نے گھر دیکھنے کے لیے بھیجا تو اس کے کانوں میں ایسا کی مجبوری کی جھجک پڑی اور اس نے نیکی کی نیت سے اسے اور اس کی بیٹی کو سہارا دینے کی شان لی کیونکہ اس کی بھی پانچ بیٹیاں تھیں اور تور بن باپ کی بیٹی تھی اس کی پرورش کرنے کا ارادہ کر لیا۔

وقت گزر چکا تھا اور اب کینز نور کے ساتھ ساتھ نجم اور سعد بھی ایسا اور شیم عثمانی کی آنکھ کے تارے بن گئے تھے۔ ایسا کی عاجزانہ طبیعت اب آہستہ آہستہ ناشکری کی حدود چھوئے لگی تھی۔

بپا کے رہ گئی۔ کچھ ذریعہ کھیلتے کھیلتے کینز نور نے ایسا کا موبائل فون پانی میں گرادیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ موبائل فون ناکارہ ہو گیا۔

”میں کب سے فون کر رہا تھا تم فون کیوں ریو نہیں کر رہی تھیں؟“ شام میں جب شاہ زین آفس سے لوٹا تو ایسا کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے پوچھا۔

”وہ دراصل کینز نور نے موبائل فون پانی میں گر دیا تھا اس لیے وہ خراب ہو گیا ہے۔“ اس نے وضاحت پیش کی تھی۔ چائے کا کپ لیتے ہوئے شاہ زین کی نظریں اس کے سوجے ہوئے پیروں پر پڑی۔

”تمہارے پیروں پر سوجن کیوں آرہی ہے۔“

اس کا لہجہ بے حد تشویش ناک تھا۔

”مگر پانی گر گیا تھا۔“ اس نے دوسری بار وضاحت پیش کی۔

”پلوڈاکٹر کے پاس۔“ وہ بے حد حساس تھا۔

دوسروں کی تکلیف پر خود تڑپ جاتا تھا۔

”نہیں پہلے آپ ای کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ صبح سے بخار میں تپ رہی ہیں۔ میں نے پیروں پر برمال لگا لیا تھا۔ کل چلوں کی ڈاکٹر کے پاس ابھی میری ہمت نہیں ہو رہی۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔ آج وہ بے حد تھک گئی تھی۔ اب آرام کرنا چاہتی تھی۔ امی اور شاہ زین کے جانے کے بعد وہ ایسا سوئی کہ گھٹ کے دھڑ دھڑپنے سے ابھی۔

☆.....☆

گیٹ کھولا تو باہر دو ایوبولنس تھیں۔ وہ کچھ نہ سمجھ پائی مگر اتنی تا سمجھ تو وہ بالکل نہیں تھی۔

دو لاشیں اس کے گھر کے صحن میں رکھی گئیں۔

ایک اس کا شوہر شاہ زین اور دوسری اس کی امی۔

جائے وقوعہ پر موجود لوگوں نے بتایا کہ پارل کے باعث سڑک چٹنی ہو گئی تھی اور بایک سبب ہو گئی۔ اس کی امی مگر سر پر چوٹ لگنے کے باعث اسی وقت



☆.....☆

”نور.....نور..... دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔“ شام کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے شمیم عثمانی کے دونوں ہاتھ فروٹ اور کیک، نمکو سے بھرے ہوئے شاپرز تھامے ہوئے تھے۔

باپ کی آواز پر نور دوڑی ہوئی آئی اور جلدی جلدی شاپرز ان کے ہاتھ سے لے لیے۔ کل ستائیسواں روزہ تھا اور اس نے پہلا روزہ رکھا تھا۔ خفصہ کے اپنڈکس کے آپریشن کی وجہ سے شمیم عثمانی افطاری کے وقت بھی ہسپتال میں تھا اس لیے کنیز نور کے لیے وہ آج اہتمام کر رہا تھا۔

اتنے میں لیبیا بھی کچن کے کاموں سے فارغ ہو گئی اور دسترخوان بچھا دیا۔ مغرب کی اذان ہوئی تو دعا پڑھ کر روزہ افطار کیا۔ روز کی طرح آج بھی لیبیا اور شمیم نے ہی روزہ رکھا تھا۔ کل ستائیسواں روزہ تھا تو ضد کر کے کنیز نور نے کل پہلا روزہ رکھا تھا مگر کل کی نسبت آج پورا دسترخوان پکڑوں، نمکو، کیک، فروٹ اور کسٹرز سے سجا ہوا تھا۔

”کھانا اب باہر چل کر کھائیں گے۔ تم بچوں کو تیار کر دو آج شاپنگ کروادوں عید کی۔“ وہ لیبیا کو آگاہ کر کے مغرب کی نماز پڑھنے چلے گئے۔ واپس آئے تو چاروں ان کے انتظار میں کھڑے گھر کے برآمدے میں ہی مل گئے۔

”ارے واہ آپ سب تو بالکل تیار ہیں۔“ شمیم نے بچوں کو پیار سے کہا۔

”جی ہاں اور ابو مجھے روزہ کشائی کا گفت جھی چاہیے ہوگا۔“ نور نے چپکتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں دلا دوں گا پاپا کی پیاری مڑیا رانی۔“ شمیم عثمانی نے پیار سے جواب دیا اور سب گھر سے بازار کے لیے نکل پڑے۔

پچھلے چار سالوں کی طرح اس بار بھی یہ لوگ اٹھائیسویں روزے کی افطاری کے بعد شاپنگ

کر رہے تھے۔ تینوں بچے اور خود لیبیا کے لیے ریڈی میٹ کپڑے خریدے جا رہے تھے۔ سینڈل پرس سے لے کر بال پن تک جس چیز پر نور نے ہاتھ رکھا لیبیا نے اگلے ہی بل پر وہ چیز اس کی ملکیت کر دی۔ لیبیا نے اپنے لیے اور اپنے دونوں بیٹیوں کے لیے بھی شاندار خریداری کی تھی۔

چاروں جب شاپنگ سے فارغ ہو گئے تو لیبیا کو شمیم عثمانی کا خیال آیا اور وہ اسے اس کے لیے کپڑے پسند کرواتے ہوئے اس کی مرضی پوچھنے لگی مگر وہ تو اس شاپنگ میں شامل ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہ تھا۔ اس کا دھیان بار بار شمیم خفصہ پر جا رہا تھا جو گزشتہ شب درد سے تڑپ رہی تھی۔

ان پانچ بیٹیوں میں اور کنیز نور میں کتنا زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ انتہائی صبر و شکر کرنے والی بیٹیاں جو بہو ہو پانی ماں پر گئی تھیں۔

انہوں نے تو ابھی تک اپنے لیے عید کا ایک جوڑا تک نہیں بنوایا تھا اور شاید پیٹ بھر کر ایک روزہ بھی افطار نہیں کیا تھا، تو وہ کیسے یہ عید منا سکتا تھا۔ اپنے لیے کچھ خرید سکتا تھا۔

وہ تو ماتم کرنا چاہتا تھا۔ اس دن کو کونسا چاہتا تھا جس گھڑی اس نے لیبیا سلوی کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے سہارا دینے کا فیصلہ کیا تھا جس نے اس کی معصوم بچیوں اور صابروشا کر شریک حیات کو اس سے دور کر دیا تھا۔ ان بچیوں سے اس کے باپ کی شفقت چھین لی تھی۔

”کتنی کم ظرف عورت ہے یہ۔ ایک بیٹی کی ماں ہوتے ہوئے بھی دوسری بیٹیوں کا دکھ نہیں سمجھ سکتی۔ یا اللہ! مجھے معاف کر دینا۔ میں کتنا مجبور ہے بس ہوں کہ میں اپنا فرض ادا نہیں کر سکتا۔“ اس نے گہری سوجا۔

☆.....☆

”ماما! مجھے کالج کے لاسٹ ایئر کے فنکشن کے

میں ترقی ہونے کے بعد شیم نے اپنا تمام اگلا پچھلا اثاثہ لگا کر اس دو سو گز کے دو کمروں اور ایک بڑے سے برآمدے والے مکان کو بنگلے نما گھر کی شکل دے دی تھی۔

وہ وہیں رہتے تھے۔ ان کے لیے ہی کماتے تھے اور ان پر ہی خرچ کرتے تھے۔ ان لوگوں نے تو اس شخص سے ناما توڑ لیا تھا۔ چھ ماں بیٹیوں نے ایسے بے حس انسان کے بغیر عزت سے زندگی کی گاڑی چاٹنا سیکھ لیا تھا جو آدمی برے وقتوں میں ان کا ساتھ چھوڑ گیا تھا انہیں بھلا اب گھر میں سلائی کر کے اور اکیڑی میں بیٹون پڑھا کر خود بھی تعلیم یافتہ ہو جانے کے بعد ایسے شخص کی کیا ضرورت تھی۔ نمرہ کی نظروں میں شیم عثمانی اب محض ایک بے حس انسان رہ گیا تھا جسے اس کی بیٹیوں کو خیر مگر اس کی بیٹیوں کی بھی کوئی پرواہ اب نہیں رہی تھی۔

”کیا ضرورت ہے اسے اتنے سارے پیسوں کی۔“ کنیز نور کے بعد نجم اور سعد بھی کھانے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو شیم نے لیسا سے پوچھا۔

”ارے کالج میں فنکشن ہے، اس کی تیاری کے لیے مانگ رہی تھی۔ سنائیں کیا آپ نے۔“ اس نے نیبل سے برتن اٹھاتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”لاسٹ ایئر ہے ناں اب کالج کا، اب امتحان کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ کروانا ہے۔“ وہ مزید بولی۔

”یونیورسٹی میں داخلہ ہو جائے گا تم فکر مت کرو مگر ابھی کے فنکشن میں دینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں۔ اگلے مہینے رمضان آ رہا ہے اس کے لیے بھی تو سوچو۔“ شیم نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

وہ ڈانٹنگ نیبل سے سارے برتن اٹھا چکی تھی اب میز پوش اٹھانے آئی تھی۔ یہ جواب سن کر وہیں

لیے دس ہزار روپے چاہئیں۔“ انیس سالہ کنیز نور کے اخراجات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کافی وسیع ہو گئے تھے اور وہ بلا جھجک ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی بڑی فرمائش کر دیتی تھی۔ جیسے لیسا روز ازل کی طرح آج بھی لمبے گھر میں پورا کر دیتی تھی۔

آج کھانے کے دوران جب کنیز نور نے یہ انوکھی فرمائش کی تو شیم عثمانی کا اپنی پلیٹ کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ وہیں رک گیا اور وہ کن انکھوں سے لیسا کی طرف دیکھنے لگے۔

”ہاں بیٹا! کل چاہیے ناں، دے دوں گی۔“ لیسا نے محبت بھرے انداز میں نور سے کہا۔

”دس ہزار روپے وہ بھی کالج کے فنکشن کے لیے۔“ شیم عثمانی سوچتے رہ گئے۔

”میری اچھی ماما! وہ کہہ کر پلیٹ آگے سرکا کر کھانا ادھورا چھوڑی اٹھ کھڑی ہوئی اور خوشی کے مارے اپنی ماما سے لپٹ گئی اور اپنا موبائل فون اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

”ارے کھانا تو پورا کھا لو۔“ لیسا نے جانی ہوئی کنیز نور کو جلدی سے آواز لگائی جسے وہ اُن سا کر گئی۔

”نبودودھ کا گلاس پی کر سونا۔“ انہوں نے دوبارہ آواز لگائی۔

”او کے ماما۔“ اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر وہاں سے تقریباً چلا تے ہوئے کہا تھا۔

شیم عثمانی کڑھتے رہ گئے منہ پر تو فی الحال انہوں نے مصلحتاً قفل لگا لیا تھا مگر کانوں اور آنکھوں کا کیا کرتے۔ وہ سب دیکھ اور سن رہے تھے مگر فی الحال قفل کو توڑنا نہیں خاموش ہی رہے اور اسی خاموشی میں باقی چار نفوس ڈانٹنگ نیبل کے گرد بیٹھے رات کا کھانا کھاتے رہے۔

”دس ہزار روپے چاہئیں۔“ شیم عثمانی نے تفتی کے ساتھ حلق سے آخری نوالہ اتارا۔

یہ گھر اب بارہ سال پہلے والا گھر نہیں رہا تھا۔ کام

کر رہی تھی۔  
 ”ہاں ہاں..... آپ تو ایسے ہی کہیں گے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔  
 ”مجھے باپ تھوڑی ہیں آپ نور کے، اس شیم کا سگا باپ ہوتا تو ایسے اپنے پیسوں سے نہیں بلکہ اپنی اولاد سے پیار کرتا۔ میں لاکھ روپے کیش رکھے ہوئے ہیں میرے اس کے پاس۔ مگر مجال ہے جو بغیر پوچھے ایک روپیہ بھی اٹھایا ہو۔ آج پیسے چاہیے تو مانگ لیے ناں اس نے مگر اپنی مرضی سے نہیں اٹھائے۔“ اس کا رونا اب شدید ہو گیا۔

شیم کو پتا تھا یہی ہونے والا ہے اس لیے انہوں نے نور، سعد اور نجم کی غیر موجودگی میں ہی اس ٹاپک پر بات کی۔  
 اس کا رونا اب اور تیز ہو گیا۔ وہ اس کے روز روز کے ڈرامے سے اکتا چکے تھے اس لیے وہاں سے اٹھ کھڑے ہو گئے۔

☆.....☆

دوسری صبح لیہا نے نور کو دس کے بجائے پندرہ ہزار روپے دیئے وہ بھی شیم عثمانی کو جلانے کے لیے ان کے سامنے۔  
 نور خوشی خوشی کالج چلی گئی اور شیم اندر ہی اندر جلتے رہ گئی۔ دن کیسے گزر گئے پتا ہی نہ چلا۔ پھر سے رمضان کا اٹھائیسواں روزہ آگیا اور یہ سب عید کی شاپنگ کے لیے نکل پڑے مگر اب تبدیلی یہ آچکی تھی کہ پہلے بانچوں ایک ساتھ جاتے تھے مگر اب کینز ٹور اپنی کالج کی دوستوں کے ساتھ نجم، سعد اپنی ماما کے ساتھ جاتے تھے۔ جب کہ شیم عثمانی گھر ہی رہتے تھے۔ اس دن کے بعد سے انہوں نے کوئی عید نہیں منائی تھی۔ وہ دن حصہ کے آپریشن کا دن تھا۔  
 تقریباً بارہ بجے تک سب شاپنگ کر کے واپس آ گئے تھے مگر نور کا کوئی اتاپتہ نہ تھا۔ فون کیا تو اس کا موبائل سوچ آف تھا۔ لیہا اور شیم پریشان ہو

رہے تھے کہ اب تک کیوں واپس نہ آئی۔ پہلے کبھی تو اتنی دیر نہیں لگائی تھی۔ لیہا دونوں ہاتھوں سے سر تھامے صوفے پر بیٹھی تھی اور شیم فکر کے مارے ٹہل رہے تھے۔ نجم اور سعد بھی پریشان سے دکھائی دے رہے تھے۔  
 پورے ایک گھنٹے بعد نور گھر کے مین گیٹ پر نمودار ہوئی۔ دریافت کرنے پر پتا چلا کہ میچنگ سینڈل نہیں مل رہی تھیں اور دو پنڈ ڈائی کرنے کے لیے دیا ہے۔ چاند رات کو ملے گا اور آدھی شاپنگ ابھی باقی ہے۔ چاند رات کو مکمل ہوگی اور آج کی شاپنگ کا سامان اس کی کوئی دوست لے کر گئی ہے کہ سامان بہت وزنی تھا اور اکیلے لے کر آنے میں اس کے نازک ہاتھوں میں ہمت نہ تھی۔

اس نے سب مطمئن انداز میں بتایا پھر آج کی اس صورت حال پر سب نارمل ہو گئے تھے۔ سوائے شیم عثمانی کے۔ مگر وہ کچھ بول ہی نہیں پارہے تھے۔ ورنہ ان کو پھر سے سوتیلے باپ کا طعنہ مل جاتا اس لیے وہ آج پھر خاموش تھے۔

مگر یہ خاموشی کب تک، اس سناٹے کے بعد ایک بہت بڑا طوفان لیہا سلوٹی کا منتظر تھا۔  
 اگلے دن چاند رات تھی۔ نور پھر سے دوستوں کے ساتھ شاپنگ کا تیار گھر سے نکل پڑی۔  
 رات کا ایک بج گیا وہ نہ آئی۔ گھڑی نے دو بج دیئے وہ پھر بھی نہ آئی۔ ایسا کرتے کرتے ڈھائی بج گئے۔

لیہا کی بے چینی بڑھتی گئی وہ بار بار دروازے تک جاتی اور مایوس لوٹ آتی۔ اس کا موبائل فون گزشتہ شب کی طرح آج بھی سوچ آف تھا۔ اس لیے اس سے رابطہ نہیں ہو پارہا تھا۔ نجم اور شیم اس کے دوستوں کے گھر گئے اس کا پتا کرنے مگر اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔ سب دوست اس کے لاپتہ ہونے سے لاعلم تھے۔

بدل جاتی مگر اس کے دل پر لگا گھاؤ تو اس سے بھی  
سیاہ تھا جو اس کی اپنی اولاد اسے دے کر گئی تھی۔

شہر خاموشاں کے سنانے سے بھی گہرا سناٹا اسے  
اب کبھی کبھی ستانے لگا تھا۔ ڈرانے لگا تھا۔ ڈسنے لگا  
تھا۔ کسی ناگن کی طرح۔

روح بکھر کر کرچیاں کرچیاں ہو گئی تھی اسے اپنے  
زندہ رہنے تک اب ان کرچیوں کو سمیٹ کر رکھنا تھا  
مگر ایک بار اعتماد ٹوٹ جائے اور اتنی بری طرح سے  
ٹوٹ جائے تو پھر روح کی بکھری کرچیاں سیٹی نہیں  
جاسکتیں بس بو جھل وجود ہی زندہ نظر آتا ہے۔  
اس کے جانے کے بعد کتنی عیدیں گزر گئیں اب  
کیسی عید اور کس کی عید؟ وہ سوچتی۔

”یہ میرے ہی کیے کی سزا ہے، ان پانچ معصوموں  
کے دل سے نکلی آہ ہے۔ نمرہ بٹ کے دل سے نکلی  
بد دعا ہے جس طرح میں نے اس کی بیٹیوں کو ان کے  
باپ سے دور کیا اسی طرح میری بھی بیٹی مجھ سے دور  
ہو گئی ہے۔“

”اے کاش میں ایسا نہ کرتی۔ کاش وہ دن پھر  
سے لوٹ آئیں وہی رمضان کی ستائیسویں شب پھر  
سے لوٹ آئے۔ میں نمرہ بٹ کے قدموں میں گر کر  
معافی مانگ لوں۔“

”یا اللہ! ایسی کوتاہیاں کوئی نہ کرے جو مجھ سے  
ہوئی ہیں۔ نور چلی گئی اس سے اچھا ہوتا وہ مر جاتی۔ کم  
از کم اس کی قبر دیکھ کر دل کو سلی ہو جاتی۔“

اب آنسو ہی ایسا سلوی کا مقدر تھے۔  
اس نے شاہ زین کو کھو کر شیم عثمانی کو پایا تھا مگر اس  
پر وہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے ضدی، خودسار اور  
ناشکری ہو گئی تھی اور نمرہ بٹ اور اس کی پانچ بیٹیوں کا  
حق بھی چھینا تھا۔

جس کی سزا قدرت کی طرف سے اسے ملنی  
ہی تھی۔

☆.....☆

ایسا تو جیسے پاگل ہو گئی ہو۔ وہ دونوں کی طرح  
یا ارادہ تیسری بار اس کے کمرے میں گئی اچانک اس  
کی نظر اس کے بید کے سائیڈ ٹیبل پر لیب کے نیچے  
رہنے ہوئے ایک سفید کاغذ پر پڑی۔ جس کے مارے  
اس نے لپک کر اگلے ہی لمحے اس کاغذ کو اپنے ہاتھوں  
کی لرفت میں قید کر لیا تھا۔

وہ سوے اور ایک انجانے خوف نے اس کے وجود  
پا پچی طاری کر دی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے  
اس تہہ کیے ہوئے کاغذ کو کھولا جس پر اس کی لاڈلی  
نے انفظوں کا ایسا طمانچہ مارا تھا کہ وہ جہاں کھڑی تھی  
وہیں جامد ہو گئی۔

کنیز نور..... اس کی جان سے پیاری بیٹی کنیز نور۔  
جس پر اس نے کبھی غصہ نہیں کیا تھا۔ ڈانٹا تو دور  
کی بات۔ نہ کبھی روک ٹوک کی، مکمل بھروسہ کیا۔  
اسے خیم اور سعد پر فوقیت دی۔ اس کے لیے خیم عثمانی  
کو سوتیلے باپ کے طعنے دیئے۔ اپنی ہر خوشی جس کے  
لیے قربان کر دی۔

یاں وہی کنیز نور، اس کا سارا زور، پیسہ لے کر چلی  
گئی تھی۔ اپنا من پسند جیون سا بھی تلاش کر کے، ہمیشہ  
ہمیشہ کے لیے دور بہت دور چلی گئی تھی۔

”ابھی عمر کیا تھی اس کی جو اس نے ایسا قدم  
اٹھایا۔ کس چیز کی کمی تھی اسے یہاں اگر وہ مجھے اپنی  
پسند سے آگاہ کر دیتی تو کیا میں اس کی خواہش کا  
احترام نہ کرتی۔ خود باعزت طریقے سے اس کی  
شادی وہاں کر دیتی۔ اس نے اپنی من مانی کیوں کی؟  
کیا میں نے اس کی ہر ضد پوری کر کے اس کو اتنا  
خود سربند یا تھا کہ اس نے ایسا قدم اٹھایا۔“

وہ سوچے جارہی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا  
سیلاب بہے جا رہا تھا۔ سچے آنسو جو آج بالکل رکنے  
والے نہیں تھے۔

☆.....☆

ہر روز شام کی روشنی مدھم ہو کرات کی تاریکی میں

آسیہ مظہر چوہدری

# دل کے کھیل کلاب



جانب برابر لگی ہوئی تھی۔  
 ”میں اپنی اوقات سے کہیں بڑھ کر خواب دیکھ رہا ہوں شانزے۔“ وہ اداس سا بولا تو اس کی گرے آنکھوں کی چمک ماند پڑی گئی۔  
 ”کیا مطلب روحان؟“

”میں تمہارے ایشیٹس کا نہیں ہوں شانزے۔“  
 وہ بولا تو شانزے سہمی تھی۔  
 ”روحان اب بھلا محبت کب سے ایشیٹس دیکھنے لگی۔“

”محبت نہ دیکھے پر دنیا تو دیکھتی ہے ناں۔“  
 ”مجھے دنیا کی پرواہ نہیں۔“ وہ یکدم سخت سے لہجے میں بولی۔  
 ”پر مجھے ہے شانزے مجھے اس معاشرے میں رہنا ہے۔“  
 ”تو یعنی تمہیں مجھ سے زیادہ اس معاشرے کی پرواہ ہے۔“

”میں تم سے محبت کرتا ہوں شانزے! بے پناہ محبت مگر میں دنیا سے معاشرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ میں محبت کو داغ دار نہیں کر سکتا۔ شانزے میرے بوڑھے ماں باپ اس عمر میں اس بدنامی کے قائل نہیں ہو سکتے گے۔“ وہ بولتا جا رہا تھا اور شانزے پتھر ہوئی جا رہی تھی۔

”بس روحان بس۔ اب ایک لفظ اور کوئی دلیل نہیں۔“ وہ یکدم غصے سے چلائی تھی۔  
 ”میں نے اپنی زندگی میں تمہارے جیسے بزدل شخص سے محبت کر کے بہت بڑی غلطی کی تم محبت کے لائق ہی نہیں تھے۔ آج سے میرا اور تمہارا سب کچھ ختم۔“ یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ بھاگتی ہوئی اس سے دور سے دور تر رہتی چلی گئی تھی۔ محبت کا اختتام یہیں ہوا جاتا تھا۔

☆.....☆

شام ہجران کا منظر قید کیا

”مجھے سخت نفرت ہے۔ اس محبت نام کے لفظ سے۔“ فاریہ کی کسی بات پر وہ غصے سے تھن جھلا کر بولی۔  
 ”تمہیں ہوئی جو نہیں اگر ہوتی تو ایسے نہ کہتیں۔“  
 فاریہ اس کی بات پر مذاقاً بولی تھی، یہ جانے بغیر کہ وہ سیریس تھی۔

”اچھا تم اتنے دثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی؟“ وہ سختی سے بولی تو فاریہ اس کے لہجے پر ہنسی۔

”میں پچھلے پانچ سالوں سے جانتی ہوں تمہیں اگر ایسا کچھ ہوتا تو مجھے پتا ہوتا۔“

”کچھ باتیں اور راز ایسے بھی ہوتے ہیں جو قریب رہنے والا شخص بھی نہیں جان سکتا۔ مجھے بھی سو کا لڈ محبت ہوئی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ طنز آنکسی تھی۔  
 جب کہ فاریہ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ گیا تھا۔

”میں شانزے کمال بھی محبت کی داسی ہوئی تھی مگر محبت نے مجھے روگ دیا۔ بہت بڑا روگ ایسا روگ جو میرے پورے وجود کو لبو لبان کر گیا مجھے اس محبت نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔“ کاچ جیسی آنکھوں سے چند موتی ٹپکے تھے۔ فاریہ اب بھی حیرت کدے سے باہر نہ نکلی تھی۔

☆.....☆

شانزے کمال، کمال انڈسٹری کے اوزر کمال خانزادہ کی بیٹی تھی۔ حسن و جمال میں، تعلیمی میدان میں شانزے کمال پرفیکٹ تھی۔ پوری یونیورسٹی میں اس جیسا حسن کسی کے پاس نہ تھا۔ لڑکے تو لڑکے، لڑکیاں بھی اس سے بات کرنے کے لیے مرنے لگی تھیں اور پھر ایک دن اس کی مگر روحان ملک سے ہوئی تھی۔ اونچا لہسا روحان پہلی نظر میں ہی شانزے کمال کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ وہ اسی دن اسے دل دے بیٹھی تھی۔ کسی کو لفٹ نہ کرانے والی، روحان ملک پر اپنا سب کچھ لٹا بیٹھی تھی۔ روحان ملک بھی اسے پسند کرنے لگا تھا۔ محبت کی طرف نہ تھی۔ آگ دونوں

میری آنکھوں میں  
اب خوش رنگوں کا کیوں  
پوچھتے ہو

”یہ بھی میری محبت کتنا، اب بتاؤ کیسے اس محبت  
سے نفرت نہ کروں جس سے میں نے بے پناہ پیار کیا۔  
وہی مجھے بچ رہے پر چھوڑ کر چلا گیا۔“ ماضی کا درگھونٹتے  
ہوئے درد کی پر جھائیاں اس کے چہرے پر اتر آئی  
تھیں۔ فار یہ بھی اس کے درد پر بے پناہ دھکی ہوئی تھی۔

”شانزے! محبت تو ہم سب کرتے ہیں مگر محبت  
کرنے والوں کے احساسات نہیں سمجھتے جہاں کوئی  
مشکل آئی محبت کو الزام دے کر بری ہو گئے۔ شانزے  
جی محبتیں ایسی تو نہیں ہوتیں۔ محبت تو ایک بہت انمول  
جذبہ ہوتی ہے جو ہمیں کہیں دھوکہ نہیں دیتی ہاں ہم اسے  
دھوکہ دیتے ہیں۔“ فار یہ بولی تو وہ اسے دیکھنے لگی۔

”روحان کی مجبوری کو سمجھا تم نے نہیں ناں پھر تم کیسے  
اسے الزام دے سکتی ہو یہ جانتے ہوئے بھی جو اس نے کہا  
وہ سب ٹھیک تھا۔ کیا تمہارے بابا تمہارا رشتہ خوشی روحان  
سے کر دیتے نہیں ناں وہ کبھی بھی محلوں کی رانی کو جھوٹری  
میں نہیں بھیجتے۔ پھر بتاؤ روحان نے کیا غلط کیا؟“ فار یہ  
نے اسے لا جواب کر دیا تھا۔ اس کی کالج کی نیلی آنکھیں  
درد کے پیکر اس سمندر کی مانند بہنے لگی تھیں۔

☆.....☆

دل کے کھلے گلاب محبت کی

سرزمین میں

عشق کرے کمال محبت کی

سرزمین میں

جاہت کا پانی دے کر

خوشیوں کی لگائی باڑ

محبت کی سرزمین میں

آج محبت کی تحمیل ہوئی تھی۔ محبت کے دو باسی

ایک ہوئے تھے۔ آج شانزے کے کمال شانزے روحان

بنی تھی۔ اور وہ بے پناہ خوش تھی۔ فار یہ کی باتوں نے اس

کے دماغ کی زنگ آلود سوچوں کو ایک نئی تازگی بخشی  
تھی۔ وہ سب سے پہلے اپنے بابا کے پاس گئی۔ ان سے  
ان کی رضا مندی حاصل کی پھر روحان کو ڈھونڈا اور  
جب وہ ملا تو وہ حیران رہ گئی چھ سال میں کیا کچھ بدل گیا  
تھا۔ وہ روحان تو رہا نہیں تھا۔ یہ روحان ملک انڈسٹری کا  
اور تھا وہ خوشی کے مارے لنگ رہ گئی تھی۔ محبت کو جب  
سب کی باہم رضا مندی سے حاصل کیا جائے تو وہ  
ہمارے حق میں ہمیشہ خوشیاں ہی کہتی ہے۔

☆.....☆

روحان کا ساتھ پا کر وہ بے پناہ خوش تھی۔ من  
چاہی خوشیاں جب میسر ہوں تو خوشیوں کا مزہ دوبالا  
ہو جاتا ہے۔

”روحان! اب اٹھو بھی فلائٹ کا ٹائم نکل جائے  
گا۔“ وہ اسے چونگی بار جگانے لگی تھی کیونکہ آج انہیں  
پیرس بنی مون پر جانا تھا۔

”روحان! اٹھتے ہو یا گراؤں پانی؟“ اس نے کبل  
اتار کر کہینا اور اسے زوردار دھمکی دی۔ وہ فوراً ہڑ بڑا کر  
اٹھ بیٹھا تھا۔

”اٹھ گیا اٹھ گیا شانزے روحان صلیب۔“ وہ دلکش  
مسکراہٹ سے مسکراتا تھا۔ وہ پلٹی لیکن روحان نے اس کا  
بازو پکڑ کر اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

”اب اٹھا دیا تو تیار بھی کر دو۔“ وہ اسے بازوؤں  
کے حصار میں جکڑے کہہ رہا تھا۔ وہ اس کی شرارت پر  
مسکرائی تھی۔

”اچھا کرتی ہوں وہ دیکھو آئی۔“ یہ کہہ کر وہ اس  
کے حصار سے نکل کر بھاگی تھی۔ روحان اس کی چالاکی  
پر ہاتھ پر ماکار کر رہ گیا۔

”آج تو بچ گئی آئندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ دھمکی  
دیتے بولا تھا اور وہ اس کی بے تاباں پر ہنستی ہی چلی گئی تھی۔  
خوشگوار محبت کا اختتام پذیر ہوا تھا۔ خوشیوں،

بہاروں کی رنگینیوں کے ساتھ!!

☆.....☆



# رنگِ عیدِ تیشہ و شیراز

آسمان پر گھنے سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ پر کیف و ٹھنڈی ہوا ساری فضا میں رچی بسی تھی۔ موسمِ سرما کی آمد تھی۔ گھنے سیاہ بادلوں نے دن میں شام کا سماں باندھ دیا تھا۔ سنہری دھوپ بھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔ گھر کی صفائی میں مصروف سارہ نے مچن میں جھاڑو لگاتے ہوئے آسمان پر نگاہ ڈالی دل یکدم باہر سہیلیوں کے سنگ گھونٹنے کو چاہنے لگا۔  
”اماں! میں فرحانہ کے گھر جا رہی ہوں۔“ سارہ کو موقع مل گیا تھا۔

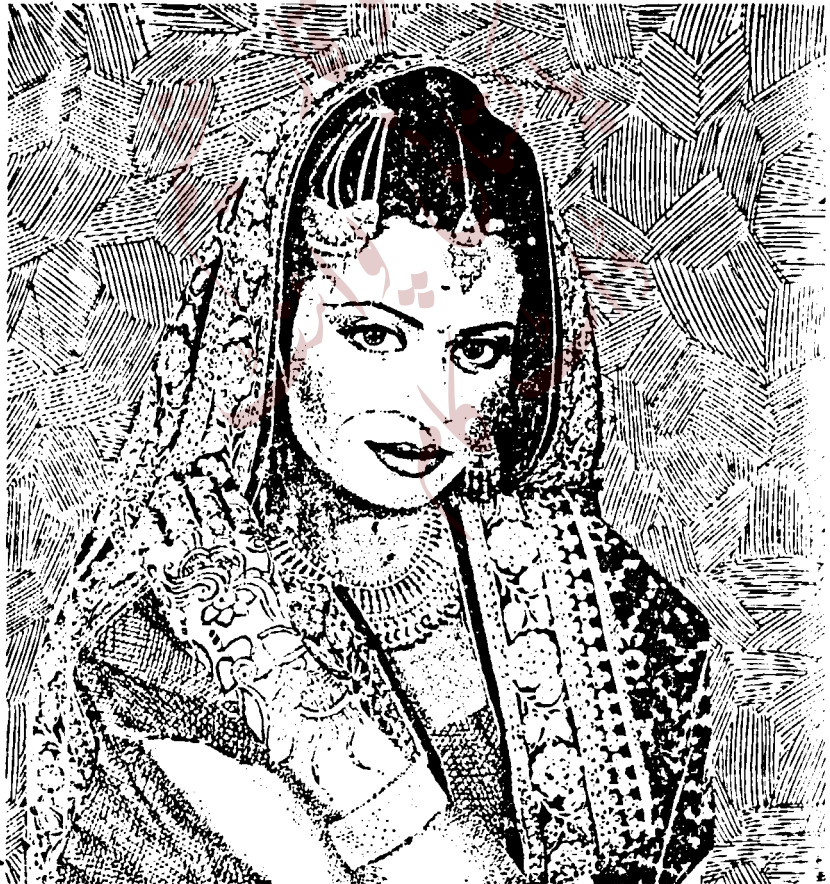




فرحانہ اس کی گہری دوست اور اماں کی کزن کی بیٹی تھی۔ اماں اور خالہ صغراں میں بھی خوب جنتی تھی۔ غالباً انہی کی  
 قاتل کی بیٹی میں بھی منتقل ہو گئی تھی۔ سارہ نے جھاڑو چھوڑ کر دوپٹہ سر پر اچھی طرح بٹایا اور زوردار ہانک لگاتے  
 ہوئے اماں کا جواب سننے بنا گھر سے باہر نکل آئی۔ وہ فی الحال اماں کا کوئی لیکچر سننے کے موڈ میں نہ تھی۔ اماں اسے  
 فراب موسم کا ڈراوا دے کر روکنے کی کوشش کرتیں اور دل کسی طور رکنے پر آمادہ نہ تھا۔ آنکھوں کی پٹیوں پر جھللاتا عکس  
 اسے رکنے نہ دے رہا تھا۔

سر سبز لہلہلاتے کھیت اور ہرے باغ آنکھوں کو تڑاؤٹ بخش رہے تھے۔ وہ گاؤں کی چھوٹی گلیاں عبور کر کے وسیع  
 کھیت میں داخل ہو گئی۔ اس کے قدم تیزی سے کھیت کے آخری سرے پر موجود کچے گھروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔  
 کتے بادل برسنے لگے تھے۔

## مکمل ناول



”سارہ.....“ من موہنے چہرے پر کچی دھیمی مسکان گہری ہو گئی تھی۔ اس کے تیزی سے اٹھتے قدم رک گئے۔ منزل سامنے آ گئی تھی۔ وہ آواز پر پٹائی حیدر چھوٹی سی پگڈنڈی پر تیز تیز بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ اگلے لمحے دونوں ہم قدم تھے۔ ہلکی بوند باندی بے حد بھلی لگ رہی تھی بلکہ سارہ کو تو سارے موسم حیدر سنگ بھٹے ہی لگتے تھے۔ حیدر نے مسکرائی نگاہ اس پر ڈالی۔

”میں فرحانہ سے ملنے جا رہی ہوں۔“ سارہ کا نفاذ دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے بنیدگی سے دھیمبا جواب دیا۔

”کیا صرف فرحانہ سے؟“ حیدر نے برا سامنہ بنایا۔ وہ کچھ اور سننے کا متنی تھا۔ وہ کھیت میں فصلوں کو پانی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کام ختم کر کے جلدی سے اس کے پیچھے لپکا تھا۔

”ہوں۔“ سارہ کو اس پر ٹوٹ کر پیارا آ یا مگر اسے ستانے کا لطف ہی اگ تھا۔

”اماں اور فرحانہ تو رات سے ریمانہ آپا کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔“ گھر آ چکا تھا۔ حیدر نے دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہو کر اسے اطلاع دی۔

ریمانہ آپا کی طبیعت ہفتہ بھر سے خراب تھی۔ آپا کی شادی قریبی گاؤں میں ہوئی تھی۔ اماں روز بیابی بیبی سے ملنے کا ارادہ کرتیں اور روزانہ ہی گھر کا کوئی نہ کوئی کام نکل آتا اور وہ رک جاتیں وہ کل شام کو آپا کی طرف چلی گئی تھیں اور وہ دو روز وہیں رہنا چاہتی تھیں۔ فرحانہ بھی ان کے ہمراہی۔ مگر میں بابا اور حیدر اکیلے تھے۔ بابا کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ”چلو تم تو ہونا گھر میں۔“ سارہ کلکھلا کر ہنس دی تھی۔ اس کے لبوں پر شریر مسکراہٹ بکھری تھی۔ آنکھوں میں دل کا بھید کھوٹی شریر چمک تھی جو مد مقابل کو بولنے پر اکساتی تھی۔

”سارہ کی بیٹی۔“ حیدر اس کی شرارت سمجھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ اس کا ارادہ بھانپ کر تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ آسمان پر چھائے بادل مزید گہرے ہو گئے تھے۔ حیدر کے لبوں پر مسکراہٹ بکھری تھی۔ وہ سر جھٹکنا نہ ہاتھ دھونے کے لیے صحن کے کونے میں لگے فل کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆

کھڑکی کے پار تو اتر سے بارش جا رہی تھی۔ صبح سے برستی بوند باندی نے تیز بارش کا روپ دھار لیا تھا۔ لان میں گئے پودے محل کر نکھر گئے تھے۔ اس نے جھٹکے سے کھڑکی کی کھول دی۔ تیز بوجھاڑنے اسے ایک لمحے میں بھگودیا۔ سرما کی آمد تھی۔ بارش میں رچی ٹھنڈ اور نمی نے اسے بے ساختہ تیز جھرجھری لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کھڑکی بند کرنے کے بجائے وارڈ روپ سے شال نکال لائی۔ اس نے شال اپنے کندھوں کے گرد اوڑھتے ہوئے کھڑکی میں بازو لگا کر سر باہر نکالا۔ بارش اسے تیزی سے بھگو نے لگی۔ ہلکی خشکی نے اس پر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری کر دی تھی مگر اسے بارش میں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔

”ایمان! کیا کرتی ہو بیٹا تم بیمار پڑ جاؤ گی۔“ وہ لان میں دھلے پودے اور آسان سے تیزی سے برستی بارش دیکھنے میں مجبوری کہ دادو کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ اسے بھینکتا دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھیں اور اسے سختی سے ڈانٹتے ہوئے کھڑکی بند کرنے لگیں۔

”دادو پلیز۔“ ایمان لاڈ سے بولی۔ اسے سہانا موسم بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ اسے دادو کی مداخلت قدرے گراں گزری تھی۔

”کوئی پلیز دلیز نہیں۔ پھر ساری رات ہائے بائے کرتی رہو گی۔“ وہ بے حد نازک مزاج واقع ہوئی تھی۔ اس سے

۱۰۔ م کی ذرا سی بھی سختی برداشت نہ تھی۔ وہ بیمار پڑ جاتی تو اس کی تیمارداری اکیلی بوڑھی دادو کو کرنا پڑتی اور ان کی بوڑھی بڑیاں میں اتنا دم خم نہ رہا تھا کہ وہ اس کے سر ہانے بیٹھ کر رات بھر جاگتیں اور اس کی دیکھ بھال کرتیں۔ دادو نے کھڑکی بند کی اور اسے بیڈ پر بٹھا کر اس کی گیلی شال اتارنے لگیں۔

”لو بھلا کر لو بات۔ تمہیں اپنی ذرا سی بھی فکر نہیں ہے۔ اب تم بچی نہیں رہی ہو ایمان۔“ صد شکر اس کے کپڑے نہ بیٹے تھے۔ وہ تو لیہ لے آئیں اور اس کے بال تو لیہ لے سے خشک کرنے لگیں۔ وہ بالکل کسی بچے کی طرح اسے ٹریٹ کر رہی تھیں اور ایمان بھی بچہ بنی معصومیت سے آنکھیں پٹیانی ان کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دادو کے کام میں ذرا سی بھی مداخلت شامت اعمال بلوانے کے مترادف ہے اور وہ فی الحال ان کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کے موڈ میں نہ تھی۔ اس کے بال خشک کرتے ہوئے دادو زیر لب بڑبڑائے جا رہی تھی۔

”دادو میں بچی نہیں رہی ہوں۔“ دادو کی انمول محبت اس کی زندگی کا قیمتی سرمایہ تھی۔ اس نے والدین کی موجودگی میں بھی ان کی عدم توجہ سہی تھی۔ ایسے میں صرف دادو تھیں جو گھر میں اس کا مکمل خیال رکھتی تھیں۔ وہ اس کے لیے فکر مند ہو رہی تھیں۔ ایمان نے محبت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”اگر تم بچی نہیں رہی ہو تو تم بچوں جیسے کام کیوں کرتی ہو؟“ دادو کی تشویش کسی طور کم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ انہوں نے غصے سے اسے تڑاڑا تھا۔ ان کا محبت بھرا دل پوتی کی بیماری کا تصور کر کے ہی سہا جا رہا تھا۔

”دادو! چلیں میں آپ کو اپنے ہاتھ کی بنی کر ماگرم چائے پلاتی ہوں۔“ دادو اس کے بال خشک کر کے تو لیہ ٹیس میں پھینکا کر آئیں تو ایمان نے انہیں محبت سے کندھوں سے تھام لیا۔

”ٹھیک ہے۔“ ان دونوں کی محبت و دوستی میں ایک ان کہا سمجھو تا شال تھا۔ وہ دونوں نہ تو ایک دوسرے سے ناراض ہوتی تھیں اور نہ ہی کبھی لڑتیں تھیں۔ اس نے محبت سے دادو کے گرد بانیں حمال کیں تو وہ با آسانی مان گئیں۔ ایمان مسکراتی ہوئی چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ جب کہ دادو وہیں صوفے پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگیں۔ وہ دل میں تشکر تھیں کہ انہوں نے بروقت ایمان کو بارش میں جھینکا دیکھ لیا تھا۔

☆.....☆

”ریمانہ کی طبیعت کیسی ہے؟“ رحمت خالدہ دو روز بیٹی کے ہاں رہ کر آگئی تھیں۔ سارہ نے اماں کو ریمانہ آپا کی تاسازی طبیعت کا بتا دیا تھا تو وہ ان سے ملنے چلی آئیں۔ رحمت خالدہ اور اماں میں مثالی محبت و دوستی تھی۔ رحمت خالدہ نے تو اشاروں کنایوں میں کئی بار اماں سے حیدر اور سارہ کے رشتے کی بات بھی کی تھی۔ اماں بیٹی کی پڑھائی کا بہانہ بنا کر خالدہ کو نال چکی تھیں۔ انہیں بھی حیدر پسند تھا مگر وہ بیٹی کی پڑھائی مکمل ہونے تک اس کی کہیں بات طے کرنے کے حق میں نہ تھیں۔ البتہ ابانے رحمت خالدہ اور سلیم چاچا کو ہاں کرتے ہوئے سارہ کی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد رسم کرنے کا کہا تھا۔ ان کا فیصلہ ان دونوں نے خوشی مان لیا تھا۔ گاؤں کا ہائی اسکول کالج بن چکا تھا۔ گاؤں میں لڑکیوں کو تعلیم دلوانے کا خاص رواج نہ تھا۔ فرحانہ اور سارہ کو تعلیم حاصل کا بے حد شوق تھا اور ان کے شوق میں کسی نے کوئی رکاوٹ نہ ڈالی تھی۔ وہ دونوں ایف اے کر رہی تھیں۔ گاؤں میں کوئی ڈگری کالج نہ تھا۔ اماں کا ارادہ بیٹی کو تعلیم کے لیے شہر بھیجنے کا نہ تھا۔ انہوں نے دے لفظوں میں رحمت خالدہ کو رسم کرنے کا کہہ دیا تھا۔ ابابھی اکوٹی اولاد کے فرض سے جلد سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ فرحانہ ان کے لیے جلدی سے چائے بنالائی تھی۔ اماں نے خالدہ استفسار کیا۔

”اللہ کا لا شکر ہے وہ اب بھلی چٹکی ہے۔“ ریمانہ کو چند روز سے بخار تھا اور اب اسے افاقہ تھا۔

”تو کسے ڈھونڈ رہی ہے۔“ اماں اور خالدہ باتوں میں مگن تھیں۔ فرحانہ اسے اپنے ساتھ کرے میں لے آئی

تھی۔ سارہ نے متلاشی نگاہیں چاروں طرف دوڑائیں تو فرحانہ نے مجسم شریر لہجہ میں اسے چھیڑا تھا۔  
 ”ریحانہ آپا کیسی ہیں۔ ان کے دونوں بیٹے تو بہت تنگ کرتے ہوں گے۔“ ریحانہ کے دو بیٹے تھے۔ ان کا دھیان ہر وقت شرارتوں میں لگا رہتا تھا۔ ریحانہ آپا اکلوتی سہو تھیں ان کی ساس کا انتقال ہو چکا تھا۔ انہیں بیماری میں بچوں نے خاص تنگ کر رکھا تھا۔ فرحانہ نے سارہ کو گھیرنا چاہا تو اس نے موضوع گفتگو بدل ڈالا۔  
 ”ایسا دیا۔ وہ دونوں تو آپا کو ایک منٹ بھی آرام نہیں کرنے دیتے ہیں۔“ فرحانہ حسب عادت شروع ہو چکی تھی۔ سارہ سرد مہنتی اس کی بات سننے لگی۔

”السلام علیکم خالہ!“ وہ باتوں میں جو تھی کہ محن میں ابھرتی آواز نے اس کی تمام حسیات متوجہ کر لیں۔ اس نے کن آنکھوں سے محن میں جھانکا۔ وہ کچے محن میں پھیل کے نیچے بچھی چار پائی پر اماں کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ سارہ کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ رینگ مئی تھی۔

☆.....☆

”دادو پلیز گرما گرم سمو سے بنا دیں۔“ ایمان کا بی ایس سی کے فاضل انگریز امز کا اسٹ پیپر تھا۔ وہ ربیعہ کو اپنے ساتھ گھر لے آئی تھی۔ ربیعہ کا ان کے ہاں کافی آنا جانا تھا۔ وہ اکثر دن بھر ادھر رہتی تھی۔ دادو کو ربیعہ بھی بے حد عزیز تھی۔ وہ دونوں آتے ہی کھانا کھا کر سوئیں تو شام کو جاگیں۔ وہ فریش ہو کر لان میں آگئیں۔ دادو ان کے لیے چائے بنا کر لے آئیں۔ ربیعہ نے لوازمات کے بغیر چائے دیکھ کر بلا تکلف فرمائش کر ڈالی تھی۔  
 ”سعیدہ بیٹا! تم سمو سے لے آؤ۔“ دادو اس کی پسند سے آگاہ تھیں۔ ربیعہ کو خالی چائے پسند نہ تھی۔ وہ ہمیشہ چائے کے ساتھ کچھ نا کچھ لیتی تھی۔ دادو نے اس کے لیے آپیشلی سمو سے بنائے تھے۔ وہ ان کے ہاتھ کے بنے سموں کی بے حد شوقین تھی۔ دادو نے با آواز بلند کچن میں مصروف ملازمہ کو پکارا تھا۔  
 ”جی دادو جان!“ وہ گھر بھر کی دادو تھیں۔ ملازمہ کی مودب آواز ابھری اور وہ چند ثانیوں بعد گرما گرم سمو سے لیے حاضر ہو گئی۔

”یہ لبیں بی بی جی۔“ سعیدہ نے ان کے سامنے نمبل پر سمو سے لاکر رکھ دیے۔ ربیعہ سموں سے انصاف کرنے لگی۔  
 ”تمہارے پیپرز کیسے ہوئے ہیں بیٹا؟“ دادو نے اپنے مخصوص مشفق لہجہ میں محبت سے استفسار کیا۔ ایمان گھر میں ربیعہ کا راگ ہر وقت الہی رہتی تھی۔ ان دونوں کا ارادہ یکمشری میں ماسٹر کرنے کا تھا۔ ربیعہ کا فیملی بیک گراؤنڈ مضبوط نہ تھا۔ وہ ماسٹرز کے بعد اپنے معاشی حالات سدھارنے کے لیے جاب کرنا چاہتی تھی۔  
 ”دادو! آپ میرے اچھے مارکس کے لیے دعا کریں۔“ ربیعہ نے کول مول سا جواب دیا تھا۔ اس کے تمام پیپرز بہترین ہوئے تھے۔

”بیٹا! اللہ محنت رازبگاہ نہیں کرتا ہے۔ تمہارے پیپرز اچھے ہوئے ہیں تو تمہارے مارکس بھی اچھے آئیں گے۔“ دادو نے نگاہیں بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے تسلی دی تھی۔ ربیعہ کے فادر اسکول ٹیچر تھے۔ وہ چار بہن بھائی تھے۔ اس کے والد نے قلیل تنخواہ میں بچوں کی بہترین پرورش کی تھی۔ ربیعہ کا اکینڈ کم ریکارڈ شاندار تھا۔ وہ پچھرا شپ کی متنی تھی۔  
 ”آف کورس دادو!“ ربیعہ بھی ایمان کی دیکھا دیکھی انہیں دادو کہتی تھی۔ اس نے ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا جب کہ ایمان خبیثگی بھری خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

☆.....☆

غلام رسول کے کچے آگن میں خوشیوں کی بارات اتری تھی۔ گھر میں بے حد گہمباہمی اور رونق تھی۔ پورا گاؤں اس کی

نہ شیوں میں شریک تھا۔ رحمت خالہ کو اچانک ہارٹ ایک ہوا تھا۔ وہ رو بہ صحت ہو گئی تھیں مگر انہیں اپنی زندگی کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ وہ جلد از جلد اگلوتے بیٹے کے سر پر سہرا سجا دیکھنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اماں سے کہہ کر سارہ کے ایگزامز کا اقرار کیا بغیر شادی کی ڈیٹ لے لی تھی۔

اماں اور ابا نے بھی تھوڑی پس و پیش کے بعد ہاں کر دی تھی۔ غلام رسول سچا اور کمر انسان تھا۔ گاؤں میں مختلف برادریوں کے لوگ رہتے تھے۔ وہ چوہدری کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔

”بارت آگئی، بارت آگئی۔“ غلام رسول کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ گاؤں کا ہر جوان سارہ کو بہن سمجھ کر اس کی شادی کی تیاریوں میں غلام رسول کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ رحمت خالہ نے اچانک شادی کی ڈیٹ مانگی تو حقیقتاً غلام رسول کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ تنہائی کی شادی کی تیاری کیسے کر پاتا۔ قدرت نے اس کی مدد کی تھی۔ وہ بارات کے استقبال کی تیاریوں میں مگن تھا کہ شور بلند ہوا۔ وہ بارات کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ بارات کو مردانے حصے میں بٹھا دیا گیا۔ لڑکوں نے ہر کام نہایت خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ غلام رسول مطمئن تھا۔ نکاح کے بعد کھانا شروع کیا گیا تو اسے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیا گیا۔ تمام جوان بھاگ بھاگ کر مہمانوں کی تواریف کر رہے تھے۔ ہر انتظام عمدہ تھا۔

بالآخر بیٹی کے وداع کا وقت آ گیا۔ سارہ دلہن بنی بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ وہ والدین کی ڈھیروں دعائیں لیے باہل کے آگن سے وداع ہو گئی۔ مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ خوشیوں بھرا اور پر رونق آگن سونا ہو گیا تھا۔ خالہ شوہر کے قریب آ گئیں۔ وہ بے حد اداس تھا۔ اسے بیٹی عزیز بھی تو بہت تھی۔ غلام رسول نے خالی اداس آنکھوں سے بیوی کو دیکھا تھا۔

”وہ چلی گئی خالہ۔“ غلام رسول کے لب دھیرے سے پھڑپھڑائے تھے۔ دل اداس ہونے کے ساتھ مطمئن بھی تھا کہ زیادہ دور نہ گئی تھی۔

”تو زرا جھلے غلام رسول! اسے تو ایک دن جانا ہی تھا۔“ خالہ باپ بیٹی کی انمول محبت سے آگاہ تھی۔ غلام رسول کی تو اس میں جان تھی۔ خالہ نے شوہر کو سلی دی۔ وہ بھی بیٹی کے جانے سے اداس تھیں۔ گھر کا سونا پن اسے بھی ڈس رہا تھا۔ دن کی روشنی شام کے شگبے اندھیرے میں ڈھلنے لگی تھی۔ ان کے چہروں پر پرسکون اداسی اور اطمینان پھیلا تھا۔ آخر قدرت نے انہیں ان کی زندگی کے اہم فریضے سے بخوبی سکدوش کر دیا تھا۔

☆.....☆

”ایمان! جلدی کرو بیٹا، ناشہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ ان کا رزلٹ آچکا تھا۔ وہ دونوں شاندار مارکس سے کامیاب ہوئی تھیں۔ انہوں نے نیسمٹری ماسٹرز میں ایڈمیشن لیا تھا۔ اس روز ایمان کا یونیورسٹی کا پہلا دن تھا۔ دادواں دونوں کے ساتھ ایڈمیشن کروانے جا رہی تھیں۔ دادو پوتی کے معاملے میں بے حد حساس تھیں۔ خادو عباسی اور نیلما عباسی شہر کے معروف سماجی سوشل ورکر تھے۔ ان دونوں کی برنس معاشی و سماجی مصروفیات تھیں۔ انہیں بیٹی کے لیے فرصت نہ تھی۔ دادو نے بہو اور بیٹی کی مصروفیات کے باعث پوتی کی دیکھ بھال اور نگہداشت کی ذمہ داری اٹھائی تھی تاکہ وہ نظر انداز نہ ہو۔ وہ ایمان کے معاملے میں محتاط تھیں۔ خلط و تعلیم پر قطعاً کوئی اعتراض تھا۔ ان کا بوڑھا اور زمانہ شناس دل صرف اپنی تسلی چاہتا تھا سو وہ صبح سے اس کے لیے ہانکاں ہو رہی تھیں۔

”دادو دمنٹ چلیز۔“ ایمان کمرے میں مٹھی تیار ہو رہی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں برش کرتی اونچا بولی تھی۔

”بیٹا! تم یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ بننے جا رہی ہو اب بچپنا چھوڑ دو۔“ وہ دس منٹ بعد تیار ہو کر ڈائمنڈ نیبل پر آئی تو

دادو نیل پر تاثیر رکھے اسی کی منتظر تھیں۔ نیلما اور خاور اپنے کمرے میں تجو آرام تھے۔

”دادو! ابھی تو ایڈیشن اوپن ہوئے ہیں۔ جب تک اسز ہوں گی تو میں ریگور ہو جاؤں گی۔“ ایمان کی انگڑاں اٹھ کر فراغت کے بعد روٹین لائف خاصی چھینچ ہوئی تھی۔ وہ دن چڑھتے ہی سوئی اور پھر زیادہ ترٹی وی دیکھتی رہتی تھی۔

”دادو! جلدی کریں۔ ابھی ریویو بھی پک کرنا ہے۔“ ایمان نے فراغت میں ڈرائیونگ سیکھی تو خاور عباسی نے نیلما کو اس کا پسندیدہ ماڈل خرید کر دیا۔ ایمان دادو کے ساتھ گاے بگاے آؤنگ لایا لک ڈرائیو پر چلی جاتی تھی۔ وہ بچہ کالج دین پر جاتی تھی۔ اسے یونیورسٹی جانے کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ پر خوار ہونا پڑتا۔ ایمان نے اسے فون کر کے ایڈیشن اوپن ہونے کا بتایا اور یونیورسٹی جانے کے لیے ٹائمنگ فکس کرتے ہوئے اسے پک کرنے کی پیشکش کر ڈالی۔ اس نے صاف انکار کرنا چاہا تو وہ خفا ہوئی ناچار ریویو کو اس کی خاطر ماننا پڑا تھا۔ ناشتہ کرنی ایمان عباسی نے وال کلاک ہم نگاہ ڈالی۔ اس نے بھلتے ناشتہ تمام کر کے چائے دے کر گئی تھی۔ اسے ساڑھے دس بجے ریویو پک کرنا تھا۔

”میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے نہیں تم نے دیر کر دی ہے۔“ دادو فحشی سے بچکانہ انداز میں منہ پھلایا۔

”ہری اپ دادو!“ ایمان عباسی نے اپنی مخصوص شوخی بھری شرارت سے ان کے پہلو میں ہولے سے کہنی چھوئی۔

”چل ہٹ شر کر کہیں کی۔“ گریس فل واد قارزینت عباسی اپنی سفید چادر سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ریویو اس کی منتظر تھی۔ وہ اسے پک کر کے یونیورسٹی کی راہ پر ہوئی۔

☆.....☆

”وہ دوپہر سے تے تے کیے جا رہی تھی۔ خالدہ رحمت اور فرحانہ قریمی شہر خریداری کے لیے گئی تھیں۔ اس کی شادی کو مہینہ سے زائد ہو گیا تھا۔ بوار رحمت نے انکوئی بہو کے خوب لاڈ و چاؤ کیے تھے۔ وہ اس سے میٹھا پکوانی کی رسم کروانا چاہتی تھیں۔ ان کے ہاں رواج تھا کہ نئی نویلی دلہن سے ”میٹھا پکوانی“ کی رسم کروا کر گھر کے کام کاج شروع کروائے جاتے تھے۔ گھر میں چار بندے تھے اور ان کا کام ہی کتنا تھا۔ بوار رحمت اور فرحانہ دونوں مل کر گھر کا مختصر کام جھٹ پٹ کر لیا کرتی تھیں اور سارہ کو کسی کام کو ہاتھ نہ لگانا پڑتا بلکہ اس کے کرنے کے لیے کام ہی نہ پچتا اور اس کے کسی کام کو کرنے کی نوبت نہ آتی۔

بوار رحمت خاندانی رواج پورا کرنے کے لیے میٹھا پکوانی کی رسم کرنا چاہتی تھیں۔ درندان کا ارادہ فی الحال بہو سے کام کروانے کا نہ تھا۔ سارہ لب شیریں بنانے میں ماہر تھی۔ اس نے ساس کو لب شیریں کے اجزا کی لسٹ بنا کر تھمائی تو گاؤں میں کچھ اشیاء نہ تھیں سو انہیں شہر آنا پڑا۔ انہوں نے بیٹی کی شادی کے بعد بیابانی بیٹی کو کوئی تحفہ بھی نہ دیا تھا۔ وہ اس کے لیے کپڑے اور جوتے بھی خریدنا چاہتی تھیں۔

”سارہ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ ابابو حیدر کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ وہ دونوں دوپہر کا کھانا کھانے گھر آئے تو ابابو نے بہو کی تنہائی کے خیال سے حیدر کو گھر رکھنے کی تاکید کی اور کھانا کھا کر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد سارہ کو کاج تک شروع ہو گئی۔ حیدر نے تشویش بھری محبت سے استفسار کیا۔

”مجھے ناشتہ ہضم نہیں ہوا ہے۔“ خالدہ رحمت نے صبح تڑکے ہی ساگ اور کھجور کی روٹی بنائی تھی۔ اس نے تاسازی طبیعت کی وجہ بھاری ناشتہ جانا تھا۔ اس نے حیدر کی تشویش دور کرنا چاہی تھی۔

”اماں کب آئیں گی؟“ اس کی طبیعت سنبھل نہ رہی تھی۔ وہ چند بار کی تے سے ٹھہرا لگ رہی تھی۔ حیدر کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

”وہ دوپہر کا کھانا کھاتی تھیں۔“ سارہ کو شوہر کی محبت بھری تشویش بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے چار پائی پر لیٹنے

”تایا حیدر آگے بڑھ کر اس کے سر کے نیچے دیر سے دھکے دے گا۔“  
 ”اماں آجائیں تو میں تجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔“ حیدر نے تشویش سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے  
 بے بسی بھائی سے کہا۔

”کیا ہوا ہے میری بہو کو۔“ اسی لمحے بوارحت اور فرحانہ آگئیں۔ بوا بیٹے کی بات سن کر تیزی سے آگے آئیں۔  
 ”اب نہ حال ہی زرد چہرہ لیے لیٹی تھی۔ جب کہ حیدر کے چہرے پر تشویش تھی۔ سارہ کے چہرے کی زردی نے انہیں بھی  
 ڈرایا۔ فرحانہ شاپنگ کا سامان دوسرے کمرے میں رکھ کر وہیں چلی آئی۔ وہ بھی بھائی کو دیکھ کر فکر مند ہو گئی تھی۔  
 ”اماں! اسے کھانے کے بعد اچانک تے شروع ہو گئی تھی۔“ سارہ سے بولا بھی نہ جا رہا تھا۔ حیدر نے انہیں بتاتے  
 ہوئے اپنی جگہ دی۔

”تے.....“ بوارحت زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ کر اس کی نبض ٹٹولنے لگیں۔ ان کی زمانہ شناس  
 مہارتیں بھوکہ کی ناسازی طبیعت کا بھید پا گئیں۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔  
 ”تو باپ بنے والا ہے حیدر۔“ بوائے نے اپنے کو خوش خبری سنائی۔ فرحانہ اور حیدر خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ بوائے محبت  
 سے بڑکا تھا چوماسارہ نے شرمناک چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔

☆.....☆

”حیدر میں اپنے بچوں کو خوب پڑھا لکھا کر کسی قابل بناؤں گی۔“ بوارحت نے اس سے بیٹھا پکوائی کی رسم تو  
 لے لی تھی مگر اسے گھر کے کسی کام کو ہاتھ تک نہ لگانے دیتیں۔ انہوں نے بہو کو قہریلی کا چھالا بنا لیا تھا۔ اسے کھانا تک  
 بار پانی پر دیا جاتا تھا۔ سارہ فراغت سے ادب کرتی تھی۔ اس کا دل گھر میں نہ لگ رہا تھا۔ حیدر اماں کو بتا کر اسے لیے  
 گاؤں کھوٹنے نکل پڑا۔ اماں نے دونوں کو لاکھ ہدایتوں کے بعد جانے کی اجازت دی تھی۔ وہ دونوں گاؤں گھومنے کے  
 بعد گاؤں کی غدی کنارے آن بیٹھے۔ سارہ نے جھٹ کنارے بیٹھ کر دونوں ٹانگیں پانی میں ڈال دیں۔ پانی کی ٹھنڈی  
 لہریں جسم و جان کو بھلی لگ رہی تھیں۔ حیدر نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ سارہ نے گردن گھما کر حیدر کو دیکھا۔ اس کی  
 آنکھوں میں ناقص حسرتوں کی کھجک جاگ اٹھی تھی۔

اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ اپنے ماموں کے پاس شہر جا کر انٹر کے بعد مزید پڑھنا چاہتی تھی مگر وہ انٹری نہ کر  
 پائی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر اپنے ادھر سے خوابوں کی تکمیل چاہتی تھی۔

”انشاء اللہ سارہ ہم اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے۔“ بوارحت باقاعدگی سے بہو کا ڈاکٹر سے چیک اپ کروا  
 رہی تھیں۔ سارہ کے ہاں جڑواں بچوں کی پیدائش متوقع تھی۔ حیدر بھی میٹرک پاس تھا۔ وہ بھی پڑھنے کا شوقین تھا  
 مگر اسے میٹرک کے بعد ابا کا ہاتھ بنانے کے لیے تعلیم چھوڑنا پڑی تھی۔

”حیدر تم مجھ سے وعدہ کرو اگر ہمیں گاؤں چھوڑ کر شہر جانا پڑا تو تم میرا ساتھ دو گے۔“ سارہ نے امید بھری نظروں  
 سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے سامنے اپنی قہریلی بھیلیائی۔

”وعدہ۔“ سارہ کے سونے والے دلکش چہرے پر خوابوں کی سنہری چمک نے لمحہ بھر کو حیدر کو مہبوت کر دیا تھا۔ اس نے  
 ایب جذب سے سارہ کی بھیلی بھیلی قہریلی تمام لی۔

”تھک چکے ہو حیدر۔“ سارہ کی آنکھوں میں تشکر بھرے آنسو چمک اٹھے تھے۔ اس نے منونیت سے حیدر کی بند مٹھی پر  
 اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔

☆.....☆

”اٹھ پتر سارہ تیرے انتظار میں ابھی تک بھوکی ہے۔ تو پہلے کھانا کھالے۔“ وہ ابا کے ساتھ اگلی فصل کی بوائی کے لیے بیج اور کھاد خریدنے کے روز سے شہر گیا ہوا تھا اور صبح ہی گھر لوٹا تھا۔ وہ ناشتے کے بعد سویا تو دوپہر کو جاگا تھا۔ وہ فریض ہو کر اماں کے پاس آ بیٹھا۔ ابا حسب عادت اپنے دوستوں سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ ابا نے ساری زندگی محنت کی تھی۔ ان کی محنت کا ہی ثمر تھا کہ ان کا گھر لگاؤں کے چند خاشمال گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ گھر میں دو بھینس تھیں اور اماں نے کئی مرغیاں پال رکھی تھیں۔

گھر میں دودھ دہی کی کثرت تھی۔ گھر میں برکت و سکون تھا۔ اماں نے خوش اسلوبی سے گھر کا نظام سنبھال رکھا تھا۔ وہ ماں کو شہر کی باتیں بتا رہا تھا۔ اماں اور فرحانہ اشتیاق سے اس کی باتیں سن رہی تھیں کہ فرحانہ اماں کو بہو کا خیال آیا۔ وہ بھوکی تھی۔ اس نے حیدر کے بغیر کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ہولے سے سر ہلاتا اٹھ گیا۔

”بہت مزے کا آلو قیمہ ہے۔ کس نے بتایا ہے؟“ حیدر شادی کے بعد پہلی بار سارہ سے اتنے دن دور رہا تھا۔ سارہ نے دو دن بے کئی میں گزارے تھے۔ اس نے بے حد چاؤ سے حیدر کا پسندیدہ آلو قیمہ پکایا تھا۔ حیدر نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہی بے ساختہ تعریف کی۔ سارہ کو لگا جیسے اس کی محنت وصول ہوئی ہو۔

”میں نے۔“ سارہ نے خوشدلی سے سر ہلاتے ہوئے اسے بتایا۔

”سارہ تمہارے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔“ حیدر نے کھل دل سے اسے سراہا تھا۔

☆.....☆

”دادو ناشتہ!“ ایڈیشن کے چند روز بعد ہی ان کی کلاسز باقاعدگی سے شروع ہو گئیں تھیں۔ فراغت کے دن قصبہ پارینہ بن گئے تھے۔ اس روز کلاسز کا پہلا دن تھا۔ ایمان صبح جلدی اٹھ کر تیار ہو گئی تھی۔ وہ تیار ہو کر کچن میں آئی تو دادو نے ابھی ناشتہ تیار کرنا شروع ہی کیا تھا۔ اس نے ناشتہ تیار نہ پا کر آتے ہی شور مچا دیا تھا۔

”لڑکی تم ذرا چھری تلے دم تولو۔“ وہ دونوں دادی پوتی ہی نہیں بلکہ ایک دو بے کی ہمراز و دوست بھی تھیں۔ اس کی جلدی نے ان کے ہاتھ پاؤں بھلا کر رکھ دیے تھے۔ انہوں نے جلدی سے گرما گرم پرائٹھا تو اسے اتار کر آئل پھیلا دیا اور آلیٹ بنانے لگیں۔

”دادو! آج میری پہلی کلاس ہے مجھے دیر ہو جائے گی۔“ ابھی کلاس شروع ہونے میں ڈیڑھ گھنٹہ تھا۔ اسے رعبہ دہ بھی پک کرنا تھا۔ چونکہ آج پہلا دن تھا وہ وقت پر پہنچنا چاہتی تھی۔ رعبہ نے اس کے ساتھ مزید جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے یونیورسٹی آنے جانے کے لیے پوائنٹ کا انتخاب کیا تھا۔

”میں نے تمہیں کب جلدی جانے سے منع کیا ہے بس ذرا صبر کرلو۔“ دادو نے نرمی بھری خشکی سے اسے ڈانٹ پلائی تھی۔

”لو کھاؤ۔“ دادو اس کے لیے پرائٹھا آلیٹ لائیں تو وہ پیچیدہ صورت لیے بیٹھی تھی۔ دادو کو اس کی خشکی کا خیال آنے لگا تو انوں نے اسے خواہ مخواہ مخاطب کیا۔ وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگی۔

☆.....☆

بوارحت کے کچے آٹکن میں خوشیوں کی برسات اتری تھی۔ سارہ کے ہاں بیٹا، بیٹی نے جنم لیا تھا۔ ہر چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ سارہ کو اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ خالدہ اور غلام رسول بھی ہمراہ تھے۔ سارہ کو تیسرے دن ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ فرحانہ بچوں کو گود میں لیے بے حد مسرور تھی۔ اس کا بس نہ چلتا وہ دونوں فرشتوں کو کسی اور کو ہاتھ تک نہ لگانے دیتی۔ ”فرحانہ! میری بہو کو آرام کرنے دو۔“ سارہ کو اس کے بچوں سمیت کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ ابھی سارہ سے الٹا



بہت مشکل تھا۔ فرحانہ اس کی ہمدردی مہر کی تھی اور اسے اپنی دوروز کی بے قراری کے قصے سنار ہی تھے۔ جو اس نے متناہی اور تنہی کو کھلانے کے لیے کانے تھے۔ سارہ اس کی دیوانگی پر تھکن کے باوجود مسکرائے جارہی تھی اور اس کے ثابت زدہ چہرے پر مسکا کا نور جھلک رہا تھا۔ بوارحت نے بہو کے آرام کے خیال سے بیٹی کو ڈنپا۔

”اماں! ابھی تو مجھے سارہ سے بہت باتیں کرنی ہیں۔“ فرحانہ نے لاڈ سے منہ بسورا۔ اس نے بھائی کہنے کا تکلف نہ پایا تھا۔ وہ دھڑلے سے اس کا نام لیتی تھی اور اسے کسی نے نہ ڈنپا تھا۔ حتیٰ کہ سارہ کو بھی قطعاً گراں نہ گزرتا تھا۔

”فرحانہ اٹھ بیٹا! ابھی ہوئی ہے۔ اس کے آرام کے دن ہیں۔“ بوارحت نے غصے سے بیٹی کو گھر کا تھا۔

”اماں میں ٹھیک ہوں۔“ فرحانہ ماں کی ڈانٹ ڈپٹ پر منہ پھلائے اٹھنے لگی تو سارہ سے سہانہ گیا۔ اس کا سونے کا لیٹا لال موڈ نہ تھا۔ حیدر آتے ہی دوسرے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔ وہ اکیلی بور ہوئی رہتی۔ اس نے فرحانہ کا ہاتھ تمام لرزاک لیا۔

”تم اپنی باتوں میں کسی دوسرے کی کہاں سنتی ہو بھلا۔“ ان دونوں کی پرانی عادت تھی۔ ناچار بوا کو بار ماننا پڑی۔

☆.....☆

”الیاس عمر۔“ کلاسز کا پہلا روز تھا۔ ڈیپارٹمنٹ کے مین گیٹ کے ساتھ نوٹس بورڈ پر تمام کلاسز کی ٹائمنگ اور لپز کے نام درج تھے۔ وہ دونوں شیڈول نوٹ کر رہی تھیں۔ پہلا پریڈ شروع ہونے میں تھوڑی دیر تھی۔ وہ شیڈول نوٹ کر کے کلاس روم کی طرف بڑھ گئیں۔ حاضری کم تھی۔ سر علی احمد حاضری لگانے کے ساتھ تعارفی مراحل بھی طے کر رہے تھے۔ وہ باری باری اسٹوڈنٹس کا نام لیتے اور حاضر اسٹوڈنٹ سے تعارف کے ساتھ اس کے مشاغل بھی پوچھتے تھے۔ انہوں نے نہایت دلچسپی سے نام اور رول نمبر پکارنے کے بعد کلاس پر طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ سبھی اسٹوڈنٹس کے چروں پر اشتیاق تھا۔ سب کو انوکھا نام پسند آیا تھا۔

”الیاس عمر۔“ ربیعہ نے پسندیدگی سے زیر لب دہراتے ہوئے بواز رو پر نگاہ ڈالی تھی مگر اس کی نظروں کو مایوس لونا ہوا تھا۔ الیاس عمر غیر حاضر تھا۔ ایمان لائٹلی سے اپنی فائل پر جھکی تھی۔

”زائد اور لیس۔“ سر علی احمد چند ثانیوں بعد اگلے اسٹوڈنٹ سے تعارف کرنے لگے تھے۔ سر علی احمد ہیڈ آف ا۔پارٹمنٹ تھے۔ ربیعہ سر جھٹک کر ایمان کی سمت متوجہ ہوئی جو اپنی فائل پر بے نیازی سے جھکی ٹائم ٹیبل دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆

”سارہ بیٹا! تم اپنی خوراک کے معاملے میں بہت لاپرواہ ہو گئی ہو۔“ سارہ میکے رہنے آئی تھی۔ خالدہ نو اس کی نواسی کو کنبلا کر دھوپ میں لیے بیٹھی تھیں۔ سارہ صبح سے ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کام نہتے میں ملتی تھی۔ اس نے ایشیہ بھی نہ کیا تھا۔ وہ چہرے کو تھمی۔ خالدہ بچوں کو سلا کر سارہ کی تواضع کے لیے کھانا تیار کر رہی تھیں۔ وہ روزانہ اس کے لیے خصوصی کھانا تیار کرتیں اور سارہ برائے نام کھا کر اٹھ جاتی تھی۔ انہیں اس کی صحت کے لیے تشویش ہوئی تو انہوں نے بیٹی کو محبت بھری ڈانٹ پلائی تھی۔

”اماں مجھے ان شریروں کے ساتھ فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔“ سارہ نے محبت سے سوئے ہوئے بچوں پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے پر مسکا کا نور برس رہا تھا۔

”بیٹا! اماں اپنی صحت کا خیال رکھے گی تو بچے کی صحت بہتر ہوگی نا۔“ خالدہ فوراً منہ بنانے کے لیے بسن پیاز مچن میں لے آئی تھیں۔

”اماں آپ آج تو رمدہ بنارہی ہیں تائیں ڈٹ کے کھانا کھاؤں گی۔“ اس نے محبت دلاؤ سے بچکانہ انداز میں ماں

کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

”اگر نہ کھایا تو میں شام کو تمہارے ساتھ ہی باندھ کے بھیج دوں گی۔“ حیدر نے اسے شام کو لینے آنا تھا۔ وہ مہینہ بھر رہنے کو آئی تھی مگر حیدر کا بچوں کے بغیر بالکل دل نہ لگ رہا تھا۔ وہ شام کو اسے لینے آنے والا تھا۔ خالدہ نے مخصوص مہما بھری دھمکی دی تھی۔ سارہ ہولے سے ہنس دی تھی۔

☆.....☆

”الیاس عمر بے حد ڈشنگ پرسٹائی کا مالک ہے۔ وہ دراز قد ہے اور اس کی آنکھیں تو.....“ ایمان دوروز کی جھمی کے بعد یونیورسٹی آئی تھی۔ اسے ٹلو ہو گیا تھا۔ دادو کی اس میں جان تھی۔ دادو نے اسے نہ آنے دیا۔ وہ یونیورسٹی آئی تو ربیعہ کا الیاس نامہ جاری تھا۔

”ربیعہ پلیز۔“ وہ صبح سے الیاس نامہ سن کر عاجز آ چکی تھی۔ ربیعہ اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قافہ ملانے میں جھمی کہ ایمان نے اکتا کر اسے ٹوکا۔

”وہ آج آیا نہیں ہے اگر تم دیکھو گی تو تمہیں بھی وہ پسند آئے گا۔“ ربیعہ ہر ڈشنگ و ڈینٹ بندے پر مرنے لگی۔ اس کی پسندیدگی محبت یا عشق ناپ کی نہ تھی بلکہ وہ ایسی پسندیدگی ہوتی تھی جیسے ہم فی وی یا فلم کے کسی ایکٹر کو پسند کرتے ہوں۔ ربیعہ کا منہ لٹک گیا۔

”تو آ جاتا، میں بھی تمہارے الیاس عمر کو دیکھ لیتی۔“ وہ دونوں فری ٹائم میں ڈیپارٹمنٹ کے وسیع لان میں بیٹھیں تھیں۔ الیاس نے پہلے دو بیرینڈ نہیں لیے۔ اگلا بیرینڈ سرزیری کا تھا۔ ایمان نے ربیعہ کی مایوس صورت دیکھی تو اس کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ ربیعہ کا سادہ دل ٹوٹ گیا تھا۔

”لو وہ آ گیا۔“ ربیعہ کی نگاہ ایک دم ڈیپارٹمنٹ کے داخلی دروازے سے اندر آتے الیاس عمر پر پڑی تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ ایسے جیسے اپنا گھر نایاب نظر آ گیا تھا۔ ایمان نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو نگاہ پلٹنا بھول گئی۔ وہ ربیعہ کی تعریف سے کہیں بڑھ کر تھا۔ دراز قد، گوری رنگت، کھڑی ناک، کشادہ پیشانی، براؤن چمکدار آنکھیں اور سلیقے سے بنے بال وہ بلاشبہ لاکھوں میں ایک تھا۔ اس کا اٹھتا ہر قدم ایمان کے دل پر پڑ رہا تھا۔ ایمان کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہوئی جارہی تھیں۔ الیاس عمر داخلی راہداری سے ملحقہ برآمدے اور پھر کلاس روم میں جا چکا تھا۔ ایمان کی نگاہیں ہنوز اسی پر جمی تھیں۔ ربیعہ نے شوشی و شرارت سے زوردار ہنکارا بھرا۔ ایمان چونک کر جھل ہو گئی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر فحالت بھری سرخی بکھری تھی۔ ربیعہ کی نگاہوں میں معنی خیزی اتر آئی۔ ایمان بے حد خوددار اور حساس لڑکی تھی۔ اس نے گھبرا کر نظریں چرائیں۔ ربیعہ کے ہونٹوں پر مہم مسکراہٹ بکھری تھی۔

☆.....☆

”حیدر! تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟“ سارہ بچوں کو سلا کر شوہر کے لیے کھانا لے آئی۔ حیدر بے حد کو آ پر یٹو ہر تھا۔ وہ گھر آتا تو سارہ اکثر بچوں میں مگن ہوتی۔ وہ بچوں کی بہترین پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے شہر جانا چاہتی تھی۔

”کون سا وعدہ؟“ حیدر نے بے دھیانی سے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔ وہ سارہ سے کیا وعدہ بکسر بھلا چکا تھا۔

”ہم بچوں کی بہترین پرورش کے لیے شہر جائیں گے۔“ سارہ کی سینیں پلکوں میں پیسے جتنوں کی مانند جھلکنا رہے تھے۔ سنہرے خوابوں کی چمک سے چہرے پر الوہی حسن بکھرا تھا۔ حیدر لمحہ بھر کو مہبوت رہ گیا۔

”ہم ضرور جائیں گے سارہ! مگر ابھی بچے چھوٹے ہیں۔ تم ادھر تنہا ان کی پرورش نہ کر سکو گی۔“ حیدر وعدے سے نہ مکر رہا تھا۔ اسے صرف سارہ کی مشکل کا احساس ستا رہا تھا۔ حیدر کے لہجے میں تسلی تھی۔

”میں سب کرلوں گی۔ ہم بوا اور ابا کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔“ سارہ اپنے خوابوں سے کسی صورت دستبردار نہ ہونا چاہتی تھی۔ اس کے اٹل لہجے نے شوہر کوئی راہ بھائی اگر وہ سب شہر چلے جاتے تو زندگی آسان ہو جاتی اور ان کے نواب بھی ادھورے نہ رہتے۔ سارہ نے دبے جوش سے مشورہ دیا۔

”میں منج اماں اور ابا سے بات کروں گا۔“ حیدر نے محبت سے اسے اپنے بھرپور ساتھ کا یقین دلایا۔ ازدواجی زندگی میں فریقین ایک دوجے کا بھرپور ساتھ نبھائیں تو زندگی میں آسودگی ٹھہر جاتی ہے۔ سارہ مطمئن سی سر ہلاتی حیدر کے لیے چائے بنا کر اٹھ گئی۔



”ایکسکیوز می!“ وہ لائبریری کی میز جھون پر بیٹھی چند اہم نوٹس کے پوائنٹ اپنی فائل میں نوٹ کر رہی تھی۔ ربیعہ نے بونیورسٹی سے چھٹی کی تھی۔ ایمان نے جو کچھ کر سکا اٹھایا۔ بلیک پینٹ اور براؤن شرٹ میں لمبوس الیاس عمر سامنے تھا۔ ایمان کے دل نے اسے سامنے پا کر ایک بیٹ مس کی۔

”جی۔“ وہ ایمان پر نظریں نکالے مخاطب تھا۔ ایمان دل کی منتشر دھڑکنوں کو سنبھالتی دھیمے سے گویا ہوئی۔

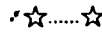
”مجھے سرزیدی کے لیکچر کے نوٹس چاہیے تھے۔ الیاس لیکچر مکمل نوٹ نہ کر پایا تھا۔ ایمان نے سر کے پتھر کے اہم پوائنٹس نوٹ کر لیے تھے۔ الیاس نے بھلتا لیکچر نوٹ کیا تھا اور کچھ پوائنٹس مٹ ہو گئے تھے۔ اس سے اگلی رو میں بیٹھی ایمان مسلسل لیکچر نوٹ کرنے میں مجبوری تھی۔

”شیور۔“ ایمان نے فائل کھول کر پیپر درست کرتے ہوئے اس کی طرف نوٹس بدھائے تھے۔

”تھینک یو۔“ الیاس پیپر تمام کر اس کے برابر تک گیا اور وہ اپنی فائل میں اہم پوائنٹس نوٹ کرنے لگا۔ ایمان کے ہاتھوں سے کلوں کی دلفریب مہک ٹکرائی وہ محسوس اسے بے دھیانی میں یک ٹک ٹکٹے لگی۔ وہ کئی لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن تھا۔ اس کی محرکیت شخصیت مد مقابل کو سراسر کر دیتی تھی۔ دلفنا الیاس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ایمان نے جھل ہو کر نیچا ہونٹ دانٹوں تلے ڈال دیا۔ الیاس کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ کھڑکی وہ رخ موڑ کر نوٹس مکمل کرنے میں مجبوری ہو گیا۔ ایمان چوری چڑے جانے پر دل میں خائف ہونے لگی۔

”سنیں۔“ وہ تیزی سے میز حیاں اترنے لگی تو الیاس نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ وہ لڑکیوں کی نگاہوں میں اپنے لیے واضح ستائش دیکھنے کا عادی تھا۔ ایمان بے حد حسین و ذہین لڑکی تھی۔ اسے ایمان کی توجہ اچھی لگی تھی۔ میز حیاں اترتی ایمان ٹھہر گئی۔

”آپ کے پیپرز۔“ وہ نوٹس مکمل کر چکا تھا۔ اس نے ایمان کے پیپر ز لوٹائے وہ خاموشی سے تمام کر تیزی سے میز حیاں اتر گئی۔ الیاس کے لبوں پر مسکراہٹ ریگ مئی۔



”نہ پتر ہم یہیں ٹھیک جس تم دونوں جاؤ۔“ ابا نے سنا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ محن میں بھی چار پائی پر ابا، اماں اور حیدر بیٹھے تھے۔ ابا تھوڑی دیر قبل کھیتوں سے آئے تھے اور منہ ہاتھ دھو کر چار پائی پر آ بیٹھے تھے۔ اماں بھی ان کے قریب رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ حیدر نے موقع غنیمت جان کر بات چیمپری۔

”تیرا ابا ٹھیک کہتا ہے حیدر! ہم شہر نہیں جائیں گے۔“ اماں بھی ابا کی ہموا تھیں۔

”ابا آپ لوگ بھی ہمارے ساتھ چلتے تو بہتر تھا۔“ حیدر دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا مگر وہ اپنے والدین کو بھی نہ ہموڑنا چاہتا تھا۔

”تو جاہل! ہم تجھے نہیں روکتے۔“ ابانے نرمی بھری آہستگی سے اس کا کندھا دباتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ان کے لہجے میں ٹوٹے کاٹے کی سی چیخیں تھیں۔ وہ ان کی اگلوٹی نرینہ اولاد تھا۔ ان کا سبھی کچھ اس کا تھا۔ وہ بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ حیدر کی دلیل انہی صحیح تھی۔ وہ اسے روکنا نہ چاہتے تھے۔ اماں کے چہرے پر اداسی بکھری۔ ان کے جانے سے گھر میں تنہائی اتر آتی۔

”اماں!“ حیدر سے ماں کا پر ملاں چہرہ نہ دیکھا گیا۔ اس نے محبت سے ان کے گلے میں بانیں ڈال لیں۔

”جیتا رہ میرے لال۔“ بہترین زندگی ہر انسان کا فطری حق ہے۔ وہ اسے روک کر اپنے بچوں کا مستقبل تاریک نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ گاؤں کی محدود زندگی میں ترقی کے چانسز کم تھے۔ انہوں نے محبت سے بیٹے کا ماتھا چوم لیا۔ ان کے دل پر بھاری بوجھ آن کر تھا۔

☆.....☆

دوہ طویل کوریڈر عبور کر کے تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ کلاس روم کے باہر آئرن گرل پر بیٹھے نکاس فیلو سے محو گفتگو الیاں عمر کی نگاہ اس پر پڑی تو پلٹنا بھول گئی۔ وہ پوری نکاس سے منفرد تھی۔ اس ہر طرح اور حسین لڑکیوں سے دوستی تھی۔ وہ لڑکیوں کی نگاہوں میں اپنے لیے سٹش دیکھنے کا عادی تھا۔ وہ خود پسند نہ تھا مگر اسے کسی لڑکی سے محبت نہ ہوئی تھی۔ ایمان میں انجانی کشش تھی جو ہر ملاقات پر الیاں کو اپنی سمت کھینچتی تھی۔ وہ شہر کے معروف صنف کار کا راکھوتا بیٹا تھا۔ اس نے باپ کے لاکھ اصرار پر بھی برنس کے بجائے تعلیم کو ترجیح دی تھی۔ وہ فی الحال برنس کے جینٹل مین نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ عمر احمد اس سے سخت خفا رہتے تھے۔

”الیاں.....“ ایمان کے تعاقب میں نگاہیں گھماتے الیاں کو زید نے ٹوکا۔ وہ چونک کر متوجہ ہوا۔ زید کی کھوجی نظریں ہاسی پر جمی تھیں۔

”تمہارے فادر کا برنس کیسا ہے؟“ الیاں نے لمحہ بھر میں خود کو کمپوز کیا۔ ایمان نکاس میں لیادیا انداز رکھتی تھی۔ دل اس کی عزت کرتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایمان کا نام زبان زد عام ہو۔ اس نے زید کی کھوجی نظروں کا اثر زائل کرنا چاہا۔

”ان کی گارمنٹ فیکٹری ہے۔“ زید اسے اپنے برنس کے متعلق بتانے لگا۔ الیاں اس کی توجہ بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ اپنی بدلی حالت پر خود بھی حیران تھا۔ اسے نہ جانے کب ایمان سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ کھوئے انداز میں بظاہر توجہ سے زید کی باتیں سننے لگا۔

☆.....☆

”ایکسکوز می۔“ ربیعہ کرن کی شادی اینڈنگ کرنے فیصل آباد میں ہوئی تھی۔ اس کی دو روز بعد واپسی تھی۔ ایمان اس کی غیر حاضری میں تمام نوٹس مکمل نوٹ کر رہی تھی۔ ربیعہ اس سے آتے ہی تمام نوٹس باغی اور نامکمل ہونے کی صورت میں اس سے لاتی۔ ایمان کا اس کی فکری انورڈ کرنے کا قطعاً موڈ نہ تھا۔ وہ تندہی سے نوٹس مکمل کر رہی تھی۔ اس روز موسم خاصا خوشگوار تھا۔ ایمان آف پریڈ میں ڈیپارٹمنٹ سے باہر وسیع لان میں پھیلانے ہوئے تھی۔ اس نے سر اٹھایا سانسے الیاں عمر اسے پر شوق نگاہوں سے تکتا رہا تھا۔

”آپ کافی پڑھا کو کتنی ہیں۔“ وہ بے تکلفی سے کہتا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ دل محبوب کی قربت کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ الیاں اسے تلاش کرتا ادھر آیا۔ وہ خاموشی سے نوٹس بنانے لگی۔ اس نے الیاں کا استفہامیہ انداز کبھی نظر انداز کر دیا تھا۔

”ایمان! کیا میں آپ کے متعلق جان سکتا ہوں۔“ وہ گلی پٹی رکھے بغیر صاف گوئی سے مدعا بیان کرنے لگا۔ اسے

ایمان کا لیا دیا انداز بے حد بھایا تھا۔ وہ اس کے سوشل سرکل کی دیگر لڑکیوں سے قطعاً مختلف تھی۔ وہ اپنی فرینڈز یا سوشل سرکل کی کسی لڑکی سے بات کرتا تو وہ اس پر فدا ہو جاتی مگر مد مقابل ایمان عباسی تھی۔ خاور عباسی اور نیلما عباسی کی اکلونی اولاد۔

”سوری الیاس! مجھے ضروری نوٹس بنانے ہیں۔“ ایمان نے دل کے تھانے دباتے ہوئے مصنوعی رکھائی بھرا جواب دیا۔ وہ یونیورسٹی میں کسی قسم کا اسکیڈل انورڈ نہ کر سکتی تھی۔

”ایمان! میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔“ الیاس نے صاف گوئی کی انتہا کرتے ہوئے محبت سے چسکتی نرم نکاہیں اس کے صبح کھڑے پر جمادیں۔

”الیاس پلیز۔“ دل اس کی پر شوق نگاہوں سے پکھلا جا رہا تھا۔ ایمان نے لمبے میں مصنوعی درشتی سوتے ہوئے نکلی سے اسے ڈانٹا تھا۔ اسے کسی کلاس فیلو کے دیکھ لینے کا خوف تھا۔ اسے ریبیک کی شدت سے محسوس ہوئی۔

”آئی لو یو ایمان!“ الیاس نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ایمان نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کی نگاہوں میں واضح بے یقینی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ الیاس اس سے محبت کرتا ہوگا۔ ایمان کو خود پر رشک آیا۔

”الیاس! میں ایسی کوئی محبت انورڈ نہیں کر سکتی ہوں۔ پلیز آپ مجھے آئندہ ڈسٹرب مت کیجیے گا۔“ وہ خود پر نازاں و مسرور تھی۔ اس کی محبت یکطرفہ نہ تھی۔ الیاس بھی اس کے سبک تھا اگر محبت کے سفر میں پسندیدہ مسطر بھی سبک ہو تو زندگی کی راہ مہک اٹھتی ہے مگر اسے اپنی داد کی لاج رکھنا تھی۔ مہارڈیڈی اسے داد کے حوالے کر کے مطمئن تھے۔

”مگر کیوں ایمان! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ اس کے انکار پر تڑپ اٹھا۔ بھلا اس میں کیا کمی تھی کہ کوئی اسے ریجیکٹ کرتا۔

”الیاس میری کچھ مجبوری ہے۔“ ایمان کو گوتھی۔ وہ ایک اجنبی کو کیسے اپنی فیملی پر اہم بتا دیتی۔ اسے اپنے والدین سے شدید محبت تھی۔ وہ اس کی ہر ضرورت و آسائش کا مکمل خیال رکھتے تھے۔

”ایمان! میں اپنے والدین کو آپ کے گھر بھیج دیتا ہوں۔“ وہ ایمان کے گریز کی وجہ کسی حد تک کھوج چکا تھا۔ وہ کسی اسکیڈل کے حق میں نہ تھی۔ الیاس نے سید حاصل پیش کر دیا۔ ایمان کا منہ مارے خیر کے کھلا رہ گیا۔ وہ اتنا فارورڈ ہو گا اسے توقع نہ تھی۔ وہ لمحہ بھر کوچپ ہو گئی۔

”ایمان! مجھے تمہاری عزت بے حد عزیز ہے۔ میں تم پر کوئی حرف نہ آنے دوں گا۔“ الیاس عمر محبت سے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑتے ہوئے اٹھ گیا۔ ایمان دھڑکتے دل سے اس کا نقش پانگتی رہ گئی۔ دل میں الیاس کی محبت مزید گہری ہو گئی تھی۔

”دادو! وہ اپنے گھر والوں کو ہمارے ہاں لانا چاہتا ہے۔“ ایمان اور دادو کی گہری دوستی کسی رازداری کا بار نہ جمیل سکتی تھی۔ اس روز وہ دونوں سونے کے لیے لیٹیں تو ایمان نے ان کے گلے میں بانٹیں ڈالتے ہوئے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ انہوں نے محبت سے ایمان کی پیشانی چومی۔

”ایمان! وہ تجھے بھی پسند ہے نا؟“ دادو بتاتے اس کے دل کا بھید پانگتی تھیں۔

”دادو وہ بہت اچھا ہے۔“ ایمان نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”ایمان بیٹا! اچھا ہونے اور اچھا کہنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ دادو نے پرسوج انداز میں اسے سمجھایا۔

”تم اسے کہو وہ کل ڈنر پر ہمارے ہاں آجائے۔“ دادو نے فیملہ سنا ڈالا۔ وہ الیاس عمر سے ملنا چاہتی تھیں۔ ایمان

کم عمر ونا سمجھتی وہ الیاس سے مل کر اسے جاننا چاہتی تھیں۔  
 ”تھینک یو دادو! میں الیاس سے کہوں گی وہ کل آکر آپ سے مل لے۔“ ایمان کھلکھلا کر ہنس دی۔ دادو نے محبت سے اس کی پیشانی چوم کر آنکھیں موندھ لیں۔ ایمان بھی سونے کی تیاری کرنے لگی۔

☆.....☆

”لو تم اس طرح رو دو گی تو میں پریشان رہوں گا۔“ ماحول بے حد بوجھل تھا۔ وہ شہر جانے کی مکمل تیاری کر چکا تھا۔ اس نے اپنی نوکری اور رہائش کا بندوبست کر لیا تھا۔ بوادو اب اتو بیٹے کی خوشی میں چپ ہو گئے تھے مگر سارہ کے والدین نے بے حد دوا دینا کیا تھا۔ سارہ نے انہیں بے حد مشکل سے منایا تھا۔ ریمانہ آپارات سے اپنے بچوں سمیت آئی ہوئی تھی۔ سارہ کے والدین بھی کچھ دیر قبل بیٹی کو دواغ کرنے آئے تھے۔ اماں کا رورو کر برا حال تھا۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اب بیٹی کو دواغ کر رہی ہیں۔ گلی کے نوجوان تمام ضروری سامان ٹرک پر لا رہے تھے۔ بوادو ابانے دل پر پتھر رکھ کر بیٹے کی خوشی کے لیے اسے جانے کی اجازت دی تھی۔ بوادو گھر کا سونا پن ہولارہا تھا۔ وہ ادھر فرانسیس سے کئی بار رو پچھے تھے۔ حیدر دوستوں کے ساتھ سامان لوڈ کروا رہا تھا۔

”وہ صبح کہہ رہا ہے تم کیوں اسے پریشان کرتی ہو۔“ ابانے حسب عادت بیٹے کی طرف داری کی۔ وہ ہمیشہ حیدر کو ہر معاملے میں سپورٹ کرتے تھے اگر وہ راضی نہ ہوتے تو حیدر بھی شہر نہ جاتا۔ ابانے نہ صرف اسے جانے کی اجازت دی تھی بلکہ انہوں نے اماں کو بھی سمجھا بجا کر منالیا تھا۔

”حیدر بھائی! سامان رکھا جا چکا ہے۔“ بڑی کا چھوٹا بیٹا چلا آیا۔ ماحول پر گھمبیر تابڑھ گئی۔ وقت رخصت تھا۔ حیدر ماں کے گلے لگ گیا۔ بوانے اس کا ہاتھ چوم کر اسے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ وہ باپ اور سر کے ہمراہ گھر سے نکل گیا۔

”سارہ تم بچوں کا مکمل خیال رکھنا۔“ بوادو سے بچوں کے متعلق نصیحتیں کرنے لگیں۔ وہ محبت سے سر ہلاتی سب سے مل کر باہر نکل گئی۔

☆.....☆

”واٹ..... تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟“ ربیعہ فرسٹ کزن کی شادی ایشینڈ کرنے دو بیٹے سے ادا کاڑھ گئی ہوئی تھی۔ اس دوران ایمان اور الیاس میں کافی انڈراشینڈنگ ہو گئی تھی۔ دادو الیاس سے ملنا چاہتی تھیں مگر وہ پہلے اپنے گھر میں ایمان کے لیے راہ ہموار کرنا چاہتا تھا۔ سو اس نے چند روز کی مہلت لی تھی۔ ربیعہ واپس لوٹی تو بدلی بدلی ایمان نے اسے چونکایا تھا۔ اس نے ایمان کو آڑے ہاتھوں گھیرا تو اس نے اعتراف محبت کر لیا۔ ایمان کے لیوں پر دھیمی مسکراہٹ نکری تھی۔ ربیعہ خاصی ایکسائینڈگ رہی تھی۔ اس نے فوراً محبت بھرا شکوہ کیا۔ وہ دونوں ہمیشہ ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرتی تھیں۔

”تم یہاں تھیں کب؟“ ایمان نے نرمی سے اس کا شکوہ دور کرنا چاہتا تھا۔ ربیعہ ہنس دی۔

”دادو کا کیا رد عمل تھا؟“ ربیعہ کو ساری صورتحال جاننے کی بے چینی لگی تھی۔ دفعتاً اسے دادو کا خیال آیا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ پائی تھی۔ اس کے لیوں پر شریر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”وہ الیاس سے ملنے پر راضی ہیں۔“ ایمان نے گھر سے خوش کن تصور میں گھر کر جواب دیا۔ دادو اس کا سب سے اہم ووٹ تھیں اگر وہ راضی ہو جاتیں تو پھر مہیا اور ماما بھی انکار نہ کر پاتے۔

”چلو سر شاہ کا پریڈ اشارٹ ہونے والا ہے۔“ ایمان نے اپنی باتوں پر سرد خنثی ربیعہ کو یاد دلایا۔

☆.....☆

سارہ نے حیدر کے سامنے دو روز پہلے کی کچی دال لا کر رکھی۔ شہر آئے چھ ماہ سے زائد ہو چکے تھے وہ اس دوران دو بار گاؤں کا چکر لگا آئے تھے۔ بو اور فحاشی خود کو سنبھال چکی تھیں اور وہ ان کے آنے پر اس بھی نہ ہوتی تھیں۔ حیدر کو ابھی تک کوئی ڈھنگ کی جاب نہ ملی تھی۔ سارہ اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے حیدر کو کبھی بے جا فرمائشیں کر کے تنگ نہ کیا تھا۔ وہ دو روز کا اکٹھا سالن پکالتی اور حیدر کو دہشتی ٹینشن سے محفوظ رکھتی۔ وہ جانتی تھی کہ حیدر پریشان رہتا ہے بھر وہ کیوں خواہ مخواہ ٹینس کرتی۔ اس کے سامنے بیٹھی نوالہ توڑتی سارہ کا ہاتھ لے کر بھر کر رک گیا۔

”گھر میں یہ ہی تھی حیدر۔“ سارہ کے لبوں سے دہشتی سی سرسراہٹ بھرنا انداز میں نکلی جیسے اسی کا تصور ہو وہ بچوں سمیت محدود آمدنی میں بمشکل مہینہ بھر گزار کر پانی تھی۔ حیدر کے دوست نے انہیں رہائش کے لیے اپنا کوارٹرز فری دے رکھا تھا۔

”سارہ میرا یہ مطلب نہ تھا۔“ وہ دو روز سے دال کھا رہا تھا۔ آج اس کا موڈ دو روز کی باسی دال کھانے کا نہ تھا۔ سارہ کے چہرے پر تاسف کے سائے گھرے تھے۔ حیدر پشیمان ہو گیا۔ اس نے نرمی سے بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔

”سارہ تجھیں یہاں تنگی کا سامنا ہے نا۔ مجھے کوئی ڈھنگ کی نوکری ہی نہیں مل رہی ہے۔“ نازوں پٹی اکٹوئی اولاد تھی۔ حیدر کو گھرے ملال نے گھیر لیا۔

”حیدر! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ میری اپنی چوائس ہے۔“ یہ زندگی سارہ کی اپنی خواہش تھی۔ بھلا حیدر جیسا میٹرک پاس نوجوان کیسے آسانی سے شہر میں سروائیو کر پاتا۔ اس نے دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر سجا کر شوہر کا ملال کم کرنا چاہا تھا۔ وہ دونوں اپنی مشکلات سے گھبرا جاتے تو ان کے بچوں کو روٹن مستقبل کیسے ملتا۔

”سارہ! تم میری اچھی جاب کی دعا کیا کرو۔“ حیدر کا دل سنبھل نہ پا رہا تھا۔ وہ دونوں ہی ایسی مشکل زندگی کے مادی نہ تھے۔

”انشاء اللہ! اللہ آسانی پیدا کرے گا۔“ سارا کوئی گلہ شکوہ کیے بغیر وفا شعار بیوی کی مانند شوہر کی دل جوئی کر رہی تھی۔

☆.....☆

”پاپا! مجھے شادی کرنی ہے۔“ ڈنر پر ڈائنگ ٹیبل پر تینوں نفوس خاموشی سے ڈنر میں مگن تھے۔ الیاس نے ٹیبل پر گویا دھماکا کر ڈالا۔ عمر کا منہ تک جاتا تھا جہاں کا تھاں ساکت رہ گیا۔

”واٹ.....“ الیاس فطرتاً ہی فطرت تھا۔ اس کے حلقہ احباب میں بیشتر لڑکیاں تھیں۔ وہ آئے روز گرل فرینڈ چنج کرتا رہتا تھا۔ انہیں بیٹے کے طرز زندگی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ انہوں نے بیٹے کو ہر طرح کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ عمر صاحب کو خاصا دھچکا لگا تھا۔ ان کی بے جا ڈھیل کا یہ مطلب ہر گز نہ تھا کہ وہ اسے پسند کی شادی کی اجازت دے دیتے۔ وہ نہ جانے کس خاندان کی لڑکی اٹھا لاتا۔

”تم کل سے اسٹڈی چھوڑ کر آفس آؤ۔“ وہ اگلے پل غصے پر قابو پا کر روائتی دولت مند کا روپ دھار چکے تھے۔

”پاپا پلیز!“ الیاس باپ کے قطعیٹے بھرے رویے سے آگاہ تھا۔ ان کے سختی فیصلے کے سامنے تو فریج بھی نہ ٹھہر پاتی تھیں تو وہ کیا چیز تھا اس نے لجاجت سے باپ کو نرم کرنا چاہا۔

”میں اسی دن سے ڈرتا تھا۔ میں نے اسے اس کی مرضی کی زندگی جینے دی۔ یہ میری غلطی تھی۔ اسے یونیورسٹی کی بجائے آفس میں ساتھ لے گیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“ فریج خاموشی سامع بنی ڈنر میں لاقعلقی سے بچتھیں۔ وہ

باپ بیٹے کی آئے روز کی نوک جھونک کی عادی تھیں۔

”پاپا! میں آفس آکر آپ کی دولت بڑھانے کا سوچ رہا ہوں مگر میں یہ کام ایسے ہی کر دوں تو.....“ الیاس باپ کی لالچی فطرت سے آگاہ تھا اس نے مہارت سے باپ کی دھمکی رگ پر ہاتھ رکھا۔ اس کی بھلے کنی لڑکیوں سے دوستی تھی اور وہ فطرتاً ہی جانی تھا مگر اس نے ایمان کو سچے دل اور خلوص سے چاہا تھا۔ وہ اس سے ہر صورت شادی کرنا چاہتا تھا۔

”وہ کیسے؟“ عمر صاحب حسب توقع چپک اٹھے۔ فریڈ بھی ڈنر بھلائے اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ بھی بیٹے کی بات پر دل میں اس سے خفا تھیں انہوں نے اس کے لیے اپنے سوشل سرکل میں کئی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں۔ الیاس نے ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر کر انہیں کئی خدشات کا شکار کر دیا تھا۔ ان دونوں کی استغناء یہ نگاہیں بیٹے پر لگی تھیں۔

”پاپا! مجھے ایمان عباسی سے شادی کرنی ہے۔ خاور عباسی اور نیلما عباسی کی اکلوتی اولاد سے۔“ الیاس نے آہستگی سے کہتے ہوئے باری باری ان دونوں کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔

”کیا!.....!“ فریڈ عمر کی چپکار نکمیری۔ ان دونوں سے سارا شہر واقف تھا۔ وہ ان کے ہم پلہ دہم جوڑتے۔ خاور عباسی کا بزنس بیرون ملک پھیلا ہوا تھا۔ وہ امارت میں ان سے کم نہ تھے۔ نیلما ایک مقامی این جی او کی صدر اور ملک کی معروف پالیٹکس پارٹی کی مقامی دوہین دنگ کی چیئر پرسن تھیں۔ فریڈ نے اپنے سوشل رابطہ جڑھانے کے لیے ان سے تعلقات استوار کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ تاحال ناکام تھیں۔ نیلما کا حلقہ احباب محدود تھا اور وہ صرف انہی پر اعتماد کرتی تھیں۔

”دوایہ میرے بیٹے تو نے جی خوش کر دیا۔“ عمر کو بے ساختہ بیٹے پر ٹوٹ کر پیرا آیا تھا۔ خاور عباسی سے رشتے داری ان کے بزنس کو بلندی پر پہنچا دیتی۔

”پاپا! مجھے کل ایمان کی دادو سے ملنے کی تیاری کرنی ہے۔“ وہ حصول مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ وہ اگلے روز ہی ایمان کی دادو سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے ابھی ایمان کو فون پر اطلاع دینا تھی وہ اٹھ گیا۔

”ایزیووش سو“ عمر کے لہجے میں شیرینی گھل گئی تھی۔ کچھ دیر قبل کی گئی ماحول سے چھٹ گئی تھی۔ عمر اپنے بزنس جب کہ فریڈ اپنے سوشل کامیالٹس بڑھانے کے خوش کن خواب دیکھنے لگیں۔

☆.....☆

”ہوں تم ہو الیاس عمر۔“ وہ دو روز بعد زینت عباسی کے رو برو تھا۔ دادو نے ربیعہ اور ایمان کا سختی سے اندر داخلہ منع کر رکھا تھا۔ ربیعہ یونیورسٹی سے واپسی پر ایمان کے ساتھ ہی آگئی تھی اور اسے دادو اور ایمان دونوں نے گھر ڈراپ بھی کرنا تھا۔ دادو نے سرتاپا اسے سخت جانچنی نگاہوں سے گھورنے کے بعد پرسوج بنکارا بھرا تھا۔ الیاس ان کی سخت تنقیدی نگاہوں سے پرل ہوا جابا رہا تھا۔ اس نے خاموشی پکا کٹھا کرتے ہوئے عجب ہوتی ہیں سے زور سے سرشات میں ہلایا۔

”تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟“ دادو باقاعدہ انٹرویو کا آغاز کر چکی تھیں۔ انہوں نے فوراً اگلا سوال داغا۔ دروازے کی اوٹ سے جھانکنی ایمان اور ربیعہ کبھی دادو اور کبھی الیاس کو گھور رہی تھیں۔

”وہ بزنس میں ہیں۔“ الیاس کی کھوٹی خود اعتمادی رفتہ رفتہ بحال ہونے لگی تھی۔

”تم اپنے متعلق کچھ بتاؤ۔“ دادو اسے کوئی رعایت دینے پر ہرگز تیار نہ تھیں۔ وہ اسے اچھی طرح جانچنا چاہتی تھیں۔

”تمہارے نزدیک محبت کیا ہے الیاس۔“ وہ دادو کو مکمل قائل کرنے کے لیے تفصیلاً انہیں آگاہ کر رہا تھا کہ زینت عباسی نے اسے دفعتاً مخاطب کیا۔ الیاس کا غیر متوقع سوال پر منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ ان سے اس سوال کی قطعاً امید نہ رکھتا تھا۔



”دادو! محبت نازک اور پاکیزہ جذبہ ہے۔ محبت انسان کے اندر کی خفیہ کونزی میں ڈھال کر اس کے وجود کو نرم مٹی سا بنا دیتی ہے۔“ الیاس نے سنبھل کر ٹھہرے لہجے میں جواب دیا تھا۔ دراصل دادو کی جہاندیدہ نگاہیں اس کے اندر چھپے ہر جانی مرد کو پہچان گئی تھیں۔ ایمان حساس دل کی مالک خود ارٹو کی تھی وہ نہ چاہتی تھیں کہ ایمان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے انہوں نے تاک کر رشتہ لگایا تھا۔

”الیاس! تمہارا فیوچر پلان کیا ہے؟“ دادو کو اسے جتنا جانا تھا وہ جان چکی تھی۔ وہ سوال برائے سوال پر اتر آئیں۔ ربیعہ اور ایمان کی دروازے سے چپکے چپکے ٹانگیں سوکھ گئی تھیں۔ گویا دادو کو ان دونوں کی حالت پر ترس آ گیا تھا۔

”دادو میں پاپا کا پرنس سنبھالوں گا اور.....“ الیاس انہیں فوج پلاننگ بتانے لگا۔ دادو کا دور رس ذہن گہری سوچ میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ اس کی باتوں پر گام ہے بگا ہے سر ہلا رہی تھیں۔

☆.....☆

”دادو! میں الیاس کے بغیر نہیں جی سکتی۔“ وہ ربیعہ کو ڈراپ کر کے گھر آ چکی تھیں۔ دادو خلاف معمول کچھ چپ تھیں۔ ان کی خاموشی نے ایمان کو الجھا دیا تھا۔ وہ ان کی طرف سے بھرپور تبصرہ کی امید کر رہی تھی اور دادو نے کچھ نہ کہنے کی جیسے قسم کھا رکھی تھی۔ ایمان نے دے دیے نظروں الیاس کا ذکر چھیڑا مگر وہ سنی ان کی کرشمیں۔ وہ فی الحال اس موضوع پر کوئی بات کرنے کے موڈ میں نہیں۔ وہ سونے کے لیے لیٹیں تو ایمان نے نرمی سے ان کے ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

”وہ ہر جانی مرد ہے ایمان۔“ دادو دکھ سے تڑپ اٹھیں انہیں الیاس کی یہی خامی بری طرح ڈس رہی تھی۔

”وہ مجھ سے محبت کرتا ہے دادو!“ ایمان نے تڑپ کر اس کی طرف اشاری کی۔

”میں محبت نہیں بے وفا کی بات کر رہی ہوں ایمان۔“ دادو نے اس کے ہاتھ نرمی سے تھام کر اسے سمجھانا چاہا تھا۔

”وہ مجھ سے شادی کرے گا۔“ ایمان نے چند روز کی محبت کی خاطر ان کی برسوں پرانی محبت فراموش کر دی۔ وہ اس کی وکالت میں جرح پر اتر آئی۔

”ہر جانی مرد عورت سے کبھی وفا نہیں کرتا۔ وہ اس سے شادی کر بھی لے تو اسے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر دھوکا ضرور دیتا ہے۔“ دادو نے اسے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ایمان کی آنکھوں میں جھپسی محبت و بغاوت نے انہیں سمجھا دیا تھا۔ محبت ہی تو انسان کو باغی بنا کر خود سری پراکساتی ہے۔

”دادو پلیز! وہ ایسا نہیں ہے۔“ ایمان کی آنکھوں پر بندھی محبت کی پٹی نے اسے الیاس کے باطن میں جھانکنے ہی نہ دیا تھا۔ وہ الیاس کی لڑکیوں سے دوستی سے آگاہ تھی مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس نے محبت صرف ایمان سے کی تھی۔

”ایمان! مجھے تمہاری خوشیوں کو نظر نگ جانے کا خوف ہے۔“ دادو چاہ کر بھی اسے نہ سمجھا رہی تھیں۔

”مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔“ ایمان کا لہجہ بھرا گیا۔ الیاس سے جدائی کا تصور ہی اتنا ہولناک تھا کہ وہ دھکی ہو گئی تھی۔ دادو ساکت رہ گئیں۔ ان کی ہر دلیل اور ہر منطق نے چپ سا دھل چکی تھی۔ انہیں الیاس کی ظاہری شخصیت بے حد پسند آتی تھی مگر وہ پوتی کی دائمی خوشیاں چاہتی تھیں۔ انہوں نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ آس و زاس میں گہری ایمان کی نگاہیں ان ہی پر جمی تھیں۔

”اللہ تمہیں کبھی کسی آزمائش میں نہ ڈالے بیٹا۔“ ایمان نے محبت پانے کے لیے جذباتیت میں جوابات کہی تھی دادو

کا دل سن کر دہل گیا تھا۔ وہ بالآخر رضامند ہوئی گئیں۔ انہوں نے صدق دل سے اسے دعائیں دیتے ہوئے اس کے ماتھے پر شفقت بھرا ہوا سو دیا۔  
 ”جھینک یو سوچ دادو!“ ایمان مارے خوشی کے ان کے گلے لگ گئی۔

☆.....☆

”سارہ سارہ کدھر ہو یار۔“ بچے بڑے ہو رہے تھے۔ انہیں اسکول میں تو داخل نہ کر دیا گیا تھا مگر سارہ انہیں گھر پر ابتدائی قاعدہ پڑھاتی تھی وہ دونوں کو قاعدہ پڑھا رہی تھی کہ حیدر خوشی سے اسے پکارتا منٹائی کا ڈبہ لیے گھر داخل ہوا تھا۔  
 ”یہ کس خوشی میں ہے۔“ اس نے ڈبہ سارہ کو تھمایا تو سارہ نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔  
 ”مجھے کچی نوکری مل گئی ہے۔ آٹھ ہزار تنخواہ ہوگی۔ اس میں ترقی کے کافی چانسز ہیں۔“ حیدر نے خوشی سے بتایا۔  
 اسے دوست کے توسط سے نوکری ملی تھی۔ اس میں ترقی کے کافی چانسز تھے اور مالک بھی کافی نرم اور مہربان شخصیت کا مالک تھا۔ حیدر ان سے بے حد متاثر ہوا تھا۔  
 ”تمہیں بہت مبارک ہو۔“ سارہ نے ڈبہ کھول کر منٹائی کا ٹکڑا اٹھا کر حیدر کے منہ میں ڈالا۔ وہ بے حد خوش تھی۔  
 ”میں بچوں کو جلد کسی اسکول میں داخل کر دوادوں گا۔“ حیدر کی آنکھوں میں سینے سے بچے تھے۔ سارہ نے ہولے سے سر ہلا کر شوہر کی تائید کی۔ وہ بھی بچوں کے خوشگوار اور کامیاب مستقبل کے خواب بننے لگی تھی۔

☆.....☆

تقریب میں سارا شہر اُٹھ آیا تھا۔ خاور عباسی اور نیلما عباسی نے بیٹی کی شادی میں شہر کے روساء سمیت دوست و احباب کو مدعو کر رکھا تھا۔ دادو نے بہو اور بیٹے کو منایا تھا چونکہ رشتہ ان کے ہم پلہ تھا سو انہیں زیادہ تک دود نہ کرنا پڑی تھی۔ عمر اور فریج نے بیٹے کی زبانی بات طے کر کے جلد شادی کا مطالبہ کر ڈالا۔ بارات کا شایان شان استقبال کیا گیا تھا۔  
 خاور نے بیٹی کو جہیز میں محل جیسا بنگلہ اور شاندار نگہبانی گاڑی بھی دی تھی۔ ان کی تمام جائیداد ایمان کی ہی تھی۔ انہوں نے دیگر پر اپنی اور بزنس شیئر بھی ایمان کے نام کر دے تھے۔ عمو کو بیٹے پر پہلی بار نوٹس کر پیا رہا تھا۔ اس نے بہت اونچا ہاتھ مارا تھا۔ ان کا بزنس بام عروج تک پہنچ جاتا تھا۔ ایمان کو رخصت ہو کر عمو ولاء کی بجائے ”ایمان لاج“ جانا تھا۔ الیاس کے والدین کو قطعاً کوئی اعتراض نہ تھا۔ آخر الیاس نے انہی کی اولاد دے رہا تھا۔ خواہ وہ ان کے ساتھ رہتا یا الگ۔

”فریج میں آج بہت خوش ہوں۔ مجھے الیاس پر فخر ہے۔“ عمر گاڑی خود ڈرائیو کر رہے تھے۔  
 ”وہ بہت جینٹل ہے۔“ فریج نے گردن تان کر جواب دیا ان کے چہرے پر مفرد مسکراہٹ پھیلی تھی۔  
 ”تم خوش تو ہونا ایمان؟“ ویسے سے اگلے روز ہی دعوتوں کا نہ تھمنے والا طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان کی دن میں دو تین جگہ دعوت ہوتی۔ مصروفیت کی طویل گھڑیوں میں ایمان کو میکے آنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ اس روز شادی کے بعد پہلی بار میکے آئی تھی۔ دادو نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا۔ وہ ان کی گود میں سر رکھے بیٹھی تھی۔ دادو نے اس کے سر پہلاتے ہوئے محبت بھری تشویش سے استفسار کیا۔

”آف کورس دادو! الیاس بہت اچھا ہے۔“ ایمان نے خوشی سے چپکتے ہوئے بتایا۔ الیاس بے حد لوگ اور کیئرنگ تھا۔ وہ اس کا بے حد خیال رکھتا۔ وقت الیاس کی محبت بھری سنگت میں بے حد حسین و خوشگوار گزر رہا تھا۔ ایمان الیاس کی محبت بھری سنگت میں بے حد خوش تھی۔ وہ شادی کے بعد بہت بدل گئی تھی۔ اس کے لبوں پر ہمہ وقت مسکراہٹ کھلتی

رہتی اور یہ الیاس کی محبت کی دین تھی۔ دادو نے محبت سے اس کا ہاتھ چوم لیا تھا۔  
 ”دادو! آپ خواہ مخواہ ڈری ہوئی ہیں۔ وہ مجھ سے بے وفائی نہیں کرے گا۔“ ایمان کے لہجے میں اندھا اعتماد تھا۔  
 ہراز دواجی رشتہ اعتماد محبت کی بنیاد سے مضبوط ہوتا ہے اگر محبت کی جڑ میں نرمی و لگاؤ نہ ہو تو محبت کا پودا سوکھ جاتا ہے۔  
 ایمان اور الیاس کی محبت ہرگز روتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔  
 ”ایمان! میں آج بھی تمہاری بہترین دوست ہوں اگر وہ تمہیں ستائے تو مجھے فوراً بتانا میں اس کے کان کھینچوں گی۔“ دادو نے محبت بھری شیریں نظروں سے ایمان کے محبت سے چمکتے چہرے پر نظریں جمائیں۔  
 ”آف کورس دادو! ان دونوں کی دوستی و محبت رواجی نظروں یا جذموں سے ہٹ کر تھی  
 ”دادو! میں خوش ہوں۔“ ایمان کو ان کے اندر چھپے انجانے خوف کا ادراک ہوا تو اس نے انہیں بھرپور یقین دلایا۔  
 دادو نے ہنستے ہوئے سر اثبات میں بلا دیا تھا۔

”اچھا یہ بتائیں، ربیعہ آپ کو فون کرتی ہے؟“ ربیعہ سے اس کی روزانہ بات ہوتی تھی۔ اس کی اگلے ہفتے منگنی تھی مگر اس کا جانا مشکل تھا۔ ان کی دعوتیں ہی ختم نہ ہو رہی تھیں۔ ایمان نے موضوع گفتگو بدل دیا۔  
 ”ہاں ہر دوسرے تیسرے روز اس کا فون آ جاتا ہے۔“ دادو اسے بتانے لگیں ان کا ربیعہ سے رابطہ تھا۔  
 ”دادو اس کی اگلے ہفتے منگنی ہے۔ آپ ضرور جائیے گا۔“ ایمان انہیں ربیعہ کی منگنی کا بتاتے ہوئے تاکید کرنے لگی۔ وہ توجہ سے اس کی بات سننے لگیں۔

☆.....☆

”ایمان! میری ماما اور پاپا فطرتاً مادیت پرست ہیں اور ہماری شادی بھی اسی بناء پر ممکن ہوئی ہے۔“ الیاس نے ظہیر ظہیر کر اسے ساری بات بتادی تھی۔ وہ جوں جوں بات مکمل کر رہا تھا۔ ایمان کے چہرے پر تشویش کم ہوتی جا رہی تھی۔  
 ”الیاس یو آر سو پیٹ۔“ وہ اپنے والدین کے بالکل برعکس تھا۔ ایمان کے لیے یہ ہی کافی تھا۔ ان دونوں کی محبت میں دولت حائل نہ ہوئی تھی۔ خلوص سے جڑے رشتے دلوں میں ایک دوسرے کی قدر بڑھا دیتے ہیں۔ ایمان کے دل میں الیاس کی محبت مزید گہری ہو گئی تھی۔ وہ مارے محبت کے اس سے لپٹ گئی۔  
 ”ایمان تم بھی میری محبت و خلوص پر شک مت کرنا ورنہ میں مر جاؤں گا۔“ الیاس نے اسے اپنی بانہوں میں بھر کر محبت سے اس کے بالوں پر اپنا گال رگڑا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کل کو ایمان کو یہ بات کسی اور رنگ میں پتا چلتی اور وہ اس سے بدظن ہوتی۔

”الیاس! مجھے تمہاری محبت پر فخر ہے۔“ ایمان خود کو معتبر اور خوش قسمت سمجھ رہی تھی۔ الیاس نے اس پر اعتماد کیا تھا اسے پورا مان بخشا تھا۔ وہ اس کا مان کیونکر توڑتی۔ اس کی محبت الیاس کی بے پناہ محبت پر خوشی سے چمک اٹھی تھیں۔  
 ”تھینک یو سوچ ایمان۔“ محبت میں مان دینا اور نبھانا محبت کو معتبر کرتا ہے۔ ایمان نے اس کا مان نہ توڑا تھا۔ وہ اس کی محبت پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔ اس کے لیے یہ زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ الیاس کا لہجہ محبت سے پور تھا۔  
 نیچے پھیلے تاجد نگاہ بزنے کی ہریالی مزید بڑھ گئی تھی۔

☆.....☆

”حیدر اہل بچوں کی اسکول فیس جمع کروانے کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔“ دونوں بچوں کو شہر کے اچھے اسکول میں داخل کروایا گیا تھا۔ حیدر نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر بچوں کے تعلیمی اخراجات اٹھائے تھے۔ اس نے کچی نوکری ملتے ہی فرم میں ڈبل شفٹ شروع کر دی تھی۔ اس کی تنخواہ ڈبل ہونے کے ساتھ اس کا پانس بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ صبح کا گیارہ

گئے مگر لوٹا تھا۔

”تم کل کمیٹی کے پیسوں سے بینک میں فیس جمع کروادینا۔ میں شام کو تنخواہ لینا آؤں گا۔“ حیدر کو تنخواہ ملنے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ حیدر نے اسے بروقت فیس جمع کروانے کی تاکید کی تاکہ وہ جرمانے سے بچ سکے۔

”حیدر! تم کتنا تھک جاتے ہو۔“ وہ اپنی استقامت و ہمت بڑھ کر محنت کر رہا تھا۔ وہ گاؤں میں بابا کے ساتھ کام کرتا تھا۔ بابا اس کا کھیتوں میں مکمل ہاتھ بٹاتے تھے جب کہ وہ یہاں اکیلا تھا۔ اس نے بوا اور بابا سے شہر آنے کو کہا تھا مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ حیدر نے انہیں زمینیں بیچنے کا مشورہ دیا تھا تاکہ وہ سب شہر میں اکٹھے رہ سکیں۔ اسے بوا اور بابا کی بے حد فکر رہتی تھی۔ فرحانہ کے بھی دو تین رشتے آئے ہوئے تھے۔ بابا جلد ہی ایک رشتہ فاعل کرنے والے تھے۔ لڑکا برادری کا تھا اور لی اسے کے بعد شہر کی ایک مشہور فرم میں معقول جاب کر رہا تھا۔ وہ بیاہ کر شہر آ جاتی۔ حیدر والدین کو بھی ساتھ لانا چاہتا تھا مگر ان کی نہ ہاں میں نہیں بدل رہی تھی۔ سارہ کو اس کے خوب رو چہرے پر پھیلی تھکاوٹ نے ناول کر دیا۔ اس کے لہجے میں تاسف بھری ہمدردی سمٹ آئی تھی۔

”میں یہ سب تم لوگوں کے سکھ کے لیے ہی تو کر رہا ہوں جھلی۔“ حیدر نے محبت سے اسے سینے سے لگا لیا۔ سارہ نے طویل سانس کھینچتے ہوئے اس کے سینے سے سر نکا دیا۔ ان کے دکھ سکھ سناجھے تھے۔ اسے حیدر کا بھرپور ساتھ دینا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہر قدم پر تھی۔

☆.....☆

”ایمان! اگر تم اسٹڈی کمیٹی کرنا چاہتی ہو تو تم یونیورسٹی جوائن کر سکتی ہو۔“ وہ دونوں فارن ٹرپ سے لوٹ آئے تھے۔ ان کی دعوتوں کا سلسلہ بھی ختم چکا تھا۔ وہ وطن لوٹنے کے بعد بزنس سنبھال چکا تھا۔ وہ آفس کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی ٹیبل پر آیا تو ایمان اسی کی خنجر تھی۔ الیاس نے ایمان کی تنہائی کا خیال آتے ہی اسے اجازت دی۔

”نہیں میرا مزید پڑھنے کا موڈ نہیں ہے۔ ایمان رفتہ رفتہ روٹین لائف میں سیٹ ہو رہی تھی۔ اس کا پڑھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ خاصا معروف وقت گزارتی تھی۔ داد بھی گا ہے بگا ہے رہنے کے لیے آ جاتیں۔ ایمان نے صاف انکار کر دیا۔

”او کے ایز بوٹ۔“ الیاس اسے فورس نہ کر رہا تھا۔ وہ محض اس کی تنہائی بانٹنے کے خیال سے اسے مشورہ دے رہا تھا۔ اس نے مصروفیت بھری رضامندی سے کندھے اچکاتے ہوئے توس کا گلوا منہ میں ڈالا تھا۔

”ایمان! مجھے شام کو دیر ہو جائے گی۔“ الیاس کو آفس میں امپورٹنٹ میٹنگ اینڈ کرنا تھی۔ وہ بجلت ناشتہ ختم کر کے کوٹ پہنتا باہر کی طرف لڑکا۔

”آپ واپسی پر داد کو لیتے آئیے گا۔“ ایمان اسے پورچ تک چھوڑنے آئی تھی۔ اس نے الیاس کو تاکید کی۔ وہ دو روز میں ہی دادو کے بغیر اداس ہوگئی تھی۔ الیاس اپنے نئے بزنس میں کافی بڑی رہتا تھا اور ہر دوسرے روز اسے آفس سے واپسی پر دیر ہو جاتی تھی۔ دادو کے آنے سے اس کی تنہائی ختم ہو جاتی۔

”جو حکم بیٹم صاحبہ کا۔“ الیاس نے ڈائریجکٹ سیٹ سنبھالتے ہوئے سر کو ہلکا سا خم دیا۔ ایمان کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ رہی مگر الیاس کو گاڑی باہر نکالتے دیکھنے لگی اور گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی پلٹ گئی تھی۔

☆.....☆

”حیدر! میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔“ انہیں شہر آئے پانچ سال سے زائد ہو گئے تھے۔ انہیں حیدر کے دوست نے دیا ہوا رہائش کے لیے گھر واپس لے لیا تھا۔ اس کی ٹیلی ویژن ملک سٹیل ہو رہی تھی اور وہ اپنی تمام پر اپنی بیچ کر جا رہے

تھے۔ حیدر کو گھر ڈھونڈنے اور کرائے کی نگر تھی۔ حالات بہتر جا رہے تھے مگر اب گھر کے کرائے کے لیے رقم برہینہ نکالنا دو بھر ہو چکا تھا۔ بچوں کی ماہانہ فیس ہزاروں میں تھی۔ وہ انہیں کسی معمولی اسکول میں داخل نہ کروانا چاہتا تھا۔ وہ ان کے بہتر مستقبل کے لیے ہی تو شہر آئے تھے۔ حیدر کا بیٹا پریشان رہنے لگا تھا۔ سارہ نے شوہر کی پریشانی کا حل ڈھونڈ لیا تھا۔

”نہیں تم کہاں کرو گی جاب۔ میں خود کچھ کر لوں گا۔“ حیدر کو یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ سارہ مشقت کا بوجھ اٹھائے۔ اس نے نازک اندام سارہ کو محبت سے دیکھتے ہوئے صاف انکار کیا۔ وہ شادی کے آٹھ نو سال بعد بھی نہ بدلی تھی۔ ان دونوں کی محبت گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔

”حیدر! میں اکیلی بور ہوتی ہوں اور یوں تمہاری ہیلپ بھی ہو جائے گی۔“ سارہ لاڈ سے ہنسی۔

”سارہ تم.....!“ حیدر کا دل نہ مان رہا تھا۔

”پلیز حیدر!“ سارہ جس فیصلے پر ڈٹ جاتی تو وہ پیچھے نہ ہٹتی تھی اس نے منت بھرے انداز میں اس کے بازو پر اپنا نرم ہاتھ رکھا۔

”تم کہاں جاب کرو گی؟“ وہ ذرا ڈھٹلا پڑا تھا۔

”میں نے اخبار میں ایک ویکلنیسی دیکھی ہے۔“ سارہ روزانہ پڑوس سے اخبار منگوا کر جاب کا ایڈ ویکمیتی تھی۔ وہ تفصیلاً حیدر کو بتانے لگی۔

”مگر سیکریٹری کو ہائی ایجوکیشن بھی ہونا چاہیے۔“ حیدر کو اس کی تعلیمی قابلیت کا خیال آیا اس نے دھیسے سے سارہ کو احساس دلایا۔ وہ خوش شکل اور خوش لباس و خوش گفتار تھی مگر بھلا محض میٹرک پاس کو کون سیکریٹری رکھتا۔ جب کہ فرم بھی نئی کھلی تھی۔

”حیدر! اثراتی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے نا۔ خوش گفتاری کم تعلیمی قابلیت کا عیب چھپا لیتی ہے۔“ وہ پکا تہیہ کر چکی تھی۔ اس نے شوہر کو مضبوط دلیل دی۔

”اچھا جیسے تمہاری مرضی۔“ یہ حیدر کا مخصوص انداز تھا۔ وہ کبھی اس سے بحث میں جیت پایا تھا جو آج وہ جیت جاتا۔ اس نے ہار مانتے ہوئے مسکرا کر دونوں ہاتھ سارہ کے سامنے جوڑے۔

”تھینک یو سوچ حیدر۔“ سارہ نے جواباً خوش دلی سے کہا۔

☆.....☆

”مس سارہ حیدر۔“ الیاس نے سارہ کی مختصر سی دی کو اچھی سے دیکھ کر فائل بند کرتے ہوئے سر تاپا سامنے بیٹھی سارہ کو بغور دیکھا۔ گوری رنگت، دراز قد، ہلکے سے سجے بال، خوش لباس اور خوش گفتار سارہ جیسی لڑکی یقیناً سیکریٹری کی تمام خوبیوں پر پورا اترتی تھی مگر اس کی تعلیمی قابلیت نے الیاس کو سوچ میں ڈال دیا تھا اگر وہ گریجویٹ بھی ہوتی تو حسن پرست الیاس اسے ہی سیکریٹری رکھتا۔

”جی سر!“ اس کے لہجے کا واضح تحیر محسوس کر کے بھی سارہ کا لہجہ سادہ و پراعتاد تھا۔

”آپ محض میٹرک پاس ہیں جب کہ ہماری ریکروائٹمنٹ کم از کم گریجویٹ ہے۔“ الیاس اس کے لہجے سے متاثر ہو کر نرمی سے گویا ہوا۔ نہ جانے اس لڑکی میں ایسا کیا تھا کہ وہ اس سے متاثر ہوا جا رہا تھا۔

”سر! آپ مجھے صرف ایک چانس دے کر دیکھیں میں آپ کو یاس نہیں کروں گی۔“ سارہ کا سادہ لہجہ اعتماد و منت سے پُر تھا۔ وہ ہر صورت یہ جاب پانا چاہتی تھی۔

”آپ میرا مطلب نہیں سمجھ پا رہی ہیں۔“ الیاس نے نرمی سے اس پر گہری نگاہ ڈالی تھی۔ معصومیت بھرا سادہ حسن دل موہ لینے والا تھا۔

”اس میں اپنے کام سے اپنی کم تعلیمی قابلیت ظاہر نہ ہونے دوں گی۔“ سارہ نے جاب حاصل کرنے کے لیے دلیل دی۔

”مس سارہ! آپ اس دیکھنی کی باریکیاں سمجھ پائیں گی۔“ الیاس کا لہجہ استغماہیہ تھا۔ وہ گہری سوچ میں گم تھا رگڑتا اس سے مخاطب تھا۔ وہ دو روز میں لڑکیوں کے انٹرویو کر چکا تھا مگر اسے کوئی لڑکی پسند نہ آئی تھی۔ سارہ پہلی لڑکی تھی جو اسے بے حد بھائی تھی مگر اس کا تعلیمی ریکارڈ ٹچ میں حائل تھا۔

”آپ مجھے ایک ہفتہ جاب کا موقع دے کر دیکھ لیں۔“ سارہ ذہین اور مخفی تھی۔ اس نے اعتماد سے الیاس کی نگاہوں میں جھانکا تھا۔

”ہوں..... آپ کل سے آجائیں۔“ اس کی دلیل پر دوڑن تھی اس نے قائل ہوتے ہوئے سرشات میں ہلادیا۔  
”تھینک یو سر!“ سارہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ دفعتاً الیاس کو لگا اس کے آنکھوں میں روشنی بڑھ گئی ہے۔



”اسلم! سارہ کو اندر بھیجو۔“ سارہ باقاعدگی سے آنکھیں آ رہی تھی۔ اس نے واقعی اپنی محنت و ذہانت سے جاب کی باریکیاں سمجھ لی تھیں۔ اس نے الیاس کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا تھا۔ الیاس نے ایک ہفتے کے ٹرائل کے بعد اس کی جاب سنبھال کر دی تھی۔ وہ ذمہ داری سے اپنا کام کر رہی تھی۔ الیاس کو کبھی ٹیل نہ ہوا تھا کہ وہ محض میٹرک پاس ہے۔ سارہ نے اپنی خوش اخلاقی و خوش گفتاری سے آنکھوں میں اپنی جگہ سنبھال کر لی تھی۔ اسے آتے مہینہ بھر ہو گیا تھا۔ الیاس نے اسے نئے پروجیکٹ کی فائل مکمل کرنے کو دی تھی۔ الیاس نے بیون کو بلا کر سارہ کو بلوانے کی ہدایت کی۔

”سر! وہ آج غیر حاضر ہیں۔“ بیون بتا کر چلا گیا۔ الیاس نے اس کے جانے کے بعد کمپیوٹر پر فائل کا ڈیٹا تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس سے کیس کوئی سے کام نہ ہو پارہا تھا۔ وہ بار بار ڈیٹا تیار کرتا اور ڈیلیٹ کر دیتا۔ آخر اس نے تنگ آ کر یل ٹاپ بند کر دیا اور سردنوں ہاتھوں پر گر لیا۔ وہ کچھ عرصے میں ہی سارہ کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اس کے بغیر اس سے ایک روز بھی کام کرنا دو بھر ہو گیا تھا۔

اس کا آنکھوں سے یکدم دل اچاٹ ہو گیا۔ اسے پہلی بار خیال آیا کہ اس کے پاس سارہ کا پرسل نمبر بھی نہ تھا۔ اسے کبھی سارہ کے پرسل نمبر کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ اس نے آنکھیں موندھ کر سرچیز کی بیک سے نکال لیا۔ اگلے پل اس نے کرنٹ کھا کر آنکھیں کھل دیں۔ ہند پتلون پر سارہ کا مسکراتا چہرہ متحرک تھا۔

”کیا مجھے سارہ سے محبت ہو گئی ہے؟“ الیاس کے وجہ میں سوال چکرانے لگا۔ وہ سنانے میں رہ گیا۔ محبت اس کے وجود میں دھاتاک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ جتنا خود کو جھلاتا۔ سچائی اتنی شدت سے خود کو سنانے پر تل جاتی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ!“ الیاس نے سچائی سے ہار مانتے ہوئے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ اس کے تنے اعصاب رفتہ رفتہ ڈھیلے پڑنے لگے۔ سارہ کا ڈش سر ہا پتلون پر متحرک تھا۔



”ہوا! آپ ہمارے پاس رہیں۔“ بوارحت اور بابا نے فرمانہ کی شادی کی ڈیٹ فکس کر دی تھی۔ وہ بیٹی کے جینز کی خریداری کے لیے شہر آئے تھے۔ وہ دونوں شاپنگ مکمل کر چکے تھے اور صبح ان دونوں کی واپسی تھی۔ سارہ نے ہفتہ بھر آنکھوں سے چٹھنی کر کے ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ وہ ان کی واپسی پر اداس تھی۔

”بیٹا! فرحانہ کی شادی میں تمھوڑے دن رہ گئے ہیں اور کام زیادہ ہے۔“ بوارحت نے رسانیت سے انکار کیا تھا۔ ان کا دل بھی بہو اور بیٹے کے ساتھ رہنے کو چاہ رہا تھا مگر فرحانہ کی شادی سر پر تھی۔

”تم اداس نہ ہو۔ تم دونوں شادی پر آنا پھر ہم دوبارہ تمہارے ساتھ رہنے آجائیں گے۔“ سارہ خاصی اداس تھی۔ ہوا سے بہو کی اداسی دیکھی نہ گئی۔ انہوں نے محبت سے بہو کو خود سے لپٹا لیا۔ وہ بیٹی کی شادی کے بعد تنہائی کے تصور سے ہراساں رہتی تھیں۔ وہ دلی طور پر خواہش مند تھیں کہ حیدر اور سارہ واپس آجائیں۔ وہ بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر آئے تھے۔ گاؤں کا انٹر کالج ڈگری کالج بن گیا تھا۔

”ہو! فرحانہ خوش تو ہے نا؟“ سارہ کو اپنی پرانی سہیلی کا خیال آیا تو اس نے محبت سے پوچھا۔

”وہ کافی خوش ہے بیٹا۔“ ہوانے خوش دلی سے جواب دیا۔ سارہ ان سے فرحانہ کی باتیں شیئر کرنے لگی۔

☆.....☆

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے الیاس؟“ رات کے دو بج رہے تھے۔ ایمان کی آنکھ کمرے میں پھیلی روشنی سے کھلی۔ الیاس بستر پر نیم دراز سوچوں میں گم مسلسل چھت گھورے جا رہا تھا۔ ایمان نے تشریف سے استفسار کرتے ہوئے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

”ہوں..... ہاں.....“ الیاس بری طرح بڑبڑا کر سیدھا ہوا تھا۔ ایمان کی گہری کھوجتی نظریں اسی پر جمی تھیں۔ سارہ ہفتہ بھر سے آفس سے بغیر اطلاع کے غائب تھی۔ الیاس سے اس کے بناء وقت کاٹنے نہ کٹ رہا تھا۔ وہ محبت کے پرازیت دورا ہے پر کھڑا تھا۔ یہ ادراک کے جانکسل لمحات تھے۔ وہ چاہ کر بھی حقیقت سے فرمانہ حاصل کر پار نہ تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ بس ذرا سر میں درد تھا۔“ الیاس نے نرمی و محبت سے بہانہ بتاتے ہوئے کروٹ لیتے ہوئے آنکھیں موندھ لیں۔ نیند کی رسیا ایمان قدرے مطمئن ہو کر اسے سوتا سمجھ کر دوبارہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔ الیاس سکون بھری سانس بھرتا سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

☆.....☆

”آپ میرے آفس میں آئیں مس سارہ۔“ ہوا جاچکی تھیں۔ وہ اگلے روز آفس جانے لگی۔ اس نے جاتے ہی دو ہفتے کا آف لینے کے لیے درخواست ٹائپ کر کے الیاس کی ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ الیاس اس سے گریز کر رہا تھا۔ وہ ایمان سے بے وفائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے شدید محبت کرتا تھا۔ وہ آفس کا راؤنڈ لگا کر لوٹا تو اس کی نگاہ اپنے ٹیبل پر پڑی۔ وہ خود سارہ کی ٹیبل پر آگیا۔ کام میں بری سارہ سر ہلاتی اٹھ کر اس کے پیچھے چل دی۔

”یہ کیا ہے سارہ؟“ وہ جو بھی اندر داخل ہوئی تو الیاس نے استحقاق بھرے انداز میں اسے ڈانٹتے ہوئے منگلی سے اس کی نگاہوں کے سامنے درخواست لہرائی۔

”سر! مجھے اپنے گاؤں شادی اٹینڈ کرنے جانا ہے۔“ سارہ نے آہستگی سے مجرمانہ انداز میں بتاتے ہوئے سر

جھکا لیا۔

”سارہ! آپ جہاں مرضی جائیں مگر پندرہ روز بہت زیادہ ہیں۔“ الیاس نرم پڑا وہ خاصی نرم ہو گئی تھی۔ وہ بھلے اس سے گریز بہت رہا تھا مگر دل کا ایک کوناس کے جانے کا سوچ کر ہی اداس ہوا جا رہا تھا۔

”مس سارہ! آپ پہلے ہی ایک ہفتہ آف کر کے آئی ہیں۔ آپ کو مزید آف نہیں مل سکتا ہے۔“ الیاس نے اسے ڈپٹے ہوئے صاف انکار کیا۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا جب کہ سارہ اس کی بات سمجھنے پر آمادہ ہی نہ تھی۔

”سر! کام کا جو حرج ہو گا وہ جلد پورا کر دوں گی۔“ سارہ نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ وہ دل تمام کر رہ

گیا۔ وہ ساکت اسے چند لمحے گھورنے لگا۔ ماحول پر معنی خیز خاموشی طاری ہوگئی۔ عورت کو خدانے یہ مفت و دہشت کی بے کہ و مراد کی نسبت کسی انہونی کو جلد بھانپ لیتی ہے۔ الیاس بے حد نرم اور مہربان باس تھا۔ اس نے سارہ پر کبھی بے جا سختی نہ کی تھی اور نہ ہی کبھی اس پر زندگام کا لوڈ ڈالا تھا۔ سارہ کو کسی انہونی کا احساس ستانے لگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے الیاس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جہاں محبت و پسندیدگی کی چمک واضح تھی۔ وہ دل پر بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

”سر!“ وہ جاب کی ریکارڈ منٹ بخوبی احسن پوری کر رہی تھی مگر اس کے سامان و گمان میں بھی نہ تھا کہ الیاس اسے چاہنے لگے گا۔ وہ میر ڈھکی اس نے یہ بات کبھی الیاس کو نہ بتائی تھی بلکہ اسے کبھی یہ بات بتانے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ اس کی دھیمی سرسرائی آواز لیوں سے بمشکل نکلی تھی۔

”سارہ آپ جلد آجائے گا۔“ آفس ورک کا ہرج ہوتا ہے۔“ ماحول پر دھیرے دھیرے چھائی سمسمیرے ٹائوٹ گئی تھی۔ الیاس نے چونک کر خود کو سنبھالتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے سن ذہن لیے پلٹ گئی۔

☆.....☆

”وہ آفس سے لیٹ ہو رہا تھا۔ وہ خلاف معمول جلد اٹھ کر تیار ہو گیا تھا مگر وہ اپنی تیاری سے مطمئن نہ ہو پارہا تھا۔ اس نے بیسیوں بار خود پر پرفیوم انڈیا لٹا تھا۔ وہ خوشبودن میں نہایا۔ نیوی بلیو شرٹ اور بلیک پنٹ میں ملبوس، کمزری ناک اور سلیقے سے جتے بال میں بے حد خج پر رہا تھا۔ وہ عام دنوں سے ہٹ کر لگ رہا تھا بلکہ وہ آج زیادہ جیہہ و خوب رنگ رہا تھا۔ اس کی مردانہ وجاہت واقعی بڑھ گئی تھی یا پھر ایمان کو ہی ایسا لگ رہا تھا۔

وہ بیڈ پر بیٹھی بندھتوں کی ٹنگی پر چہرہ دکھانے تیاری میں مشغول الیاس کو گہری سوچتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا ہر رنگ و انداز بدلا بدلا تھا۔ عورت اپنے مرد کے ہر رنگ و روپ کو بخوبی پہچانتی ہے۔ وہ مرد کا معمولی بدلاؤ بھی فوراً بھانپ جاتی ہے اس کی چمکی حس بے حد شارب ہوتی ہے۔ اسے آنے والے حالات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ الیاس مختلف لگ رہا تھا یادہ واقعی بدل گیا تھا۔ ایمان ٹھٹھک کر رہ گئی۔

ان کی شادی کو سال بھر ہونے والا تھا ان کی مثالی محبت و ازاد و اجی زندگی کے چرے زبان زد عام تھے۔ وہ کوئی ایکسٹرنل قلعہ انورڈ نہ کر سکتی تھی۔

”الیاس! آج آپ کا نیک سبک سے تیار ہیں۔“ ایمان اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکی تھی۔ سارہ دو ہفتوں کی لیو کے بعد آفس آ رہی تھی۔ الیاس نے محبت سے نظریں چراتے وقت گزارا تھا مگر محبت نے اسے اپنی مضبوط گرفت سے آزاد نہ کیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر سارہ کے لیے خصوصی طور پر تیار ہوا تھا۔ اس نے رات آفس سے واپسی پر شہر کی معروف شاہراہ سے ایک گلاب کی ادھ مکلی لٹی بھی خریدی تھی۔ اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب لاشعوری طور پر چھپائی۔ وہ چونک کر متوجہ ہوا اور خالی نظروں سے ایمان کو دیکھنے لگا۔

”ہوں..... آج آفس میں اپورٹ میننگ ہے۔“ اس نے لہجہ ہموار بناتے ہوئے مسکرا کر ایمان کو دیکھا۔ وہ اس کے دل کے قریب تھی۔ اس کی روح کا قرار اور جسم و جان کا سکون تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے الیاس کے چہرے پر پھیلی نرم مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”الیاس! آپ بے حد اچھے لگ رہے ہیں۔“ ایمان نے اپنے اندر اٹھتے شک کو دباتے ہوئے محبت سے اس کی ٹانگی کی ٹاٹ درست کی۔ وہ مسکرا کر اس کے گال پر محبت بھرا بوسہ دیتا تیزی سے باہر نکل گیا۔ جب کہ ایمان کی پرسوج گہری نگاہوں نے اس کا دور تک پیچھا کیا تھا۔

☆.....☆



ماہ رمضان کا آغاز ہو چکا تھا۔ ماہ رمضان کا آغاز ہوتے ہی سارہ کی مصروفیات بے حد بڑھ گئی تھیں۔ انہی مصروفیات میں وہ الیاس کے بدلے رنگ ڈھنک چاہ کر بھی نظر انداز نہ کر پار ہی تھی مگر اس کی تمام توجہ صرف اپنے کام پر تھی۔ اس کی خوشحال پمیلی تھی اگر الیاس اس سے کوئی بات کرتا تو وہ اسی روز جاب چھوڑنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اسلاف گھر جا چکا تھا۔ وہ کام میں بڑی تھی۔

”مس سارہ!“ آفس میں گہری خاموشی کا راج تھا۔ الیاس اسلاف کے آف کے بعد گھر جانے کے لیے اپنے روم سے نکلا تو سارہ اپنے کیمن میں لیپ ٹاپ پر بڑی تھی۔ وہ آہستگی سے چلتا اس کی نیمبل کے قریب آ گیا اس نے دونوں ہاتھ نیمبل پر نکاتے ہوئے جھک کر سارہ کی گہری سرخی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیس! کام میں مصروف سارہ نے بوکھا کر سرو پراٹھا یا اور الیاس کو سانپے پاتے ہی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”آپ گھر نہیں گئیں؟“ الیاس نے اس کی تنہائی کے خیال سے پوچھا۔ وہ وقتی جذبے کے حصار میں اسے پسند کرنے لگا تھا۔ وہ خود کو سنبھال چکا تھا۔ اس نے اپنے اندر جھانکا۔ دل میں کوئی خاص جذبہ نہ ابھرا۔ یہ صرف پسندیدگی تھی۔ اس کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔ وہ ایمان کے بغیر جینے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

”سر! بس تھوڑا کام رہ گیا تھا۔ میں جانے والی تھی۔“ وہ قدرے ہلکا کر بولی۔ اسے الیاس کی موجودگی نروس کر رہی تھی۔

”آپ سکون سے کام ختم کریں۔ میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“ الیاس عام لہجے میں کہتا اپنے روم کی طرف پلٹ گیا۔ اس کے قدم محبت کی خاردار وادی میں آگے نہ بڑھے تھے۔ اس نے جلدی اپنے جذبے پہچان کر قدم موڑ لیے تھے۔ اس کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ پمیلی تھی۔ وہ بے خبر تھا کہ کوئی اور ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆

”حیدر! ہم گاؤں واپس چلتے ہیں۔“ رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ فرحانہ کی شادی کے بعد گاؤں میں بو اور بابا بے حد تنہا ہو گئے تھے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ کہتے تھے مگر انہیں گھر میں تنہائی اور سناٹا ڈستا تھا۔ فرحانہ یا ریحانہ آ جاتیں تو گھر کے خاموش دروازے پر چھپانے لگتے اور ان کے جاتے ہی خاموشی کا گہرا راج چھا جاتا۔ گھر میں موجود دونوں نفوس کے پاس جیسے کہنے سننے کو کچھ نہ بچا تھا۔ سارہ کو ان کی تنہائی کا خیال ڈستار پتا۔ صد شکر کہ الیاس نے اپنے قدم جلد موڑ لیے تھے۔ اس کی خوشگوار ازدواجی زندگی میں کوئی غلام نہ آیا تھا۔ وہ بے حد خوش و خرم اور مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔

اظہاری میں کچھ لمحے باقی تھے۔ وہ دونوں بچوں سمیت دسترخوان پر موجود تھے۔

”ریٹلی سارہ! تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔“ حیدر کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ اس نے ممنونیت سے بے ساختہ سارہ کے ہاتھ تمام لیے۔ اسے بھی والدین کی تنہائی ڈستی تھی۔ وہ بچوں کے خوشحال اور بہتر مستقبل کے لیے شہر آئے تھے۔ ان گزرے سالوں میں گاؤں نے کافی ترقی کر لی تھی۔ ان کے پاس شہر میں مزید قیام کو کوئی جواز نہ رہا تھا۔ وہ بچوں کو گاؤں میں بھی پڑھا لکھا سکتے تھے۔

”میں بوا کو فون کر دوں گی۔“ سارہ نے خوشی سے چپکتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں! ہم انہیں سر پر اندر دیں گے۔“ حیدر بے حد پر جوش ہو چکا تھا۔ جب کہ دونوں بچے بھی وادی اور دادا کے ساتھ رہنے کے خیال سے بے حد مسرور تھے۔

”اللہ اکبر! اللہ اکبر۔“ مغرب کا ملکہ اندھیرا پھیلتے ہی قریبی مساجد سے اللہ کی کبریائی کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اس نے محبت سے اپنے بے حد چاہنے والے مسمر کو دیکھا جس نے زندگی کے ہر قدم پر اس کا ہمر پور ساتھ دیا تھا۔

☆.....☆

”حیدر کے ابا! میرا حیدر آگیا۔“ اس روز قومی امکان تھا کہ اگلے روز عید ہوگی۔ حیدر اور سارہ کو سامان سمیٹنے اور تیاری کرتے ہفتہ لگ گیا تھا۔ بعد نماز عصر بوارحت تلاوت قرآن پاک سے فارغ ہو کر افطاری کی تیاری میں جو تھیں کہنگی میں ٹرک آن رکا۔ وہ برسوں گلی میں ایسی آواز سننے کو ترسی تھیں۔ وہ بالک گوشت پکانے میں مگن تھیں کہ انہوں نے بے ساختہ ٹھٹھکتے ہوئے رک کر بند دروازے کے کواڑوں کو گھورا۔ ان کی آنکھوں میں یاسیت بھرے آنسو ٹھہر گئے۔ ان کا دل انجانے احساس میں گھر کر خوش کن خیال میں ڈوب کر ابھرا۔ ان کا دھیان بٹ چکا تھا۔ وہ چاہ کر بھی کھانے کی طرف دھیان نہ لگا پارہی تھیں۔

”ٹھک ٹھک۔“ گلی میں سامان اتارنے کی مخصوص آوازیں ابھر رہی تھیں۔ دروازے پر دستک ہوئی تو ان کا دل سکر کر پھیلا تھا۔ وہ دھیلے قدموں سے چلتی آئیں اور دروازہ کھول دیا۔ اگلے بل ان کے طلق سے پرسترت چچ ابھری تھی۔ بابا تیزی سے بھاگتے آئے اور بے یقینی سے سمن کے پیچوں پیچ اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ زمین نے ان کے قدم مضبوطی سے جکڑ لیے تھے۔ ان کی پھٹی پھٹی نگاہیں دروازے پر جمی تھیں۔ جہاں بوارحت بیٹے اور سب کی بلائیں لینے کے بعد پوتے پوتی کو گود میں لیے ہوئے تھیں۔

”بابا۔“ حیدر اور سارہ بوا سے ملنے کے بعد ابا کے گلے لگ گئے۔ بابا کی آنکھوں سے شکر بھرے آنسو نکل گئے۔ ان کی ساری دعاؤں قبول ہو گئی تھیں۔

باتوں میں مگن افطاری کا کالم ہونے کو تھا۔ بوا پر سکون سی کھانا بنانے میں مگن ہو گئیں سارہ ان کے منع کرنے کے باوجود ان کا ہاتھ بنانے لگی۔ بابا نے گھر کے بھر پور منظر پر شکر بھری نگاہ ڈالی۔ دونوں بچے کھیل میں مگن تھے جب کہ حیدر ان کے ساتھ باتوں میں جو تھا۔ اب کے برس عید کی برسوں بعد پوری رعنائیوں سمیت ان کے آگن میں اترنے والی تھی۔ وہ رب کے بے حد مشکور تھے۔

☆.....☆

”عید مبارک ایمان۔“ الیاس نماز عید کے بعد گھر لوٹا تو ایمان اور دادو بچن میں معروف تھیں۔ ایمان اس کے لیے شیر خرمد لے کر آئی۔ الیاس نے محبت سے اسے تمام کر مبارک بادی تھی۔ سارہ میر ڈھی اسے سارہ کے ریزائن دینے کے بعد علم ہوا تھا۔ وہ رب کا شکر گزار تھا کہ وہ اپنی نگاہوں میں معتبر رہا تھا۔ وہ نہ تو سارہ کی نگاہوں میں گرا تھا اور نہ ہی اس نے ایمان کا اعتماد کھو یا تھا۔ اسے ایمان سے محبت تھی اور وہ وفادار تھا۔ وہ بھلے ہر جا کی فطرت کا مالک سبھی مگر اس نے وفائے بھائی تھی۔ اس کے وجہ یہ چہرے پر محبت مان کی صورت بکھری تھی۔

”سیم ٹو یو۔“ ایمان نے جواباً گرجوٹی سے اسے عیدوش کی تھی۔ عورت مرد کی طبیعت کا بدلاؤ نوراً بجانب لیتی ہے اس نے الیاس کے بیون اسلم کو خصوصی مراعات کے وعدے پر الیاس کی مکمل جاسوسی کرنے کا حکم دیا تھا۔ اسلم نے چند روز اس کی مکمل جاسوسی کر کے ایمان کو سب اوکے کی رپورٹ دی تھی۔ ایمان نے سب وہم دل و دناغ سے جھٹک دیے تھے۔ الیاس صرف اسی کا تھا۔

”بی بی جی! آپ کو صاحب بلارہے ہیں۔“ الیاس محبت سے اس کے لیے لائے پھولوں کے گجرے پہنار ہا تھا کہ ملازم دستک دے کر اندر داخل ہوا اور پیغام دے کر لوٹ گیا۔ وہ دونوں مطمئن و مسرور باہر آ گئے۔ عید ساعشیں روشن ہو گئی تھیں۔ خادو اور نیلما انہیں ملنے آئے تھے۔ عمر اور فریج آنے والے تھے۔ عید کی خوشیاں دو بالا ہونے کو تھیں۔

☆.....☆

انیتہ اختر

## میرجہ بنتیہ اکبر و شہسوار

”یا اللہ میری دعاؤں کو قبول فرما الہی تو بڑا غفور  
الرحیم ہے یا اللہ تو ستر ماؤں جتنا پیار کرنے والا رب  
ہے“ الہی میری دعاؤں کو قبول فرما میرے دل سے اس  
انسان کو نکال دے میں اپنے رشتوں سے دنیا نہیں



کر سکتی۔“ آنسوؤں سے تر چہرہ لئے پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ اپنے رب کہ حضورؐ کو گڑا رہی تھی جا نماز لپیٹ کر کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی چہرے کو بے دردی سے رگڑتے ہوئے اس آدھی ادھوری ملاقات کے بارے میں سوچنے لگی جس نے اس کی زندگی کا ہر رنگ پھین لیا۔

☆☆☆☆

ہر طرف لائننگ اور گیندے کے پھولوں کی سیاہی سے ماحول عجیب ہی لطف دے رہا تھا ساہنے انچ پر بیٹا عمر دانیال محلے میں یلو وہ پتہ اور سفید شلوار قمیض پہنے بڑی شان سے بیٹھا ہوا تھا جبکہ معراج سکندر انچ سے اترتا ہوا بری طرح کسی سے ٹکرایا تھا۔

”اوہ امی جی میری ساہی مہندی خراب کر دی۔“ وہ آنکھوں میں آنسو لئے مہندی سے بچی



”مثال ہوگی وہی ہر وقت امان سے لڑتی رہتی ہے۔“  
 ”مثال۔“ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے معراج  
 سکندر کے ہونٹوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆☆

پہلے مہندی پھرو لیمہ اور بارات وہ دونوں ایک  
 دوسرے کو ہی کھوتے رہے، معراج سکندر اچھی طرح  
 سمجھ گیا تھا کہ یہ سب کس جذبے کے تحت ہے مگر مثال  
 اب تک اس جذبے کو کوئی نام نہیں دے پائی تھی اس  
 طرح شادی اختتام پذیر ہوئی اور مثال کی فیملی کراچی  
 سے لاہور روانہ ہوگی۔

☆☆☆☆

شفیق صاحب اور نائمہ بیگم دونوں بہن بھائی تھے  
 شفیق صاحب اپنی بہن سے بہت زیادہ محبت کرتے  
 تھے شفیق صاحب ہی نہیں بلکہ ان کی بیوی صوبیہ بھی  
 نائمہ کو اپنی بہنوں کی طرح ہی سمجھتی تھیں، شفیق صاحب  
 کی شادی ان کی والدہ نے اپنی مرضی سے کی تھی شفیق  
 صاحب اور نائمہ ابھی بڑھ رہے تھے تو ان کی والدہ کا  
 انتقال ہو گیا جبکہ کوثر بیگم شفیق کی شادی کے کچھ ماہ بعد  
 نائمہ کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈال کر اس دنیا  
 سے چلی گئیں، شفیق صاحب کو اپنی لاڈلوں میں پلی  
 بہن کے لئے اپنا دوست فیاض پسند آیا اور نائمہ باہل  
 کے آنگن سے رخصت ہو کر فیاض احمد کے گھر کی  
 رونق بن گئی۔ شفیق صاحب اور نائمہ بیگم کی دو دو  
 اولادیں تھیں، شفیق صاحب کے دو بیٹے عمران یال اور  
 امان جبکہ نائمہ بیگم کی دو بیٹیاں مثل اور مثال جو کہ  
 اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔

☆☆☆☆

وقت سست روی سے چل رہا تھا مثل جب سے  
 واپس آئی تھی اس کا کسی چیز میں دل ہی نہیں لگ رہا  
 تھا ہر وقت ابھی ابھی رہتی اس کے ایگزام سر پر تھے  
 جب بھی کتاب کھولتی معراج سکندر کا ہی عکس دکھتا، وہ  
 نگہبر اگر کتاب ہی بند کر دیتی اگر انکھیں بند کرتی تو

تھیلیوں کو دیکھتی پوری کی پوری معراج سکندر کے دل  
 میں اتر گئی تھی۔

”مسٹر! تم دیکھ کر نہیں چل.....“ اس کے الفاظ  
 اس کے منہ میں ہی رہ گئے جب اس کے گریبان پر لگا  
 مہندی کارنگ دیکھا۔

”اوہ آئی ایم سوری وہ کیا ہے ناں کہ امان میری  
 مہندی خراب کرنے کی کوشش کر رہا تھا، تو میں بھاگتی  
 ہوئی آپ سے ٹکرائی۔“ وہ اپنی خراب مہندی کو بھول  
 کر ایکسکلوز کر نے لگی۔

”اٹس اوکے۔“ وہ اپنی پاکٹ سے رومال نکال  
 کر مہندی صاف کرتے ہوئے بولا۔

”یہ داغ اس طرح نہیں جائے گا یہ مہندی کا  
 رنگ ہے اور سفید کپڑے سے مہندی کا رنگ نہیں  
 جاتا۔“ شرمندگی سے بولتی ہوئی اس نے اس کی  
 پوری ڈریسنگ کا جائزہ لیا، سفید شلوار قمیض اور مٹھے  
 میں یلو اور گرین دوپٹہ ڈالے وہ بہت ڈیٹنگ دکھائی  
 دے رہا تھا۔

”تو کیا پورا فنکشن اس داغ کے ساتھ اٹینڈ  
 کروں گا۔“ وہ ہاتھ سے قمیض کی طرف اشارہ کرتے  
 ہوئے بولا۔

”ڈونٹ وری میں کچھ کرتی ہوں آپ چلیں  
 میرے ساتھ۔“ وہ اسے لئے اندر کی طرف بڑھ گئی  
 جب وہ واپس اسٹیج کی طرف آیا تو عمر کی بلیک شلوار  
 قمیض میں ملبوس تھا، عمر نے حیرت سے اس کی  
 طرف دیکھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو تمہارا ہی ڈریس ہے۔“ معراج  
 سکندر مسکرا کر بولا۔

”مگر یار یہ سب ہے کیا۔“ عمر اسے گھورتے  
 ہوئے بولا۔

”یار وہاں ایک لڑکی کی مہندی سے میری قمیض  
 خراب ہو گئی تھی وہ امان سے اپنی مہندی بچاتے  
 بچاتے میری قمیض خراب کر گئی اور اپنی مہندی بھی۔“

عمر بولا۔

”عمر! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ معراج کسی بچے کی طرح بولا۔

”ہائے پتر ڈر کس بات کا لگ رہا ہے میں صدقے میں ہوں ناں۔“ عمر بالکل روایتی ماؤں کی طرح بولا۔

”یار کیا ہے تجھے مذاق سوچ رہا ہے۔“ معراج جھنجھلا کر بولا۔

”اوکے“ اوکے“ آئی ایم سیریس بولو کیا بات ہے۔“ عمر مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

”یار عمر! مجھے پیار ہو گیا ہے اور تمہیں رشتہ لے کر جانا ہے۔“ معراج نے اتنی تیزی سے کہا کہ عمر کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا، عمر گھوم کر اس کی طرف آیا اور کہا۔

”معراج! یار تو ٹھیک تو ہے ناں اور تو نے کیا کہا کہ میں تیرا رشتہ لے کر جاؤں انکل آئی اس فرض کو نبھانے کے لئے موجود ہیں۔“ عمر اس کے پاس والی چیز پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ون سینڈ عمر میں تمہیں ساری بات سمجھاتا ہوں میں نے بولا ہے کہ مجھے تیری ہیپ کی ضرورت ہے مجھے جس لڑکی سے پیار ہوا ہے وہ تمہاری کزن ہی ہے شادی میں جو مجھ سے ٹکرائی تھی۔“ معراج نے پوری بات تفصیل سے بتائی۔

”یو مین مشال.....“ عمر حیات اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں یار! مگر پلیز تو میری بے عزتی مت کرتا کیونکہ میں نے سنا ہے کہ بہنوں کے معاملے میں بھائی بہت پوزیسیو ہوتے ہیں پر کونسا میں کوئی فکری ہوں یار باقاعدہ رشتہ بھیجوں گا۔“ معراج سکندر کے چہرے پر ہلاکی خوبصورتی تھی۔

عمر جو کافی دیر سے سنجیدہ چہرہ لئے بیٹھا تھا، چھت بھار قہقہہ لگاتے ہوئے معراج کو گلے لگانے لگا۔

چہم سے اس کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا، گھبراہٹ کے مارے وہ کئی کئی گھنٹے چھت کو تکتی رہتی جب اپنی ہی کیفیت سے تنگ آ جاتی تو بلاوجہ رونے لگتی، وقت بڑا استاد ہوتا ہے سب کچھ سکھا ہی دیتا ہے مثل نے بھی اس احساس کو محبت کا نام دے ہی دیا وہ جو پہلی نظر کی محبت کو مذاق سمجھتی تھی جب کوئی پہلی نظر کی محبت کے بارے میں بات کرتا تو وہ قہقہے لگاتی مذاق اڑاتی۔

”کبھی پہلی نظر کی محبت ہوتی ہے پہلی نظر میں تو انسان صحیح سے کسی کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔“ مگر اب وہ جان گئی تھی کہ محبت اپنا آپ منوالیتی ہے۔

☆☆☆☆

معراج سکندر کی بھی حالت مثل سے مختلف نہ تھی کبھی وہ سوچتا کہ وہ اس سے رابطہ کیسے کرے کبھی سوچتا کہ اس سے ملنے لاہور ہی پہنچ جائے پھر اس نے اپنے سارے ارادے ترک کرتے ہوئے عمر سے بات کرنے کے بارے میں سوچا، اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے موبائل اور چابیاں اٹھا کر عمر کے آفس کی طرف ہولیا۔

☆☆☆☆

”ارے میرے یار کو آج میری یاد کیسے آگئی۔“ عمر معراج کے ٹکے لگتے ہوئے شکوے سے بولا۔

”بس یار کچھ کام ہی ایسا تھا۔“ معراج شرارت سے بولا، عمر نے اسے معنوی فحش کے ساتھ دیکھتے ہوئے انٹرکام پر ریفریف شمنٹ کے لئے کہا اور معراج کی طرف متوجہ ہوا۔

”ہوں تو ایسا کیا کام آن پڑا جو محترم کو ہمیں عزت کا شرف بخشا پڑا۔“ عمر مسکراتے ہوئے بولا۔

”یار! سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کہاں سے بات شروع کروں اور کہاں ختم۔“

”اب یار شروع کرے گا ناں تو ختم ہوگی۔“

زبردستی مسکراہٹ سما جاتی تھی۔  
 ”مثمل! میں تمہیں کب سے آوازیں دے رہی  
 تھی کن سوچوں میں غم تھیں۔“ مثال بیڈ پر بیٹھتے  
 ہوئے بولی۔

”نہیں کچھ بھی نہیں تم کو کوئی کام تھا کیا“  
 ”کام تو نہیں تھا بس تم سے کچھ بات کرنی تھی۔“  
 ”مجھے پتا ہے تمہیں کیا بات کرنی ہے امی نے  
 مجھے سب بتا دیا ہے مثال تم بہت لگی ہو جو تمہیں معراج  
 سکندر جیسا لائف پائٹرن ملا۔“ مثال میں تمہارے لئے  
 بے حد خوش ہوں اللہ تمہیں وہ سب خوشیاں دے جو تم  
 ڈیزر د کرتی ہو۔“ مثال اپنی ہی دھن میں اپنے ترتیب  
 دیئے گئے الفاظ بولے جا رہی تھی شاید وہ مثال کے  
 چہرے پر چھائی تار کی نہیں دیکھ پائی تھی۔

☆☆☆☆

رات کا پچھلا پہر تھا وہ لان کی جانب کھلنے والی  
 کھڑکی میں کھڑی چاندی کے آس پاس چمکتے ستاروں کو  
 بڑی غور سے دیکھ رہی تھی۔ دل عجیب ہی اداسی میں  
 لپٹا ہوا تھا زندگی میں یوں تو بہت نازک مرحلے آتے  
 ہیں اور گزر جاتے ہیں مگر ایک مرحلہ ایسا ہوتا ہے جسے  
 انسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا وہ مرحلہ ہے جب کسی کا  
 دل ٹوٹ جاتا ہے کاش یہ نازک مرحلہ کسی پر نہ آئے  
 کیونکہ درد کا احساس وہی جانتا ہے جس کے چوٹ لگتی  
 ہے اور دل میں گھاؤ پڑتا ہے۔

”اے خدا کاش! یہ وقت کسی پر نہ  
 آئے۔“ سوائے دکھ اذیت اور کرب کے سوا کچھ نہیں  
 تھا اس کی نیند اس سے روٹھ چکی تھی جو آنکھیں ہمیشہ  
 مسکراتی تھیں وہاں اداسیوں نے ڈھیرے ہمارے  
 تھے اس نے اپنے چہرے پر پھیلے اشکوں کو بے دردی  
 سے انگلیوں سے صاف کیا اور کھڑکی بند کر کے مثال  
 کے پہلو میں لیٹ گئی۔

☆☆☆☆

مثال کی حالت کسی سے بھی چھپی نہیں تھی وہ سارا

”بار! تو پریشان مت ہو مجھے تجھ پر پورا بھروسہ  
 ہے پانچ سال کی دوستی ہے اتنا تو بھروسہ کر ہی سکتا  
 ہوں کہ بہن کو تیرے سپرد کر دوں۔“ عمر معراج کا شانہ  
 تھپتھپاتے ہوئے سلی آمیز لہجے میں بولا۔

☆☆☆☆

وہ بھی ایک عام دنوں جیسا ایک دن تھا، مثال  
 جب کالج سے واپس آئی تو اس پر جو انکشاف ہوا اس  
 کے لئے کسی دھچکے سے کم نہیں تھا، صوبیہ بیگم کی زبانی  
 اسے پتا چل چکا تھا کہ معراج سکندر کا رشتہ مثال کے  
 لئے آیا ہے، لڑکا دیکھا بھلا ہے کسی بات کا کوئی ٹک و  
 شبہ نہیں اس لئے جواب ہاں ہی میں ہوگا، معراج  
 سکندر کو شفیق صاحب اپنی فیملی ممبر کی طرح ہی سمجھتے  
 تھے اور انہوں نے کبھی بھی اپنے بیٹوں اور اس میں  
 فرق نہیں کیا تھا ان دونوں فیملی کے تعلقات بھی  
 آپس میں بہت اچھے تھے مثال اور مثال نے کبھی  
 معراج کو دیکھا تو نہیں تھا مگر اس کا ذکر عمر اور امان  
 سے بے انتہا تھا جب ہی تو مثال شادی میں اسے  
 پہلی مرتبہ ہی دیکھتے پہچان گئی تھی۔

☆☆☆☆

”بلا کی افراطی ہے میری ذات میں  
 بے دھیانی میں بھی تیرے دھیان رہتے ہیں“  
 ”اللہ جی! ایسا میرے ساتھ ہی کیوں ہوا اگر وہ  
 میری بہن کی قسمت میں تھا تو تو نے میرے دل میں  
 اس کے لئے محبت کیوں ڈالی یا اللہ میں اپنی بہن سے  
 بے حد پیار کرتی ہوں میں اس کے ساتھ دعا نہیں  
 کر سکتی، شاید اس کی فیملی کو مثال پسند آئی اور شاید  
 اسے بھی جیسی تو اتنی جلدی رشتہ بھیج دیا۔“ وہ دل ہی  
 دل میں اپنے رب سے ہم کلام تھی وہ جب بھی  
 پریشان ہوتی بہت سی باتیں اپنے رب سے شیئر  
 کرتی۔

”مثمل..... مثمل۔“ مثال کی آواز پر اس نے

اپنے چہرے کو انگلیوں سے مڑتے ہوئے چہرے پر

کرنا پڑتا ہے اور کسی کے لئے نہ سہی اس انسان کے لئے جس سے آپ پیار کرتے ہیں اس کے لئے امان شفیق احمد نے بھی یہ درد منس کر سہا تھا صرف مثل فیاض کے لئے۔

☆☆☆☆

امان نے لاہور آنے کی بہت کوشش کی کہ وہ سب سے بات کرے گا یا وہ عمر سے بات کرے گا مگر مثل نے اسے اپنی قسم دے کر روک لیا کہ وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرے گا اس لئے وہ فی الحال خاموش تھا۔ مثل اور مثال دونوں صبح سے کاموں میں لگی ہوئی تھیں آج معراج سکندر کے گھر والے مفتی کی رسم کرنے آ رہے تھے ان کے ساتھ ہی نامہ بیگم اور عمر بھی آ رہے تھے امان نے مثل کو دو پارہ فون کر کے عمر کو سب بتا دینے کو کہا لیکن وہ نہیں مانی اور اس نے لڑ بھکر فون ہی بند کر دیا۔

”بیٹا! وہ لوگ پہنچنے والے ہوں گے اب تم دونوں نہا دو کر کپڑے پہن لو اور ہاں مثل بہن کو اچھے سے تیار کرنا اور مثال تمہارا چہرہ کیوں اتنا مرجھایا ہوا ہے ابھی بیٹا ہم کون سا چہرہ رخصت کر رہے ہیں جو تم اتنی پریشان ہو۔“ صوبیہ بیگم ضروری ہدایت کے ساتھ مثال کو ریلیکس کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

”امی! مثال کے سسرال سے کتنے لوگ آ رہے ہیں۔“ مثل نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا صبح سے لے کر اس کا یہ پہلا سوال تھا اور پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ کہیں وہ دشمن جاں بھی تو ساتھ نہیں آ رہا۔

”بیٹا معراج کی ماں بہن اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔“ صوبیہ بیگم مختصر جواب دیتے ہوئے نماز کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆☆

مفتی کی رسم مختصر سی تھی سب گھر کے ہی لوگ موجود تھے بریڈ بیگم (معراج کی والدہ) نے مثال

سارا دن کھوٹی کھوٹی رہتی اگر کوئی بات کرنا تو اچھے اچھے جواب دیتی چھوٹی چھوٹی باتوں پر باقاعدہ رونا شروع کر دیتی سب اس کے رویے کی وجہ سے پریشان تھے مثل لان میں بیٹھی ڈوبتے ہوئے سورج اور گھروں کو لوٹتے ہوئے پرندوں کو بڑی غور سے دیکھ رہی تھی جب پاس پڑے سیل نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانی۔

”امان کالنگ۔“ دیکھتے ہی وہ جیسے بکھرنے لگی تھی امان اور مثل دونوں بیسٹ فرینڈ تھے مثل نے امان سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی مثال کی مفتی کے بعد آج اس نے کال کی تھی۔

”ہیلو ڈیر مثل! کیسی ہو لگتا ہے لاہور والے اتنے بے مروت ہو گئے کہ ہم جیسے زندہ دل لوگوں کو بھول ہی گئے۔“ مثل کے ہیلو کہتے ہی امان شروع ہو گیا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بس پارا میزام چل رہے ہیں اس وجہ سے۔“ مثل نے کمزوری وضاحت دی۔

”مثل! تمہاری آواز کو کیا ہوا تم ٹھیک تو ہو نا۔“ امان کے لہجے میں حد سے زیادہ فکر مندی تھی۔ ”نہیں کچھ بھی نہیں بس ایسے ہی مثل آہستگی سے بولی۔

”ایسے کیسے کچھ بھی نہیں یا تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو ایسی کیا بات ہے۔“ امان کے کہنے کی دیر بھی مثل ہچکیوں سے روٹنے لگی امان کی تو جان پر بن آئی۔

”مثل! کول ڈاؤن کچھ بولو گی کہ بس آج رونے کا مثل فرماتی رہو گی۔“ پھر مثل نے امان کو ہچکیوں کے درمیان ساری بات بتا دی مگر وہ اس بات سے بالکل غافل تھی کہ اس کے دل کے ساتھ کسی اور کا دل بھی ٹوٹا ہے جب دل ٹوٹتا ہے تو آواز نہیں آتی پر درد بہت ہوتا ہے پر بھی ابھی آپ کو وہ درد برداشت



متوجہ ہوا۔

”ان دونوں لڑکیوں میں سے میری متکئی کس کے ساتھ ہوئی ہے؟“ معراج نے موبائل حمزہ کے ساتھ لے لیا۔

”بھائی اس کے ساتھ۔“ حمزہ نے مثال کی پک کی طرف اشارہ کیا، معراج سکندر کچھ پل کے لئے تو ساکت رہ گیا لیکن حمزہ کے پکارنے پر تیزی سے صوفے سے اٹھا میز سے چایاں لیس اور کچھ دیر بعد اس کی گاڑی عمر دانیال کہ آگس کے باہر تھی۔

☆☆☆☆

”عمر یہ سب کیا ہے؟“ معراج سکندر تیزی سے روم میں داخل ہوا اور اس تیزی سے موبائل عمر کے سامنے پھینکا تھا عمر غیر صاحب سے کوئی ضروری فائل ڈسکس کر رہا تھا وہ معراج کہ اس طرح ری ایکٹ کرنے پر سخت شرمندہ ہوا۔

”عمر ان صاحب اس فائل کو ہم بعد میں ڈسکس کرتے ہیں۔“ عمر نے فائل بند کر کے عمران صاحب کو پکڑائی عمران صاحب فائل لے کر جا چکے تھے تو وہ معراج کی طرف متوجہ ہوا۔

”قیامت آگئی ہے کیا جو جاہلوں کی طرح ری ایکٹ کر رہے ہو۔“ عمر دانت پیٹتے ہوئے بولا۔

”ہاں آگئی ہے قیامت۔“ معراج حلق کے بل چیخا تھا۔

”یہ دیکھو یہ لڑکی کون ہے جس سے تم نے میری متکئی کرا دی؟“ معراج نے موبائل اسکرین پر مثال کی تصویر دکھائی۔

”وہاٹ ڈو یو مین یہ لڑکی کون ہے یہ مثال ہے اور کون ہے۔“ عمر نے نا جی کہ عالم میں کہا۔

”اگر یہ مثال ہے تو یہ کون ہے؟“ معراج نے عمر کو مشل کی تصویر دکھائی۔

”یہ مشل ہے مثال کی چھوٹی بہن۔“ عمر کے انکشاف سے تو معراج کو گویا چودہ طبق روشن

کو انگٹھی پہنائی حمزہ اور مریم نے اس لمحے کو اپنے موبائلز میں قید کیا انہوں نے مشل کو بھی زبردستی ساتھ بٹھا کر تصویر بنائی عمر آج بہت خوش تھا کہ اس کی اور معراج کی دوستی رشتے داری میں بدل گئی اور پھر ایک خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا، مثال کا توجہ نہ رہنا بنا تھا لیکن مشل اتنی خاموش کیوں تھی یہ بات عمر کے ساتھ ساتھ نام نہان بیگم نے بھی نوٹ کی تھی۔

☆☆☆☆

حمزہ آگے اور معراج اس کے پیچھے ایک گھنٹے سے معراج مریم اور حمزہ کی مٹیں کر رہا تھا کہ اسے متکئی کی تصویریں دکھادیں۔ لیکن وہ دونوں آج اسے ستانے کہ فل موڈ میں تھے۔

”بھائی ایک شرط پہ میں آپ کو تصویریں دکھاؤں گا۔“ حمزہ نے بڑے احسان جتانے والے انداز میں کہا۔

”یاد رہے مجھے تصویریں دکھا دے تو جو بولے گا میں کروں گا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے تو میرا لپ ٹاپ ڈن ہے۔“ حمزہ نے اپنی شرط بتائی۔

”اوکے ڈن۔“ معراج نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے تو یہ دیکھیں اپنی ہونے والی شریک حیات کی تصویریں۔“ حمزہ نے موبائل معراج کے ہاتھ میں دیا، معراج ایک ایک تصویر آگے کر رہا تھا مگر وہ جس کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا وہ تو کہیں نہیں تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے وہ تصویریں تیزی سے آگے کر رہا تھا ایک تصویر میں وہ سادہ سی نظر

آہی گئی اس کے اعصاب کام کرنا چھوڑ چکے تھے۔

”بھائی آپ اس طرح تصویر کیوں دیکھ رہے ہو

آر یو اوکے۔“ حمزہ نے معراج کا کندھا ہلایا۔ وہ ایک دم حواس میں لوٹا۔

”حمزہ میری بات سنو۔“ وہ یکدم اس کی طرف

دو گئے۔ کچھ دیر کے لئے تو وہ کچھ کہنے سننے کے قابل ہی نہیں رہا اور بولا بھی تو کیا۔  
”مجھے مثال سے نہیں مثل سے شادی کرنی ہے۔“

”وہاٹ نان سینس‘ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ناں تمہارے لئے شاید رشتے مذاق ہیں۔“ معراج کی بات پر عمر ہکا بکارہ گیا۔

”یار عمر! تو سمجھ نہیں رہا۔“  
”کیا سمجھوں یہی کہ پہلے تمہیں مثال سے محبت ہوئی اور اب مثل کی تصویر دیکھی تو شرم آئی چاہئے تمہیں ایک بہن کا بھائی تو بھی ہے۔“ عمر کا غصے کی شدت سے چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”عمر ایک دفعہ میری بات سن لو بعد میں جو بولنا ہو بول لیتا پلیز مجھے غلط مت سمجھو میں نے تم سے مثال کی نہیں مثل کی بات کی تھی اس دن شادی میں مجھ سے مثال نہیں مثل ٹکرائی تھی اور اس دن آج پر تم نے یہی بولا کہ وہ مثال ہوگی غلطی میری بھی ہے کہ میں نے کنفرم نہیں کیا اور رشتہ بھیج دیا اب تک اگر میں تصویر نہ دیکھتا تو میں یہی سمجھتا کہ مثال ہی وہ لڑکی ہے پلیز تم مجھ سے بدگمان مت ہو یہ سب کچھ غلط فہمی سے ہوا ہے۔“ معراج جو پہلے غصے میں تھا اب منتوں پر اتر آیا تھا۔

”تو اب کچھ نہیں ہو سکتا جو ہونا تھا ہو چکا۔“ عمر کو رہ رہ کر معراج کی لاپرواہی پر غصہ آ رہا تھا۔

”پلیز عمر! اس طرح مت بولو میں مر جاؤں گا یار میں اگر شادی کروں گا تو صرف مثل سے ورنہ میں جان دے دوں گا۔“ معراج تو عمر کے رویے سے باقاعدہ رونے والا ہو گیا۔ معراج کو دیکھ کر عمر کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ عمر کا ایک ہی دوست تھا معراج جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا اور اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

”اجھا کول ڈاؤن تم بیٹھو یہاں۔“ عمر نے بانی کا گلاس پڑاتے ہوئے اسے ریلیکس کرنے کو شش

کی۔

”میں کچھ سوچتا ہوں‘ تم گھر جاؤ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پریشان مت ہونا۔“ عمر نے معراج کو تو تسلی دے کر بھیج دیا لیکن خود اس سے بھی زیادہ پریشان تھا۔

☆☆☆☆

”بھائی کیا ہوا‘ آپ بہت پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔“ عمر لان میں بہت پریشان بیٹھا تھا جب امان کی آواز پر چونک گیا۔

”بھائی ایوری تھک از او کے؟“ امان پاس والی چیز پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ عمر بہت ٹینشن میں تھا۔ اس لئے اسے یہی بہتر لگا کہ امان کے ساتھ اس پر ابلم کو شیئر کر لیتا چاہئے عمر نے ساری بات امان کے گوش گزار کر دی۔

”اب تم ہی بتاؤ امان میں کیا کروں ایک طرف دوست ہے اور دوسری طرف بہن سوچتا ہوں اس طرح مثال کتنی ہرٹ ہوگی۔“ عمر نے تھک کر کرسی سے ٹپک لگائی تھی امان پوری بات سن کر قدرت کی کایا پلٹ پر حیران تھا۔

”بھائی اس طرح مثال بھی تو معراج کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی اس طرح ایک نہیں چار زندگیاں تباہ ہوں گی۔“

”کیا مطلب؟“ عمر کہ لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

”مطلب یہ ایک مثال کی زندگی پھر معراج اور مثل کی اور چوٹی اس انسان کی جس سے مثل کی شادی ہوگی۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو صاف صاف کہو۔“  
”بھائی مثل مجھی معراج سے پیار کرتی ہے ان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے اللہ تعالیٰ نے محبت ڈالی ہے یہ اتفاق نہیں ہو سکتا اور وہ دونوں اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ وہ دونوں

ایک دوسرے کے لئے ایک جیسے جذبے رکھتے ہیں اب اگر اس مسئلے کا حل نہ نکالا تو کوئی نہ کوئی تو پاگل ہو ہی جائے گا۔

”خاص کر میں تو ضرور ہو جاؤں گا۔“ عمر نے اپنی کپٹیاں دباتے ہوئے کہا اور پھر وہ دونوں پلان کرنے لگے کہ کیا کرنا ہے اس پلان میں زیادہ تر کردار امان کا ہی تھا کسی کو تو محبت کی قربانی دینی ہی تھی سو امان محبت کے سامنے جھک گیا تھا۔

☆☆☆☆

وہ بیڈ پریٹھی مشال کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مشال! کیا بات ہے تم کچھ پریشان ہو جس دن سے تمہاری منتی ہوئی ہے تم بہت گھوٹی گھوٹی سی رہتی ہو۔“ مشال جو اپنی ہی سوچوں میں گم تھی مشال کی بات پر چونک گئی۔

”نہیں..... نہیں مشل! ایسی تو کوئی بات نہیں تمہیں ضرور کوئی وہم ہوا ہے۔“ مشال مختصر جواب دے کر واش روم میں گھس گئی۔ شاید وہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی مشل کو خاموش کمرے میں وحشت سی ہوئی تو وہ اٹھ کر ٹیرس کی طرف چل دی۔

☆☆☆☆

”امی! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ نامہ بیگم عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر جاء نماز تہہ کر رہی تھیں کہ امان ان کے کمرے میں چلا آیا۔

”آؤ بیٹھو بیٹا! کیا بات کرنی ہے؟“ نامہ بیگم نے نیکے سے نیک لگاتے ہوئے کہا۔

”امی! آپ ناراض تو نہیں ہوں گی۔“ امان پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اگر ناراض ہونے والی ہوئی تو ضرور ہوں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”امی! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ امان ڈرتے ڈرتے بولا۔

”تو بیٹا اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے تم لڑکی

کا نام بتاؤ اگر مجھے پسند آئی تو میں نہ نہیں بولوں گی۔“

”امی لڑکی تو آپ کو بہت پسند ہے مگر.....“

”امی اس کا نام مشال ہے۔“ امان نے نام ہی نہیں لیا تھا گویا نامہ بیگم کے سر پر بم پھوڑا تھا وہ کچھ کہنے سننے کے قابل ہی نہیں رہی تھیں کچھ دیر کے لئے کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا تھا جسے امان کی آواز نے ہی توڑا تھا۔

”امی! میں مشال سے پیار کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ امان نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

”امان! تمہیں شرم آنی چاہئے اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے تمہیں ذرا بھی اندازہ ہے کہ تم کیا بول رہے ہو؟ مشال کی منتی ہو گئی ہے اور کچھ ہی عرصے بعد اس کی شادی ہونے والی ہے۔“ نامہ بیگم صدمے سے بولیں۔

”امی میں کچھ نہیں جانتا میں اگر شادی کروں گا تو صرف مشال سے اگر آپ نے ماموں سے بات نہیں کی تو میں خود ان سے بات کروں گا انہوں نے انکار کر دیا تو میں یہ ملک چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں گا۔“ وہ ماں تھیں امان کی دھمکی پر ان کا دل تڑپ اٹھا تھا۔

”امان! یہ کیا بد تمیزی ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے تم اس عمر میں کیوں مجھے بے عزت کرنے پر تلے ہوئے ہو؟“ نامہ بیگم روتے ہوئے بولیں۔

”امی! یہ سب کرنا تھا بہت سارے دل ٹوٹنے سے بچانے تھے۔“

”امی پلیز! آپ ماموں سے بولیں کہ وہ معراج کی فیملی کو کچھ نیچا بہانہ بنادیں۔“ امان نے بات ختم کی اور کمرے سے نکل گیا وہ ماں کو اور آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا اور نامہ بیگم ساکت بیٹھی بند

”رازے کو دیکھتی رہیں۔“ سوچ رہے ہیں ناں۔“ عرفیاض صاحب کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

☆☆☆☆

”نامہ بیگم نے امان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ کسی کی سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں تھا تھک ہار کر نامہ بیگم نے عمر سے بات کی تو اس نے بھی یہی مل بتایا کہ ماموں کی فیملی سے بات کر لینی چاہئے نامہ بیگم معراج کی فیملی کو لے کر پریشان تھیں تو عمر نے تسلی دی کہ وہ دیکھ لے گا پھر نامہ بیگم عمر کے ساتھ کراچی سے لاہور روانہ ہو گئیں۔“

☆☆☆☆

”کوئی بات نہیں ماموں! مای خود ہی سہرینہ آنٹی سے بات کر لیں گی۔“ عمر نے بات کا رخ صوبہ بیگم کی طرف کیا۔

”میں کیسے صوبہ بیگم۔“ روہانسی ہوئیں۔  
”مامی اب کسی کو تو بات کرنی ہے ناں پلیز یہ کام آپ کو ہی کرنا ہے۔“  
”ٹھیک ہے بیٹا میں کر لوں گی۔“ بات نامہ بیگم کو اس وقت بھائی اور بھانجی کی محبت پر رنگ محسوس ہوا تھا۔

☆☆☆☆

معراج آفس سے سیدھا گھر ہی آیا تھا اور آتے ہی سہرینہ بیگم کو آوازیں دینے لگا وہ جو بچن میں ملازمہ کو ضروری ہدایت دے رہی تھیں معراج کی آواز پر بچن سے باہر آئیں۔  
”ارے بیٹا! اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو؟ آ رہی ہوں۔“  
”ماما! بات ہی کچھ ایسی ہے۔“

”کیا بات ہے بولو۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔  
”امی! کچھ ہی دیر میں میرے سسرال سے آئی میں فیاض انکل کے گھر سے کال آئے گی۔“  
”تو بیٹا اس میں پریشان ہونے والی کیا بات

”ماموں آپ معراج کی فیملی کے بارے میں ہے۔“

ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے خوشی سے بولا۔  
 ”معراج بہ سب ٹھیک نہیں ہے۔“  
 ”ماما سب ٹھیک ہو جائے گا، آپ ٹینشن مت  
 لیں۔“ وہ انہیں گلے لگاتے ہوئے بولا۔

☆☆☆☆

عمر نے یہ نیوز امان کو دے دی تھی اس کے لئے  
 اب سب سے اہم کام معراج اور مثل کے رشتے کے  
 لئے سب کو راضی کرنا تھا اور اب وہ یہ کام انجام دینے  
 کے لئے فیاض صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔  
 ”ماموں آپ بڑی تو نہیں ہیں میں اندر آ سکتا  
 ہوں۔“ عمر نے دروازہ ناک کرتے ہوئے کہا۔  
 ”آؤ بیٹا۔“ فیاض صاحب بیڈ کریک سے ٹیک  
 لگاتے ہوئے بولے عمر بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔  
 ”ماموں مجھے معراج والے رشتے کے بارے  
 میں آپ سے بات کرنی ہے۔“

”ہاں بیٹا تمہاری ممانی نے مجھ سے بات کی ہے  
 ان لوگوں کی خواہش کے بارے میں اس بارے میں  
 سوچ رہا ہوں۔“

”ماموں! جہاں تک مجھے لگتا ہے ہمیں ان لوگوں  
 کو مانوس نہیں کرنا چاہئے، جہاں تک میں سوچتا ہوں  
 ان لوگوں کا رد عمل اس بات کو لئے کر غلط ہونا چاہئے تھا  
 لیکن ان لوگوں نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے  
 پریوزل مثل کے لئے دے دیا۔“ عمر کو یہ سب کچھ  
 عکرتے ہوئے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن مجبوری  
 انسان سے سب کچھ کروا دیتی ہے۔

”ٹھیک ہے بیٹا! جیسے تمہیں بہتر لگے پر کیا مثل  
 مان جائے گی۔“  
 ”ڈونٹ دری میں اس سے بات کرتا ہوں۔“ عمر  
 کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

☆☆☆☆

جب عمر نے مثل اور مثال کو آنے سنانے بیٹھا  
 کہ بات کی تو وہ دونوں تو دمک رہ گئیں مثال کے

”ماما بات پریشان ہونے والی ہے اب میں آپ  
 کو جیسا بولوں گا آپ ویسا ہی بولیں گی۔“ اور پھر  
 معراج نے سہرینہ بیگم کو ساری بات لفظ بہ لفظ بتادی وہ  
 تو اس کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئیں مگر وہ معراج ہی کیا  
 جو کسی کو قائل نہ کر سکے۔

☆☆☆☆

صوبیہ بیگم نے کال کر تو لی تھی لیکن بات کرنے  
 کے لئے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے پھر سہرینہ بیگم نے  
 ہی بات کا آغاز کیا۔

”صوبیہ بہن! آپ جو بات کرنا چاہتی ہیں  
 بلا جھجک کریں اگر مثال کے بارے میں کوئی بات  
 کرنی ہے تو آپ صاف صاف بولیں وہ آپ کی بیٹی  
 ہے اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا آپ کو پورا حق  
 ہے۔“ سہرینہ بیگم کی باتوں سے صوبیہ کے دل کو  
 ڈھارس ملی تھی اور انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

”دراصل بات یہ ہے کہ ہم مثال کا رشتہ امان  
 سے کرنا چاہتے ہیں ہم لوگ نامہ کو دیکھی نہیں دیکھ سکتے  
 اس لئے ہم لوگ آپ سے معذرت چاہتے ہیں۔“  
 صوبیہ بیگم نے جھجکتے ہوئے بات مکمل کر دی۔

”صوبیہ بہن! میں یہ تو نہیں جانتی کہ اس سب  
 کے پیچھے وجہ کیا ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ ہمیں خالی  
 ہاتھ مت لوٹائے ہمارے لئے مثل اور مثال میں  
 کوئی فرق نہیں! اگر مثال کے رشتے کو لئے کر آپ  
 لوگوں کہ خاندان میں کوئی مسئلہ ہے تو مثل بھی  
 ہمارے بچوں کی طرح ہے ہمارے لئے یہ اعزاز کی  
 بات ہوگی کہ ہماری رشتے داری آپ لوگوں کے  
 ساتھ قائم رہے۔“ صوبیہ بیگم ان لوگوں کی اچھائی کے  
 آگے کچھ دیر کے لئے تو کچھ نہ بول سکیں پھر ہمت  
 کرتے ہوئے بولیں۔

”ہم لوگ آپ کو سوچ کر بتائیں گے۔“ اور اللہ  
 حافظ کہہ کر کال کاٹ دی۔  
 ”ماما آئی لو یو سوچ۔“ معراج سہرینہ بیگم کے

”مگر میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ تم امان سے اس لئے تو میں نے“۔

”تم نے کیا“۔ مثل نے مثال کی ادھوری بات کو مکمل کرنا چاہا۔

”اسی لئے تو میں نے معراج سکندر کے رشتے کے لئے ہاں کہہ دی“۔

”اوہ میرے خدایا اور میں اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ تم معراج میں انٹر سٹل ہو کتنی غلط فہمی ہو گئی تھی اگر امان ہمت نہیں کرتا تو“۔ مثل نے دونوں ہاتھوں میں سر پکڑا تھا۔

”اچھا چھوڑو یہ بتاؤ تم نے معراج سکندر والے پر پوزل کے بارے میں کیا سوچا“۔ اصل مشکل تو مثل کے لئے اب آئی تھی وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کہیں معراج سکندر مثال میں انٹر سٹل تو نہیں ہے۔

”کیا ہوا کیا سوچ رہی ہو“۔ مثال کی آواز پردہ چوکی۔

”I don't know! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا“۔

”مثل! تم بہت لکی ہو کہ تمہیں معراج سکندر جیسا لائف پارٹنر مل رہا ہے یہ تمہارے ہی الفاظ ہیں ناں تو پھر جب تک کس بات کی تم یہ بھول جاؤ کہ معراج کی ممکنہ سمجھ سے ہوئی تھی تو تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی“۔ مثال یہ کہنے کے ساتھ ہی اٹھ گئی شاید وہ یہ سوچ رہی تھی کہ مثل کو سوچنے کے لئے تنہائی چاہئے۔

☆☆☆☆

”میرے اللہ! میں اپنی قسمت کا ہر فیصلہ تجھ پر چھوڑتی ہوں معراج سکندر کو مجھ سے اس طرح ملانے میں شاید تیری کوئی مصلحت ہو تو میرا رب ہے میرے لئے جو فیصلہ کرے گا بہتر کرے گا“۔ مثل دعا سے فارغ ہو کر سیدھا مثال کے پاس گئی۔

”مثال!! امی کو بول دو کہ میں اس رشتے کے

امان کی فیلنگ مثل کا رشتہ معراج سکندر سے وہ بھی اس کی فیلنگ کی مرضی سے ان دونوں کے لئے یہ پجوشن بہت عجیب تھی کچھ دیر کے لئے تو کمرہ خاموشی کی زد میں آ گیا اور پھر مثل نے ہی ہمت کی۔

”How is possible اور امان اس نے تو مجھ سے اس بارے میں کبھی کچھ شیئر نہیں کیا اور میں اور معراج سکندر یہ کیسے ہو سکتا ہے“۔ مثل کے تو مانو پردہ طبع روشن ہو گئے۔

”مثل مثال پلیز پجوشن کو سمجھنے کی کوشش کرو“۔ ماں بہت پریشان ہیں امان کی حرکت کو لے کر وہ بہت ڈسٹرب ہیں تم دونوں جو بھی فیصلہ کرنا ماموں کے بارے میں سوچ کر کرنا تم دونوں کے پاس سوچنے کے لئے وقت ہے میں اب چلتا ہوں“۔

☆☆☆☆

مثال تو اس سارے واقعے میں خاموش ہی تھی مانا نے کن سوچوں میں گم تھی کہ مثل نے اسے کندھے سے بلایا۔

”مثال! تم پریشان مت ہو اگر تم یہ شادی نہیں کرنا چاہتے تو میں پاپا سے بات کروں گی اور امان کو بھی سمجھاؤں گی“۔

”مثل پلیز مجھے معاف کر دو“۔ مثال مثل کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے بیٹھی تھی۔

”تم مجھ سے کیوں معافی مانگ رہی ہو“۔ وہ اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

”میں جانتی ہوں تم امان سے پیار کرتی ہو ناچ میں مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا“ میں تو امان کی فیلنگ کے بارے میں بھی نہیں جانتی تھی بس تم مجھے معاف“۔

”ون کیکنڈ یہ تم کیا بول رہی ہو میں اور امان سے پیار ایسا نہیں ہے وہ صرف میرا بیٹہ فرینڈ ہے جسٹ فرینڈ“۔ مثل حیران ہوتے ہوئے بولی۔

لئے راضی ہوں۔“ وہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی نماز کہ اسٹائل میں چہرے کے گرد لپٹے میرون دوڑنے میں مثال کو وہ بہت معصوم لگی تھی۔  
 ”اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔“ مثال اس کا گال چومتے ہوئے خوشی سے بولی اور ماما کے کمرے کی طرف دوڑتی مثل بھی امان کو فون کرنے کی غرض سے لان میں چلی گئی اب اس کی ٹانگ بھی تو پھینچتی تھی۔

☆☆☆☆

”قسم سے امان مجھے تم سے ہرگز ایسی توقع نہیں تھی تم نے مجھ سے چھاپا اس لئے معراج والے رشتے سے مرے جا رہے تھے۔“ مثل نے معنوی فحاشی سے کہا۔  
 ”ہاں تو تم بھی تو معراج کے لئے مری جا رہی تھیں ناں۔“ امان نے حساب برا بر کیا۔  
 ”دن سیکنڈ کیا یہ سب تم نے؟“  
 ”اوہو میڈم اتنی خوش نہی اچھی نہیں ہوتی میں کیوں تمہارے لئے اپنی زندگی برباد کروں گا۔“  
 ”امان تم بہت برے ہو۔“ مثل رو ہاسی ہوئی۔  
 ”مثل۔“ امان کی تمسیر سی آواز مثل کی ساعتوں سے نکرائی۔

”مجھے کبھی بھول تو نہیں جاؤ گی صرف تم ہی میری بیسٹ فرینڈ ہو پلیز مجھے بھی نہ بھلانا۔“ مثل کو تاجانے کیوں امان کی آواز بھیگی بھیگی محسوس ہوئی تھی۔  
 ”امان از اپوری تھنک او کے؟“  
 ”کیا یار! اموشلی ڈائلاگ بھی نہیں بولنے دیتی ہو۔“ وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔

”امان کے بچے ایک دفعہ تم میرے بہنوئی بن جاؤ پھر میں سالی بن کر تم سے خوب بدلے لوں گی۔“  
 ”ارے سالی سے یاد آیا میری بہن کو دیکھو اس نے بھی مجھ سے کچھ شیئر نہیں کیا۔“ مثل شکوہ کنناں لہجہ میں بولی۔

”کیا نہیں بتایا۔“

”یہی کہ وہ بھی تم سے پیار کرتی ہے۔“

”کیا واٹ۔“ امان اکیدم اچھل پڑا۔

”آئی کانٹ بلیو دس اس نے بھی کچھ کہا کیوں نہیں۔“

”کیونکہ وہ باگل یہ سمجھتی تھی کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔“ مثل کھلکھلا کر بولی امان کے اندر چھن کر کے کچھ ٹوٹا تھا۔

”ہاں مگر اس بے جاری کو کیا پتا تھا کہ تم باگل معراج سکندر سے پیار کرتی ہو۔“ وہ جل کر بولا۔

”اچھا اب میں فون بند کر رہی ہوں امی بلاری ہیں اللہ حافظ۔“ اس نے کہتے ساتھ ہی فون بند کر دیا امان کہ اندر ڈھیروں سکون اتر آیا تھا کہ وہ مثل اور معراج کو یہی نہیں مثال کو بھی انجانے میں ہی سہی اس کی محبت دلوانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور وہ جانتا تھا مثال ایک محبت سے گندھی ہوئی لڑکی ہے وہ جلد اسے اپنا بنا لے گی۔

☆☆☆☆

شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں ہر طرف شاپنگ کے ڈھیر تھے مثل اور مثال کی شادی ایک ہی دن رکھی گئی تھی جس پر معراج نے بہت دادیلا عجاپا کہ عمر امان کی برات کے ساتھ چلا جائے گا اس لئے اس کی شادی ایک دن بعد رکھی جائے تاکہ وہ عمر کو ساتھ لے جاسکے پھر عمر نے ہی اسے بہلایا پھسایا کہ برات جانی تو ایک ہی جگہ ہے ناں تو وہ جاتے ہوئے امان کے ساتھ جائے گا اور آتے ہوئے اس کے ساتھ اس لئے وہ منت ساجت کے بعد مان گیا ان دونوں کی رخصتی ایک ساتھ ہوئی تھی مثل نے تو ردور در حال کر لیا تھا دونوں بیٹیوں کو رخصت کرتے وقت فیاض صاحب کی آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں بہر حال یہ مشکل مرحلہ بھی تہہ ہوا اور ساری رسموں کے بعد اب مشکل کو ردوم میں لایا گیا۔

☆☆☆☆

پوری بات حرف بہ حرف بتائی سوائے اس کے کہ امان کا رشتہ لے کر جانا ان کی پلاننگ تھی وہ امان نے معراج کو منع کیا تھا کہ یہ بات ہمیشہ ان تینوں کے درمیان رہنی چاہئے۔

وہ حیران سی بیٹھی اس کا چہرہ تک رہی تھی۔  
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہو جی بول رہا ہوں اگر میں اس دن والی تصویریں نہ دیکھتا تو میں تمہیں ہمیشہ کے لئے کھودیتا۔“ وہ لہجہ میں محبت سموئے بولا۔ مثل کو اپنی قسمت پر رشک ہو رہا تھا۔  
 ”آئی لو پو مثل۔“ معراج سکندر ایک جذب کے عالم میں بولا۔

”کچھ بولو تو مثل کیا سب میں ہی بولوں گا۔“  
 ”آئی لو پو تو۔“ مثل نظریں جھپکائے بولی۔  
 معراج پر شادی مرگ سی کیفیت طاری تھی وہ یہ سب توقع نہیں کر رہا تھا۔  
 ”مثل! کہیں میں مری نہ جاؤں خوشی سے۔“

”اللہ نہ کرے۔“ مثل کے دل کو کچھ ہوا۔  
 ”ارے یار کوئی کسی سے اتنی جلدی محبت کیسے کر سکتا ہے ابھی آدھا گھنٹہ ہوا ہے تمہیں میرے پاس بیٹھے ہوئے۔“

”معراج! میں نے آپ کو اس آدھے گھنٹے میں ہوئی محبت کے لئے آئی لو پو نہیں کیا بلکہ میں تو آپ سے اس دن سے محبت کرتی ہوں جس دن آپ۔“

”اوہ مائی گاڈ تو تم بھی اسی کیفیت میں تھیں جس میں میں تھا۔“ فرض کر دو مثل اگر میری شادی مثال سے ہو جاتی تو۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”معراج! آپ میرے بخت کا روشن ستارہ تھے تو پھر کیسے اللہ کسی اور کے نصیب میں لکھ دیتا۔“  
 معراج کو اس پر نوٹ کر پیار آیا اس نے اسے خود سے قریب کیا اور نازک سا ہارٹ شپ لاکٹ اسے پہنایا اور محبت سے خود سے قریب کر لیا۔

☆☆.....☆☆

وہ پورے کمرے کا بخور جائزہ لے رہی تھی پورا لہرہ فریش گلابوں سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا ماحول میں گلاب کی مہینگی مہینگی خوشبو رچی ہوئی تھی وہ صبح سے بندھ کر تھک چکی تھی وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے آنکھیں سموندے ارد گرد سے اپنی بے نیاز تھی کہ اُنے والے کی آمد بھی محسوس نہ کر سکی معراج کھڑا مسلسل اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا وہ پھولوں میں بیٹھی پھولوں کا مدہ ہی لگ رہی تھی اس کی نظروں کا ارتکاز تھا شاید کہ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور جلدی سے سیدھی ہو بیٹھی۔

”آئی ایم سوری میں تھک گئی تھی تو اس لئے۔“  
 ”وضاحت دینے لگی۔“

”کوئی بات نہیں اس میں شرمندہ ہونے والی کیا بات ہے۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے بولا مثل نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کتنارہ دیکھت ہے یہ انسان جس کے ساتھ کے کچھ ہی دنوں میں میں نے کتنے سینے بجائے اور پھر اپنے رب سے اسے بھول جانے کی پستی دعا میں بھی مانگیں لیکن آج وہ میرے سامنے ہے صرف میرا ہے ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی خواب ہو۔“ اس کی تنہمیر آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ جیسے خوابوں کی دنیا سے باہر آئی۔

”مثل! تمہیں پانا میرے لئے ایسا ہے جیسے کوئی خواب ہو بہت مشکوں کے بعد ملی ہو تم مجھے ایک لمبے کے لئے تو ایسا لگا کہ میں نے تمہیں کھو دیا ہے۔“  
 ”کیا مطلب مجھے آپ کی کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ مثل کی حیرانگی انتہا پر تھی۔

”ارے واہ مسز معراج سکندر میں کس کرب سے گزر رہا ہوں آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے۔“ معراج مصنوعی غصے سے بولا۔

”کرب کیا کرب؟“ پھر معراج نے اسے



شازیہ مصطفیٰ عمران

سلسلہ وار ناول

# زندگی بہاولیٰ عہدِ خورشید

”مام..... مام!“ زریان کی زوردار آواز آئی۔  
”تم اس وقت جاؤ امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“



”آخا فہر ماموں۔“ عفان اس کے گلے میں جھول گیا۔  
 ”یار آرام سے، بڑے ہو گئے ہو۔“ اس نے عفان کو شانوں سے پکڑا۔  
 ”ہوں آپ سے چھوٹا ہی۔“ وہ ہنسا۔  
 ”مما کھانے میں کچھ ہے؟“ ریان کو بہت زوردار بھوک لگی تھی۔  
 ”یہ تمہارے ماموں آگئے تو باتوں میں لگ گئی اس لیے کچھ بھی بنانے سے رہ گیا۔ چل فہر میرے بچوں کو  
 باہر سے کچھ لاکے دے۔“ کنول نے فہر کے شانے پر زوردار پھینکی دی۔  
 ”میرے ساتھ گھر چلو وہاں کھلا دوں گا۔“  
 ”ماموں برگر کھاتے ہیں۔“ عفان کو باہر کا برگر بہت پسند تھا۔

فرما نمبر 13



”بھئی تم لوگ جاؤ جو بھی کھانا ہے میں رات کے کھانے کے لیے تیاری کر لوں۔“ وہ ان لوگوں کے درمیان سے چلی گئیں۔  
ریان اور عثمان اس کے ساتھ ہی چلے گئے حالانکہ اس کا موڈ بہت خراب تھا مگر ان دونوں کی خاطر سب ہمہ درست کرنا پڑا۔

☆.....☆

تاہید آئی ہوئی تھیں اور حنین اسی وقت آفس سے آیا تھا۔ وہ بات انیسہ سے کر رہی تھیں جو سن اس نے بھی لی تھی۔ اگلے قدموں اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔  
”یعنی آریکہ مجھ سے اتنی بدظن اور خائف ہو گئی ہے اس نے آئی کو بھیجا ہے ان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا ہے۔“ وہ نہا کے فریش ہو گیا تھا مگر اس کا دل دو ماغ الجھ گیا تھا وہ شش و پنج میں مبتلا تھا اسے آگے ایسا کیا کرنا ہے کہ آریکہ کی بدگمانی ختم ہو جائے وہ جیونیک کی بات کر رہی تھیں جب کہ اس نے تو آئی کو سب کچھ کرنے سے منع کر دیا تھا پھر اچانک سے وہ یہ بات کرنے آ گئی تھیں۔  
”بھائی آپ کو آئی بلاری ہیں۔“ حسن اسے بلانے آیا تھا۔  
اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا تو یہ اس نے جیونیک کی پشت پر پھیلا یا چہرہ اس کا خاصا سنجیدہ ہو رہا تھا۔  
پستی کلر کے ایڑی سے لمبے شلوار میں لمبوس وہ انہیں سلام کرتا ہوا داخل ہوا۔  
”جیتے رہو۔“ انہوں نے خوش دلی سے سلام کا جواب دیا اور دعا میں دیئے لگیں۔  
”وہ مودب انداز میں ان کے سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھا چہرے سے لگ رہا تھا وہ بہت سنجیدہ بھی ہے۔“

ہے۔

انیسہ کی نگاہوں نے سب دیکھا۔  
”بیٹا میں انیسہ باجی سے کہنے آئی تھی کہ ہم فرنیچر وغیرہ سب دیں گے آریکہ کی خواہش ہے۔“  
”آئی میں نے آپ کو پہلے ہی منع کر دیا تھا یہ روایتی تکلفات میں نہیں پڑیں۔“ اس نے پہلو بدلا۔  
”میں تو کب سے سمجھا رہی ہوں مگر یہ سمجھ ہی نہیں رہی ہیں۔“  
”آئی آپ نے یہ بات سوچی بھی کیسے؟“

”حنین بیٹا! آریکہ کی خواہش ہے اور یہ اس کا حق بھی ہے۔ پھر ہمارے پاس جو بھی ہے ہماری بیٹیوں کا ہے ان کے لیے ان کے ابو نے سب کچھ کر کے رکھا ہوا تھا۔“  
”آئی میں آریکہ کی یہ بات نہیں مان سکتا۔“ وہ بھی قطعیت بھرے ضدی لہجے میں گویا ہوا کیونکہ آریکہ کی یہ بات تو اسے مانتی ہی نہیں تھی۔

”بیٹا! ادھر اس نے مجھ سے کہہ دیا ہے اگر میری بات نہیں مانتی تو وہ شادی سے انکار کر دے گی اور میں نہیں چاہتی ان کے ابو کو یہ بات پتا چلے۔“

وہ تو سن کے ہی سناتے میں آ گیا اور انیسہ بھی گھبرا گئیں۔

”یہ تو آئی بلیک میلنگ ہوئی جو وہ آپ کو کر رہی ہے۔“

”بیٹا میں کیا کروں میری بیٹی ہے اس کا بھلا ہی سوچوں گی اس لیے بیٹا ہماری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔“

اپنی خند پراڑی ہے۔“ ناہید توروہ ہانسی ہو گئیں۔

”میں بات کروں گی آریکے سے۔“ انیسہ بولیں۔

”ای ر ہنے دیں وہ اگر چاہتی ہے کہ سب کچھ ملے تو ٹھیک ہے۔“ وہ اٹھ گیا۔

ناہید نے اسے جاتے ہوئے دیکھا کیونکہ حنین کے چہرے اور لہجے سے واضح ہو گیا تھا اسے یہ بات پسند نہیں آئی ہے۔

”ناہید کیا آریکے نے ہماری کوئی بات نوٹ کر لی ہے یا حنین کی بری لگی ہے۔“ انیسہ ماں تھیں انہیں بھی حنین اور آریکے کی چیخاؤ کا اندازہ تھا۔

”نہیں نہیں باجی ایسی کوئی بات نہیں ہے، کہتی ہے میرا سارا جہیز کا سامان آپ کو دینا یہ میرا حق ہے۔“ وہ خود ہی عذر بھی تراش کے گویا ہوئیں۔

حنین باہر برآمدہ میں ڈانگ ٹیبل پر بیٹھا اندران کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا دل کبیدگی کا شکار ہو گیا آریکے اس سے حد سے زیادہ مدظن ہو گئی تھی اور یہ فکر مندی کی علامت تھی۔

ناہید انٹی کی آواز پر وہ چونکا جو جانے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔ حنین تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے کسی طرح بھی آریکے سے بات کرنی تھی مگر کیسے اور اسے موقع بھی تو نہیں ملتا کیونکہ وہ نیچے بھی صفائی کرتی نظر نہیں آتی تھی۔

”حنین.....!“ انیسہ کی پکار پر وہ سیدھا ہو کے بیٹھا۔

”جی امی۔“

”بیٹا میں نے تو بہت کہا ناہید سے لیکن وہ مان ہی نہیں رہی ہے۔“

”رہنے دیں کیا کر سکتے ہیں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”حنین مجھے لگتا ہے آریکے کو تمہاری باتیں بری لگی ہیں۔“

”ای میں نے ایسی کوئی بات ابھی تک نہیں کی کہ جہیز وغیرہ کا کیا ہو۔“ اس نے کہا۔

”لڑکی بہت حساس ہے۔“

”جی!“ اس نے بھی سر ہلایا۔

”بیٹا میں نہیں چاہتی شادی سے پہلے ہی تم دونوں میں ناراضی اور تلخی رہی تو زندگی اچھی نہیں گزرتی ہے۔“

وہ پریشان لگ رہی تھیں۔

”شادی کرنا تو بہت آسان ہوتا ہے مگر اسے نبھانا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا سب سے بڑی ذمہ داری ہوتی ہے کسی کی بیٹی کو ساری زندگی کے لیے اپنے ساتھ باندھ کے رکھنا اور اس کی عزت کرنا اور کروانا یہ فرض ہوتا ہے کیونکہ وہ سب کچھ چھوڑ کے ہمیشہ کے لیے ماں باپ کی دہلیز چھوڑ کے آتی ہے اس لیے کہ کوئی اسے بہت چاہے یا نہ کہ لے جا رہا ہو یا نہ کہ اگر ابتداء میں ہی ترشی سرد مہری غلط فہمی جڑ پکڑ جائے تو زندگی ویران ہو جاتی ہے۔“ وہ اسے بڑے سنبھل کے اور ایک ایک لفظ پر زور دے کے سمجھا رہی تھیں۔

حنین سر جھکائے بغور ان کی سن رہا تھا جو ٹھیک کہہ رہی تھیں اس کی زندگی کی ابتداء میں ہی غلط فہمی جڑ پکڑ چکی تھی اور آریکے جیسی حساس لڑکی کو سنبھالنا حنین کو جوئے شیر لانے کے مترادف لگ رہا تھا۔

”آریکے سمجھدار لڑکی ہے۔ میں نے ایسے ہی اس کا انتخاب نہیں کیا ہے۔ ورنہ تو تمہارے خاندان میں بھی لڑکیاں ہیں لیکن تم نے خاندان میں کرنے کو شروع سے ہی منع کیا ہے۔ میری نظر آریکے پر چلی گئی لیکن تم نے اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا ہے۔“ وہ دکھ و افسردگی سے گویا ہوئیں۔

”امی آپ کیا چاہتی ہیں۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد ان سے پوچھا۔  
 ”بیٹا میری تو یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ کروں تو کیا کروں شادی سے پہلے ہی ایسی باتیں ہو رہی ہیں بعد میں کہیں.....؟“ آگے بدلتے بولتے وہ رک گئیں انہیں اندیشے ڈر رہا ہے تھے۔  
 حنین اپنی ماں کی سوچ کو سمجھ رہا تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ اس نے آریکے کے ساتھ مذاق مذاق میں بہت کچھ کہا جس کا نتیجہ اسے نظر آ گیا تھا۔

”ابھی تو آپ چپ کر کے ان کی مانتی جائیے۔“  
 ”کیوں بعد میں پھر تم آریکے کو سناؤ گے۔“ وہ تھوڑا غصے میں ہی آگئیں۔  
 ”نہیں بلکہ میں اس کی غلط فہمی دور کروں گا۔“ اس نے ان کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر یقین دلایا۔  
 ”حنین مجھے اس عمر میں ناہید اور مزید بھائی کے سامنے شرمندہ نہیں کروانا۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔  
 ”ارے امی آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں۔“  
 ”جانے کیوں دل ڈر رہا ہے۔ میں تو خوشی خوشی شادی کی تیاری کر رہی ہوں۔“ وہ لب بھینچ کے رہ گئیں۔  
 ”آپ خوشی خوشی کریں فکر نہیں کریں انشاء اللہ سب اچھا ہی ہوگا۔“ اس نے انہیں اپنے شانے سے لگایا۔  
 ”امی آپ سے ایک بات کہنی تھی۔“ وہ جھجک کے رکا۔  
 ”ہاں بولو۔“ وہ سنبھل گئیں۔

”میں آریکے سے ملنا چاہتا ہوں۔“  
 ”یہ تو بھول کے بھی نہیں کرتا۔“ انہوں نے جھٹ منع کیا۔  
 ”پھر ایسے کیسے ہوگا مسئلہ حل۔“  
 ”ابھی تم چھوڑ دو میں خود ہی بات کروں گی۔ پتا نہیں وہ بچی دماغ میں اور دل میں کیا بیٹھائے بیٹھی ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے انھیں۔

”ارے ہاں تم آگئے ہو تو حرا کو کوچنگ سے لے آؤ۔“  
 ”جی اچھا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔  
 ”محترمہ آریکے صاحبہ تمہیں تو ٹھیک بعد میں ہی کروں گا۔ کیا پتا تم مرکھی گائے کی طرح بدک جاؤ۔“ وہ مرر دیکھ کر مسکرا کے خود سے ہنسا ہوا۔

انیسہ کچن میں چلی گئی تھیں۔ مغرب ہونے والی تھی۔ حنین نے اوپر نگاہ کی شاید کھڑکی سے اس کا عکس نظر آ جائے۔ اب تو وہ بھولے بھٹکے کھڑکی تک میں نظر نہیں آتی تھی۔ نئی نئی گاڑی ملی تھی۔ اس نے سوچا تھا حرا، شرمہ کو اور آریکے کو لے کے باہر ہونگے ہی کرائیں گے مگر حالات ہی ایسے ہو گئے تھے یہ ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔  
 گاڑی اشارت کر دی تھی مگر اسے ایسا لگا باہر روڈ پر کھٹنے والی کھڑکی سے اسے کوئی دیکھ رہا تھا۔ نگاہ اوپر کی تو چھپاک سے ہیولہ ہٹا تھا۔ دل میں خوش گمانی بھی ہوئی وہ تو نہیں تھی خود ہی ہنسا بھی۔

نکیل احمد کو دیکھ کر وہ کھل سی گئی تھی۔ طبیعت خرابی کے بعد سے کمزور ہو گئی تھی۔  
 ”لگتا ہے صرف پڑھائی کی ہے۔ کھانے پینے پر توجہ نہیں دی ہے۔“ انہوں نے نگاہی کپڑوں میں ملبوس نکل  
 فرکو جب دیکھا۔

”ابو آپ بھی تو اتنے دن بعد آئے ہیں۔“ وہ ان کے بازو سے لپٹی بیٹھی تھی۔  
 ”کام کی بزنس کی تھوڑی مصروفیت بڑھ گئی تھی حالانکہ سارا کام ختم ہو چکا ہے مگر اس کی ضد تھی ساری میٹنگز  
 میں ڈیل کروں۔“

نیل فر نے خیمہ کے نام پر پہلو بدلا۔ اندر سے ایک جذبہ اور احساس کروٹیں لیتا کاش وہ اپنے ان دونوں  
 بھائیوں کے ساتھ ہو اور وہ دونوں اس کے غم کے اٹھائیں۔  
 ”ابو حمزہ آفس نہیں دیکھتا۔“

”حمزہ ابھی اپنی پڑھائی مکمل کر رہا ہے اس دفعہ تو اس نے میرا دماغ کھایا ہوا ہے چشموں میں انگلیٹنڈ جاؤں  
 گا۔“ انہوں نے بتایا۔

”میں نے بھی تو آپ سے انگلیٹنڈ جانے کا کہا تھا۔“ وہ قدرے توقف کے بعد بولی تھی۔  
 ”مجھے یاد ہے میں ساری تیاریاں کر رہا ہوں۔ شہوار کا اور زبیدہ بہن کا آئی ڈی کارڈ دے دو۔“ انہیں یکدم  
 ہی یاد آیا۔

”جی اچھا۔“ اس نے سر ہلایا۔

اور شہوار کو بلا کے ہی لے آئی تھی۔

”بیٹا! جلدی سے آپ اپنا آئی ڈی کارڈ دو اور ہاں زبیدہ بہن کا بھی۔“

”بھیا آپ ہمارے دو۔“ زبیدہ بھی وہیں چلی آئی تھیں۔

”دیکھا ابو یہ لوگ مجھے غیر سمجھتی ہیں۔“ وہ جھٹکی سے گویا ہوئی۔

”نہ بیٹی نہ، ایسا کچھ نہیں ہے۔“ انہوں نے جھٹ لٹی کی۔

”پھر منع کیوں کر رہی ہیں۔“ نکیل احمد بھی ان سے توجہ بہہ مانتے لگے۔

”بھیا اچھا نہیں لگتا لاکھوں کا معاملہ ہوتا ہے ہمارا کیا ہے ہم یہاں رک جائیں گے پھر شہوار جاب کا بھی کہہ  
 رہی ہے اس کے لیے اس نے کہیں درخواست دی ہوئی ہے۔“

”یہ جاب ضرور دی ہے۔“ انہوں نے شہوار سے پوچھا۔

”انکل سمجھے میں مشاہدات اور تجربات جانتی ہوں۔ شوق یہی سبب میں یہ جاب کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے  
 نارل انداز میں ہی بتایا کیونکہ اگر مزید کچھ کہا تو نکیل احمد سے ڈانٹ پڑ سکتی تھی۔

”اگر جاب تم سے سوچ کے کرو گی کہ تم بوجہ بوجہ پر تو میں قطعی اجازت نہیں دوں گا۔“

”نہیں نہیں انکل آپ جانتے ہیں مجھے ہر چیز کا شوق ہے بحسب ہے کہ جاب کرنے والی لڑکیاں کیسے اپنی  
 اہمیت پیش کرتی ہیں۔“

”ابو اسے زیادہ ہی افلاطون بننے کا شوق ہے۔“ نیل فر نے ہنس کے اس کا تمسخر اڑایا۔

جاب تو تم بھی کرنے کو کہہ رہی تھیں۔“ شہوار نے یاد دلایا۔

”ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔“ اس نے اپنے سارے شوق صرف اس فہرٹ کی وجہ سے ختم کیے تھے اور یہاں سے

جاتا بھی وہ اسی لیے چاہتی تھی۔

”تم جاب کر بھی نہیں سکتی ہو۔“ شہوار نے کہا۔

”اچھا تو یہ بتائیے آپ لوگ آئی ڈی کارڈ کب دے رہی ہیں۔“

”بھیا، ہمیں رہنے ہی دو وہاں کا ٹھنڈا موسم مجھے نقصان دے گا خواہ مخواہ پریشانی ہوگی۔“ زبیدہ کی پوری

کوشش تھی وہ دونوں نہیں جائیں۔

”ارے وہاں جا کے آپ اچھا محسوس کریں گی۔“

”انکل پلیز مان لیں۔“

نیل فرکانہ پھول گیا تھا۔ شہوار نے دیکھ بھی لیا تھا۔

”میں بھی نہیں جا رہی۔“

”جی!“ شہوار اچھل گئی۔

”نہیں میں پھر بھی جاؤں گی۔“ اسے فہر کا سوچ کے پھر گھبراہٹ ہوئی۔

”نیل فر آپ کا دل ہے تو ضرور جاؤ آپ کی خالہ بھی ہیں مل آؤ گی۔“ نکلیل احمد بھی جانتے تھے کہ وہ

یکسانیت والے ماحول سے ہٹ کے کچھ دن وہاں گزار آئے۔ جب تک وہ گھر کے حالات ایسے گر لیں گے کہ

اسے بھی وہاں لے جا سکیں سب سے بڑا مسئلہ لڑیا کا تھا انہیں اعتماد میں لے کے بتاتا تھا۔

”ابو، خالہ اور شہوار بہانے بنا رہی ہیں نہ جانے کے۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”ہم بہانے نہیں بنا رہے انکل سمجھ گئے ہیں تم گھوم پھر کے آؤ پھر پاکستان ٹور کا پروگرام بتائیں گے۔“ اس

نے نیل فر کو خوش کیا۔

”ابھی بتالو۔“ وہ جھٹ بولی۔

”ابھی کیسے، تم تو جا رہی ہو۔“ اس نے بھی جھٹ کہا۔

”ٹھیک ہے وہاں نہیں جاتی پاکستان ٹور پر چلتے ہیں۔“ وہ بھی وضاحت دینے لگی۔

”تم وہاں سے ہو آؤ پھر چلتے ہیں کیونکہ اس دوران میں جاب بھی ڈھونڈ لوں گی۔“ وہ تو ویسے بھی نیل فر کو

ٹال رہی تھی مگر وہ تو بھند ہو گئی۔

”ابو یہ بعد میں بھی نہیں جائے گی۔“ اس نے منہ بسور کے نکلیل احمد سے اس کی شکایت ہی کی۔

”چلو تو کوئی مسئلہ نہیں ہے جب تک یہ جاب کا ایکسپریس کر لے۔“ انہوں نے بھی اس بحث کو رفع دفع ہی

کیا۔

”شہوار بیٹا آپ یہ یاد رکھیے گا جاب آپ صرف اپنے شوق اور ایکسپریس کے لیے کر رہی ہیں میں مستقل

اسے کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“ انہوں نے ساتھ ہی شہوار کو سنجیدہ لہجے میں ہدایت دی۔

”جی انکل۔“ اس نے جھٹ گڑبڑا کے سر ہلایا۔

شہوار کی سوچ شاید وہ جان گئے تھے اسی لیے اسے پہلے ہی متنبہ بھی کر دیا۔

”میں تمہارے لیے خود جا ب دیکھتا ہوں۔“

”انگل میں خود اپنی محنت سے حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ پھر بولی۔

”ایک تو اسے پتا نہیں کیوں جا ب کا خط سوار ہو گیا ہے۔“ نیل فرکو اس کی یہ رٹ اور ضد سخت ناگوار گزر رہی تھی۔

”جیسے تمہیں انگلینڈ جانے کا خط سوار ہو گیا ہے۔“ اس نے بھی ترکی بہ ترکی چمک کے ہی کہا۔

ٹکلیل احمد مسکرانے لگے دونوں کی طرف دیکھ کر۔

”نیل فرم ایسا کرنا اپنی شاپنگ وغیرہ شروع کر دو کیونکہ چند دن میں تمہارے جانے کا سارا انتظام ہو جائے گا۔“ انہوں نے ساتھ ہی بتایا۔

اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا وہ فہر علی سے بچ کے کچھ دن سکون کے گزارنا چاہتی تھی۔ شاید کچھ عرصہ یہاں نہیں ہوگی تو وہ بھی اسے بھول جائے گا۔

مجھے اب چلنا چاہیے فیاء نے کہا تھا چھ بجے میننگ ہے اور میرا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔“ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

”یہ پیسے ہیں تم اپنی تیاری مکمل رکھنا اور پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھے کال کر دینا۔“

”ابو یہ بھی بہت ہیں۔“ اس نے پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈی دیکھی۔

”پھر بھی ضرورت ہو تو کال کرنا۔“ اس کے ماتھے پر پیار کر کے اور دعائیں دے کے وہ تیزی سے نکل گئے تھے۔ نیل فر نے انہیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا تھا جو چند گھنٹوں کے لیے اس کے پاس آتے تھے اور ہر دفعہ انتظار دے جاتے تھے۔

ٹکلیل احمد شاید تیزی میں تھے وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے تھے مگر دو حیران نظروں نے ان کا تعاقب کیا تھا۔ نیل فر انفر وہی بیٹھی ہوئی تھی ڈور نیل ہوئی۔ وہ چونگی اس وقت کون اور ٹکلیل احمد کے علاوہ یا پھر سلام کے علاوہ تو کوئی شخص آتا ہی نہیں تھا اس پاس کے لوگوں سے میل جول اس نے رکھا ہوا نہیں تھا۔ زبیدہ ہی کبھی کسی کام سے چلی جاتی تھیں۔

”ابو تو ابھی گئے ہیں۔“ وہ صوفے سے اٹھی۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ زبیدہ خالہ نے ہی ڈور کھولا سامنے ہی کنول کھڑی ہوئی تھیں انہیں حیرانگی کا جھکا لگا۔

”السلام علیکم!“ کنول خود بھی گھبرا رہی تھیں۔

زبیدہ خالہ نے ان کے سلام کا جواب دیا۔ نیل فر کی بھی وحشت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔ کہیں فہر تو نہیں آگیا۔

”آ..... آپ.....“ وہ ہراسیگی سے زبیدہ سے ہی لپٹ گئی۔

اتنے میں شہوار بھی اندر سے آگئی۔ کنول کو یوں اچانک سے سامنے دیکھ کر چونگی۔

”آ..... آپ کیوں آئی ہیں۔“

”دیکھو گھبراؤ نہیں میں آئی ہوں اکیلی۔“ وہ اس کے ڈرنے اور خوفزدہ ہونے پر شرمندہ بھی ہو رہی تھیں۔

”خالہ ان سے کہیں چلی جائیں ان کا بھائی بھی آیا ہوگا۔“ وہ تو باقاعدہ روپا نسی ہو گئی۔



”میں کبر رہی ہوں، نہیں آیا میری سن تو لو میں صرف معافی مانگنے آئی ہوں۔“  
 ”آپ بیٹھیے پلیز۔“ شہوار نے بھی کنول کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا وہ پریشان اور واقعی  
 شرمندہ بھی ہیں۔

”خالہ ان سے کہیں جائیں۔“  
 ”نیل فرچپ تو ہو جاؤ میری سن تو لو پلیز۔“ کنول نے گویا التجائیہ انداز میں اس کے ہاتھوں کو تھاما جو خوف  
 اور وحشت سے ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

”کیا سن لوں آپ کا بھائی مجھے زبردستی یہاں سے لے کے گیا۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ پلیز میری  
 عزت کا ہی خیال کریں۔“ وہ سر ہاتھوں میں تھام کے رونے لگی۔

”نیل فرچپ ایلن کی سن لو پھر کچھ کہنا۔“ شہوار نے اسے ڈپٹ کے چپ کر دیا۔  
 ”میں بہت شرمندہ ہوں میرے پاس وہ الفاظ اور جملے نہیں ہیں جو ادا کروں اور آپ لوگوں کو یقین  
 آجائے۔“ وہ بے بس اور ندامت میں گھری ہوئی گویا ہوئیں۔

”میرے بھائی نے بہت غلط حرکت کی ہے اس کے لیے میں نے اسے بہت برا بھلا کہا ہے۔ میں نے اس  
 سے بات کرنا بند کر دی وہ اسی لیے کھسایا ہوا پریشان پھر رہا ہے۔“

”اب کیوں پریشان پھر رہے ہیں۔“ نیل فرنے ترش روی اور رکھائی سے کہا۔  
 ”میں نے اس سے کہا پہلے تم سے معافی مانگے پھر ہی میں بھی تم سے بات کروں گی۔“

”اچھا تب ہی وہ کال کر رہے تھے۔“ شہوار کو یکدم یاد آیا۔  
 ”نیل فرنے اس سے بات نہیں کی۔“

”میں اس انسان کا چہرہ تو کیا آواز تک سننا نہیں چاہتی۔“ وہ تو آگم گولہ ہی ہو گئی۔

”پلیز اسے معاف کر دو۔“ انہوں نے نیل فر کے ہاتھ پھر تھام لیے۔

”آپ کیوں معافی مانگتی ہیں غلط حرکت انہوں نے کی ہے۔“ وہ لب چل رہی تھی۔

”میرا بھائی ایسا نہیں ہے وہ بہت سمجھ دار اور ذمہ دار ہے۔ جانے کیسے تم اسے اچھی لگی ہو، میں خود حیران  
 ہوں کبھی کسی لڑکی کے پیچھے نہیں بھاگا ہے۔“ وہ اس کے ساتھ ہی اس کی خوبی بھی بتانے لگیں۔

”وہ تم سے محبت کرتا ہے اسی وجہ سے وہ ایسا کر گیا۔“

”واہ بہن ہو تو آپ جیسی جو بھائی کی حمایت بھی کرتی ہے اور برا بھی کہتی ہے۔“ نیل فر نے فہمائشی لہجے میں

طفر ہی کیا۔

کنول خفیف سی ہو گئیں۔

”بھائی ہے میرا میں نہیں چاہوں گی کوئی اسے غلط سمجھے۔“

”ایسی حرکت کے بعد بھی غلط نہ سمجھے۔“ اس نے پھر طفر کیا۔

”دیکھو میں ہاتھ جوڑ کے تم سے معافی مانگتی ہوں آئندہ وہ تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔“

”پلیز آپ بڑی ہیں میرے آگے ہاتھ نہیں جوڑیں۔“ نیل فر کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

شہوار اور زبیدہ خالد تو خاموش بیٹھی ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھیں۔

”میرے بھائی کو معاف کر دو۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔  
 ”آپ جانتی ہیں کسی لڑکی کے لیے اس کی عزت ہی سب کچھ ہوتی ہے اگر یہ چلی جائے تو سمجھو وہ مر جاتی ہے۔“

”فہر ایسا نہیں ہے اچھے خاندان کا ہے اور وہ تم سے محبت کرتا ہے کوئی بھی غلط حرکت نہیں کرے گا۔“ لہجے میں دثوق اور یقین تھا۔

”ایک لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر زبردستی اٹھا کے لے گئے، یہ کیا اچھی حرکت ہے۔“  
 ”تم نے خود دیکھا تھا میں نے فہر کو کتنی سنائی تھیں تمہیں خود چھوڑنے آئی تھی۔“ وہ اس کے کہنے پر شرمندہ بھی ہو رہی تھیں۔

”آپ کو نہیں معلوم میرے دل و دماغ کی کیا کیفیت رہی ہے۔ ہر وقت آپ کے بھائی کا ہوا سوار رہتا ہے۔“

”تمہیں اس سے ڈرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں وہ تمہیں ذرا بھی تنگ کرے مجھے بتانا دیکھنا اس کی عقل ٹھکانے میں لگاؤں گی۔“ انہوں نے اسے یقین دلایا۔

نیل فران کے اپنائیت بھرے لہجے پر تحیر زدہ سی رہ گئی وہ اس سے کتنی محبت اور لگاؤ کا اظہار کر رہی تھیں۔  
 ”مجھے بھی معاف کر دو۔“

”پلیز مجھے آپ معافی مانگ کے شرمندہ نہیں کریں میرے لیے یہی کافی ہے کہ آپ نے مجھے یقین دیا ہے آپ میرا ساتھ دیں گی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”ہوں میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ وہ مسکرامیں اور سر ہلایا۔  
 ”آج سے ہم دونوں فریڈ بھی ہیں۔“

”نہیں فریڈ نہیں۔“ اسے تو آگے کے وہم ڈراتے تھے۔

”کیوں بھی فریڈ کیوں نہیں۔“ وہ حیرانگی سے سوالیہ نگاہ ڈال کے پوچھنے لگیں۔  
 ”آپ کے بھائی پھر مجھے.....“

”نیل فرایا کچھ نہیں ہوگا تمہیں تمہاری مرضی کے بغیر وہ کہیں لے جانیں سکتا۔“

”آپ انہیں یہ بھی سمجھا دیں محبت زبردستی حاصل نہیں کی جاتی۔“ وہ اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

شہوار اسے مسکراتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ کتنی جلدی وہ کنول سے صلح جو لہجے میں بات کر رہی تھی۔

”ٹھک کہا محبت زبردستی حاصل نہیں کی جاسکتی یہ تو خود بخود آہستہ آہستہ اپنا راستہ بناتی چلی جاتی ہے اور پھر وہ دل میں گھر کر لیتی ہے۔“ وہ ایک جذب سے بول رہی تھیں۔ نیل فرنے جھینپ کے لب بھیج لے۔

”کہتے ہیں جتنا کسی سے بھاگو وہ اتنا ہی سامنے آتا ہے۔“ شہوار نے بھی مداخلت کی۔  
 ”ہاں یہ تو ہے۔“ کنول نے تائید کی۔

”آپ اپنے بھائی کو اچھی طرح سمجھا دیں۔“ نیل فر کو پھر بھی ڈر رہی تھا۔

”ارے کہہ تو رہی ہوں سمجھا دوں گی تم اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو۔“ کنول اس کے یکنخت بدلتے چہرے کو دیکھنے لگیں جو دھشت زدہ بھی ہو رہی تھی۔

”نیل فر پلینز خود کو مارل کرو۔ پلینز آپ اس کے لیے پانی لائے۔“ انہوں نے شہوار سے کہا۔

وہ تیزی سے اٹھی تھی۔  
نیل فر کے دل و دماغ کی پچھل میں کچھ ٹھہراؤ آیا تھا ورنہ وہ جتنا خوفزدہ ہو گئی تھی اس کا انہیں بھی اندازہ نہیں تھا۔ پانی پیا اور اپنے کھمرے بالوں کو سمیٹا۔  
”اچھا میں اب چلتی ہوں اچانک سے ہی اٹھ کے آگئی تھی۔ بچے بھی کو جنگ سے آگئے ہوں گے۔“ انہیں یہاں آئے ہوئے خاصا وقت ہو گیا تھا وہ بھی ریلیکس ہو گئی تھیں کیونکہ انہیں نیل فر کے چہرے پر اطمینان جو نظر آ گیا تھا۔

”بیٹا میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔“ زبیدہ نے کہا۔  
”آئی چائے آپ سب پر ادھار رہی بعد میں آ کے پیوں گی۔ اگر نیل فر اجازت دے تو۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اجازت طلب لیجے میں پوچھا۔

”جی ضرور۔“ آواز دہی دہی تھی۔  
”تم اطمینان رکھو فہر کو ساتھ نہیں لاؤں گی۔“ وہ نہیں تھیں کیونکہ اس کی سوچ جو پڑھ لی تھی۔  
”کبھی کبھی آنے کی اجازت دو گی مجھے۔“

”جی وہ آپ یہاں آ کے کیا کر لیں گی میں تو بہت بور ہوں۔“ وہ رک رک کے قدرے توقف کے بعد گویا ہوئی وہ کسی طرح بھی نہیں چاہتی تھی کہ کنول یہاں آ میں ورنہ اگر کبھی باتوں باتوں میں انہیں حقیقت کا علم ہو گیا تو یہ اس کے ابو کے لیے پریشانی اور فکر کی علامت ہوگی۔  
”کوئی نہیں بور تو نہیں ہوں مجھے تمہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے تم سب سے ناراض اور کسی چیز کی تلاش میں ہو۔“ انہوں نے اسے بغور جانچنے کے بعد مسکرا کر کہا۔

”نہیں ایسی کوئی کہانی نہیں ہے۔“ جھینپ کے پہلو بدلا۔ شہوار نے مسکرا کر لب بھینچے کیونکہ کنول نے اندازا بہت صحیح لگایا تھا۔

”ابھی تو چلوں گی میں پھر آؤں گی اب تو فرینڈ ہو گئے ہم۔“ انہوں نے نیل فر کو گلے لگا کے پیار کیا اور پھر شہوار کو بھی گلے لگایا۔ زبیدہ خالہ کو سلام کرتی ہوئی وہ تیزی سے نکل گئی تھیں۔

☆.....☆

ماہا کو اس دن سے شہنیل کی ایک بات پریشان کر رہی تھی جو اس رشتے پر ذرا بھی لگاؤٹ ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ صرف اور صرف وہ احسان اتار رہا تھا اور یہ تکلیف دہ تھا اس کے لیے جو شہنیل کو تمام تر شدتوں سے چاہتی تھی۔ اس کا دل و دماغ اس سے ایک لمحے کو بھی غافل نہیں ہوتا تھا اور وہ شہنیل جسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔  
اسے کبھی کبھی لگتا شہنیل مشینی زندگی گزار رہا ہو جسے کسی کا احساس نہیں نہ کسی کے جذباتوں کی قدر ہو۔

”شہنیل کب تک میں تمہارے پتھر دل سے اپنا سر پھوڑتی رہوں گی۔ کب اس پتھر میں دراڑ پڑے گی اور تم میری طرف بڑھو گے۔“ کمپیوٹر کے آگے بیٹھی تھی اور مانیٹر پر شہنیل کی تصویر تھی وہ اسے وارنٹی سے دیکھے جا رہی تھی۔

جب سے اس نے یونیورسٹی جوائن کیا تھا وہ فضول باتوں سے بچ گئی تھی۔ ٹی وی بھی دیکھنا تقریباً ختم ہی ہو گیا

تھا۔ زیادہ تر وقت اس کا اپنی پڑھائی یا پھر کمپیوٹر کے ساتھ گزر جاتا تھا۔ صنوبر کی شادی کے دن قریب آ گئے تھے گھر میں پہلی شادی تھی ساری ہی تیاریاں اچھے طریقے سے ہو رہی تھیں۔ مگر ماہا نے خود کو ان سب چیزوں سے دور رکھا ہوا تھا۔ صنوبر کے سرال اپنی بیماری کے بعد ایک دفعہ بھی نہیں گئی تھی بلکہ کوشش یہی تھی کہ نہ ہی جائے تو اچھا ہے۔

”ماہا آپ!۔“ صبا کی آواز تھی۔

ماہا نے جلدی سے مانیٹر سے سب کچھ غائب کر دیا وہ کسی پر بھی کچھ واضح نہیں کرنا چاہتی تھی۔  
”آپ کو بلایا جا رہا ہے۔“ اس نے ماہا کو چیئر سے اٹھتے دیکھا۔

جو خاصی پرسوج بھی ہو رہی تھی۔

”کون بلا رہا ہے اور کیوں بلایا جا رہا ہے۔“ اپنا بلیک پرنٹ دو پڑے شانوں پر سمینا اور بالوں میں ڈیرنگ ٹیبل سے برش اٹھا کے چلانے لگی۔

”شبیر بھائی بلا رہے ہیں اور آپ کو کہیں لے جانا چاہ رہے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”مجھے لے جانا چاہ رہے ہیں تم کیوں نہیں چلی جاتیں۔“ ماہا نے اس کا افسردہ چہرہ خاصا جا بختی نکا ہوں سے دیکھا تھا۔

”کہہ رہے ہیں ماہا کو بھی ساتھ لے کے جانا ہے۔“

”اس میں اداسی مگر کیوں؟“ وہ ہنسی تھی۔

”کہہ رہے ہیں اپنا حلیہ درست کر دو۔“

”ٹھیک کرو، کپڑے تم پہنچ کرنا نہیں چاہ رہی ہوگی۔“ وہ صبا کی اس کا بلی کا جانتی تھی۔

”کیا ہے منج بدلے ہیں بلکہ کالج سے آنے کے بعد بدلے ہیں اچھے بھلے ہیں۔“ اسے غصہ آیا۔

”اچھا یہ بتاؤ جا کہاں رہے ہیں۔“ بالوں کو لپیٹ کے پھر کیا۔

”آئی کی شادی کا کارڈ اپنی کو لیک کو دینے جا رہے ہیں۔“

”کہیں وہ تو نہیں جو ان کے اسپتال میں جاب کرتی ہے۔“ وہ سن کے خوش ہو گئی کیونکہ شبیر نے اپنی پسند اور ارادے سے سب کو ہی آگاہ کیا ہوا تھا۔

”ہاں وہی امی بھی جا رہی ہیں۔“

”چلو تو چلتے ہیں۔“ وہ خوشی خوشی روم سے باہر آئی تھیں۔

”اے لڑکی تجھے کچھ ہوش بھی ہے ہر وقت کمرے میں تھکی کیا کرتی رہتی ہے۔“

دادی جان نے ماہا کو آڑے ہاتھوں لپا جو ان کے عتاب اور خستگیوں سے بچتی رہتی تھی۔

”دادی جان اپنے کام کرتی ہوں۔“ فصول کاموں میں بیٹھتی ہوں تو پھر بھی آپ کو اعتراض ہے۔“ وہ منہ بسور کے ان کے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔

”ارے شکل تک نہیں نظر آتی ہے فیب کی دلہن۔“ انہوں نے بشری کو پکارا۔

”جی اماں جی۔“ وہ رخسہ بھابی سے کسی گفتگو میں مصروف تھیں چونک کے اور گھبرا کے اٹھ کے آئی تھیں جولاؤ رنج میں کاؤچ پر بیٹھی تھیں۔

”اپنی بیٹی کی صورت دیکھی ہے کھاتی پیتی نہیں ہے یہ لگتا ہے۔“

”دادی جان کھاتی ہوں۔“ ماہا تو گھبرا گئی۔

بشریٰ نے بھی ماہا کو دیکھا واقعی وہ جب سے یونیورسٹی جانے لگی تھی کمزوری لگنے لگی تھی۔

”اس کی صحت کی طرف بھی دھیان دیا کرو۔“ وہ انہیں سنانے لگیں۔

”ارے ماہا آگئیں تم۔“ شہیر بک سک سے تیار ہوا مگر پیٹ پر پنک شرٹ میں ڈیسٹ لگ رہا تھا۔

”تیار نہیں ہوئیں۔“ اس نے ماہا کو گھر کے کپڑوں میں دیکھا۔

”جانا کہاں ہے۔“ وہ دادی جان کے پاس سے اٹھ گئی۔

”امی چچی جان آپ نے اسے بتایا نہیں۔“

”شہیر اسے رنے دو تم اور بھابی چلے جاؤ۔“ بشریٰ نے منع کیا۔

”بشریٰ کیوں منع کرتی ہو میں نے صبا کو بھی چلنے کو کہا ہے۔“ رخشدہ گواہ ہوئیں۔

”تائی امی کسی کے گھر پہلی دفعہ جائیں اور اتنے لوگ، اچھا نہیں لگے گا اور پھر مجھے کچھ کام بھی ہے کل

اسائنمنٹ دینا ہے اسی پر کام کر رہی تھی۔“ جھٹ اس نے نذر تراش کے کہا۔

”ارے تھوڑی دیر کی بات ہے جلدی آجائیں گے۔“ شہیر نے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔

”تائی امی انہیں تو دیکھیں جیسے رشتہ آپ آج ہی پکا کرنے جا رہی ہیں۔“ اس نے شہیر کو معنی خیزی سے دیکھا

جو جھینپ گیا۔

”فضول بکومت۔“

”میں تو تیار ہو کے آگئی۔“ صبا بلیو ایمر اینڈری کے سوٹ میں تیار ہو کے آگئی۔

”آپ لوگ اسے لے کے جائیے میں نیکسٹ ٹائم چلوں گی۔“ وہ ہمتی ہوئی چلی گئی۔

”ماہا بابا۔“ شہیر نے آوازیں دیں۔

وہ اس لیے بھی اسے لے جانا چاہ رہا تھا ماہا ہر ایک سے فریبک ہو کے باتیں کر لیتی تھی وہ رمعنہ سے گھر کے

متعلق پوچھ گچھ کرے گی کیونکہ رخشدہ تو یہ سب نہیں کر سکیں گی۔

”شہیر جھوڑ تم جاؤ دیر ہو رہی ہے۔“ بشریٰ نے خود ہی ان لوگوں کو جانے کو کہا۔

شہیر نے اسے دیکھا جو ہیل پر کسی سے مصروف گفتگو تھی وہ واپس پلٹ گیا۔

ماہا نے گھوم کے دیکھا تھا وہ جارہا تھا خود لان میں پڑے جموے میں بیٹھی ہوئی تھی دوا سمجھیں مسلسل اس کے

تغاقب میں تھیں۔

شہر بل نے اپنے روم کی ونڈو سے اسے ماحول سے ٹکسمر عائب دیکھا۔ بلیک کپڑوں میں ماہا کی سرخ و سپید

رنگت دمک رہی تھی ہاتھ پاؤں بھی نرم و نازک اور شفاف تھے۔ بالوں کو سمیٹ کے کچر کیا ہوا تھا۔ اسی لمحے ماہا کی

نکاہ اٹھی۔

ماہا نے سیل آف کر کے ہاتھ میں دبایا شہر بل پردہ چھوڑ کے ہٹ گیا۔

”مسلسل مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔“ دل میں خوشی کی پلپل ہوئی وہ بھی اسے چھپ کے چوری چوری دیکھتا تھا۔

جموے میں زور زور سے جموے لے لگی تھی۔

وہ کافی دیر تک ہرے بھرے پھولوں سے بھرے لان میں بیٹھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں بیٹھی رہی۔  
 اتنے میں وہ بھی بلیک پینٹ پر کریم لائننگ شرٹ میں بلیس گھرا گھرا کہیں جانے کے لیے باہر آیا تھا۔ ماما  
 کے دل میں کچھ ہوا۔ اپنی تنقیدی نگاہیں اس پر جمائے ہی رکھی تھیں۔  
 ”ہر وقت اکڑا رہتا ہے پتا نہیں بعد میں کبھی ٹھیک ہو گیا یا نہیں۔“ وہ سوچ رہی تھی۔  
 شنہیل نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کا ڈور کھولا اور جھک کر کچھ نکالا۔ کوئی بیگ نما چیز تھی۔  
 وہ نکلا اور چلتا ہوا آنے لگا۔

”یہ آپ کا لپ ٹاپ۔“ شنہیل نے اس کی طرف بڑھایا۔ وہ خیالوں اور سوچوں سے باہر آگئی۔  
 ”اچھا۔“ جھٹ لپک کے لیا۔

”تمہاری طرف سے ہے۔“ خوش فہمی میں جلتا ہوا کے پوچھا۔

”غیب انکل نے مجھ سے کہا تھا میں لے آؤں۔ آج دوپہر میں لیا تھا آپ نظر اب آئی ہیں۔“  
 ”نظر تو روز آتی ہوں مگر تم ہی دھیان نہیں دیتے ہو۔“ ذومنی لہجے میں طنز کیا۔

شنہیل نے لب سمجھ لیے وہ یہ طنز خوب سمجھ رہا تھا۔  
 ”آپ چارنج کر لیجئے گا اور چوبیس ٹھننے یوز کریں اگر کوئی مسئلہ ہو تو بتائیے گا چنچ ہو جائے گا۔“ وہ اسے  
 ہدایت بھی دینے لگا۔

”اس میں مسئلہ ہو گا تو تمہیں بتا دوں جب مجھے تو تم سے مسئلہ.....“ اس نے ترجمہی نگاہ شنہیل پر ڈالی لپ  
 ٹاپ اس نے جھولے میں اپنے قریب رکھ لیا تھا۔

”میں تو ساری زندگی آپ کے لیے مسئلہ بنا رہی ہوں گا۔ ابھی بھی فیصلے کا اختیار آپ کو ہے اپنا راستہ بدل  
 لیں۔“ وہ بھی ترکی بہ ترکی جھٹ گیا ہوا۔

”محبت میں فیصلے نہیں ہوتے ہیں۔“ وہ ہنسی تھی۔

”بغیر محبت کے بھی زندگی بہل نہیں گزرتی۔“ اس نے ماما کے گلابی پرسوچ چہرے پر گہری نگاہ ڈالی۔

”یہ تو تمہیں سوچنا چاہیے۔“ وہ بھی کب ہار ماننے والوں میں سے تھی۔

شنہیل خفیف سا ہوکے لا جواب ہو گیا۔

وہ پراعتاد دینی ایک پاؤں سے جھولا ہلا رہی تھی۔ شنہیل جانے کے لیے مڑا۔

”سچائی سے بھاگ کے جا رہے ہو۔“ لہجے میں طنز تھا۔

”سچائی سے نہیں آپ کے غصے سے بھاگ کے جا رہا ہوں۔“

”تمہیں کیسے پتا لگا مجھے غصہ آ رہا ہے۔“ ماما سن کے حیران رہ گئی۔

”یہ جو آپ مجھ پر طنز کر رہی ہیں یہ آپ کے غصے کو واضح کرتا ہے۔“ وہ اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”غصہ بھی مجھے تم پر آتا ہے جسے سوائے کسی کی فکر نہیں۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔“ اس نے اپنی مسکراہٹ روکی۔ ماما کا سرخ و سپید چہرہ بلیک کمر میں دمک رہا تھا۔

مگر آنکھوں اور چہرے سے غصے کے شرارے بھی واضح تھے۔

”تم میری نفی کرتے ہو کبھی مجھ سے متفق ہوتے ہی نہیں ہو۔“ وہ تپ کے گویا ہوئی۔

”ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے اور کہاں مجھے متفق ہونا ہے میں جانتا ہوں۔“ بہت گہری سوچ کے ساتھ گویا ہوا۔

”اور میں نہیں سمجھتا ہر وقت انسان اس رشتے کے حصار میں ہی رہے۔“  
 ”کون سے رشتے کے حصار میں۔“ جھولارک گیا تھا اور وہ ناہنجی کی کیفیت میں چوکی تھی۔  
 ”آپ کا اور میرا رشتہ۔“ زور دے کے بتایا۔ آج پہلی دفعہ اس نے اس رشتے کی اہمیت کو شاید سمجھ لیا تھا۔ وہ تو لمگ سی رہ گئی۔

”زبردستی کا رشتہ ہے جو تم نے قبول کیا ہے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔  
 ”جیسے بھی کیا ہے قبول تو کیا ہے میں نبھانے کی کوشش کروں گا۔“  
 ”صرف رشتہ نبھاؤ گے۔“ وہ شہنیل کو جیسے الجھانے ہی لگی اسے اچھا لگ رہا تھا وہ اس سے الجھا ہوا تھا۔  
 ”کاش یہ محبت میں بھی اسی طرح الجھ جائے تو؟“  
 ”آپ کو کیا جواب چاہتی ہیں وہ ہو تو گیا ہے۔“  
 ”میں چاہتی ہوں تم بھی مجھ سے محبت کرو۔ میری پرواہ کرو۔ میری فکر کرو۔“  
 ”پرواہ اور فکر۔“ وہ استہزائیہ ہنسی کے ساتھ گویا ہوا۔  
 ”آپ نے مجھے سب کی نظروں میں مگر ادیا ہے۔“  
 ”ٹھیک ہے ختم کرو یہ رشتہ تم مجھے اذیت دے دے کے مار دو گے۔ شہنیل کیوں احسانات کا بدلہ اتار رہے ہو۔“ وہ بھٹ پڑی۔

”احسانات کا بدلہ ارے میں نے تو کچھ بھی نہیں اتارا۔“ وہ اس کے پیچھے پرؤرا سنبھلا۔  
 ”بٹ اپنی دے آپ کی اور میری گفتگو اور بحث یہ لامتناہی ہے کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے کیونکہ ساری زندگی آپ مجھے ایسے ہی برداشت کریں گی پھر کیا ہوگا آپ اکٹنا جائیں گی۔“ اسے جیسے ماہا کی فطرت سے آگہی تھی۔  
 ”میں نے تم سے محبت کی ہے کوئی دل کو بہلا دیا نہیں تم جتنا بھی مجھ سے بھاگو دیکھنا ایک دن تم خود میری محبت اور اہمیت کو مان جاؤ گے۔“ اعتماد یقین اور وثوق تھا۔

شہنیل نے بغور دیکھا وہ سنجیدہ اور اداس بھی ہو رہی تھی۔  
 ”آپ لیپ ٹاپ چیک کر لیجئے گا اور پھر بتا دیجئے گا۔“ وہ انور کرتا ہوا مڑ گیا تھا۔  
 ماہانے دانت جیسے مگر حسرت بھی جو وہ اسے جاتے دیکھتی رہی۔  
 شہنیل گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور پھر وہ آہنی گیٹ سے گاڑی لے کے نکل گیا تھا۔  
 ”اللہ کرے شہنیل تم بھی میری محبت کے لیے ترسو۔“ آنکھوں میں نمی در آئی لیپ ٹاپ اٹھایا۔ شام بھی گہری ہو چکی تھی نواداسے ڈھونڈنا ہوا لان میں آ گیا تھا۔ بشری اسے بلارہی تھیں۔

☆.....☆

”فیاض! میں کچھ بڑی رہوں گا آفس تم دیکھ لیتا۔“ انہوں نے کہا جو ذر کے بعد لاؤنچ میں آ گئے۔  
 64 انج کی ایل ای ڈی پر نوز لگا کے بیٹھ گئے تھے۔

”جی اچھا۔“ اس نے ٹکیل احمد پر ایک نظر ڈالی۔

”اور ہاں پانچ لاکھ کیش کروالینا۔“ ساتھ ہی ہدایت بھی دی۔

”پانچ لاکھ۔“ ضیاء نے چونک کے دیکھا۔

”ثیا ملازمہ سے ٹیکل صاف کروا رہی تھیں اور حمزہ بھی اچھلتا کودتا وہاں آ گیا۔

”یار تم تو ایسے چونک کے مشکوک لگا ہوں سے دیکھتے ہو جیسے میں تمہارا باپ نہیں تم ہو۔“ وہ برہم ہو گئے۔

”ضیاء جرز ہو گیا ثیا کو ان کی کھیا نے اور بے زاری کی عادت پر کبھی کبھی افسوس ہی ہوتا تھا۔

”تمہیں ابو میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ آپ کبھی اچانک سے پیسے نکالنے نہیں ہیں۔“ وہ شپٹاتا گویا ہوا

کیونکہ ٹکیل احمد کا جارجانہ اور برہم لہجہ نہیں تھا۔

”جلدی نکلو الینا میں آفس تو جاؤں گا نہیں۔“

”ثیا کے جانچنے اور تفتیشی انداز نے حمزہ کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

”ای آپ اب کو ایسے دیکھ رہی ہیں جیسے ابو پیسے اپنی کرل فرینڈ کے لیے لے رہے ہوں۔“ اس نے بے

ساختگی سے کہا۔

”فضول مت ہانکا کرو۔ ابھی سن لیا تو تمہاری بھی شامت آجائے گی۔“ انہوں نے حمزہ کے سر پر چپٹ

لگائی۔

”ارے بھی آپ فارغ ہو گئی ہوں تو ذرا ادھر آ کے تو بیٹھیے۔“ ٹکیل احمد نے رخ موڑ کے ثیا کو دیکھا جو

ڈانٹنگ ہال میں حمزہ سے باتوں میں لگی تھیں۔

”ضیاء نے ایک نگاہ اٹھائی اس کا ذہن بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ فہر کی مہم ہی وہ بات ضرور کچھ تو ہے جو ٹکیل احمد

چھپا رہے تھے کو ن سافلیٹ ہے اور کہاں ہے؟ اس کے ذہن میں سوالیہ نشان تھا۔

”جی آتی ہوں۔“ ڈانٹنگ ٹیکل کو صاف کرواتے وہ خود بھی ہاتھ دھو کے آ گئی تھیں۔

”امی ابو نے آپ کو بلایا ہے کچھ تو ہے۔“ حمزہ کو بھی تجسس ہوا وہ ان سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔

”ثیا کا ڈچ بریڈ تھی تمہیں جب کہ ضیاء کی نگاہ ایل ای ڈی کی اسکرین پر غائبانہ ہی تھی۔

”آپ ضیاء کی شادی کب تک کریں گی۔“

”کیا شادی.....!“ حیرانگی سے اچھلنے کی ضیاء کی باری تھی۔

”ارے واہ! ابو آپ نے تو چھکار مار دیا۔“ حمزہ کو تو سن کے ہی مزہ آیا۔

”اس کی شادی بہت ضروری ہے کیونکہ یہ اپنی بیوی اور بچوں میں مصروف رہے گا تو باپ کی ٹوہ میں نہیں

رہے گا۔“ ضیاء تو جھل ہو گیا۔

”ثیا بیٹنے لگیں جب کہ حمزہ کا تو زبردست قبضہ پڑا تھا۔

”آہستہ ہنسواناؤں کی طرح۔“ ٹکیل احمد نے اسے سرزنش کی حمزہ کی بیٹی اندر ہو گئی۔

”آپ اس کے بارے میں سوچیے۔“ وہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھے۔

”ثیا نے چونک کے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے جب کہ ضیاء تو لب بھینچ کے رہ گیا۔

”صاحبزادے سے پوچھ لیں اگر کوئی پسند ہو تو۔“



”میری کوئی پسند نہیں ہے اور مجھے شادی کرنی بھی نہیں ہے۔“ وہ تونک گیا۔  
 ”سنو شادی تو تمہیں کرنی ہوگی کیونکہ تمہارے باپ کی بھی ہوئی ہے۔“ وہ سختی سے گویا ہوئے۔  
 ”ابو آپ تو میرے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔“ وہ کھسیا گیا۔  
 ”میں جو کہ رہا ہوں اس پر عمل کرو آپ اس کے لیے لڑکی دیکھیں اور جلد سے جلد شادی کریں۔“  
 ”ابو اتنی جلدی لڑکی ملنا مشکل ہے۔“ حمزہ نے پھر اپنی مداخلت ضروری سمجھی۔  
 ”تم تو چپ کر دو۔“ ضیاء نے بھی سے ڈانٹ دیا کیونکہ اس کی رونے جیسی صورت ہو رہی تھی۔  
 ”ثیا کو نہی تو آ رہی تھی مگر وہ خود پر کنٹرول کیے بیٹھی تھیں۔  
 ”میں جا رہا ہوں کہیں ضروری میننگ ہے۔“  
 ”رات میں بھی میننگ ہے؟“ ثیا نے ناگواری سے پوچھا۔  
 ”ہوں آ جاؤں گا مگر یہ بجے تک۔“ وہ اپنا سیل اور گاڑی کی چابی اٹھا کے چل دیئے۔  
 انہیں اگر اپنے کسی کام سے جانا ہوتا تھا تو سلام کو ساتھ نہیں لے جاتے تھے بلکہ گاڑی خود ڈرائیو کرتے تھے۔  
 ”ضیاء کوئی پسند ہے لڑکی؟“  
 ”اچھی کیا ہے آپ بھی۔“ وہ جڑ گیا۔  
 ”بیٹا تمہاری عمر شادی کی ہو گئی ہے۔ اچھا ہے بہو آ جائے گی۔ مجھے بھی آسانی ہوگی پورا دن اکیلی ہوتی ہوں۔“ انہوں نے کہا۔  
 ”میں کنول سے کہوں گی زہرہ بھی فہر کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں۔ اچھا ہے تم دونوں ساتھ منٹ جاؤ گے۔“ حمزہ کی تو اس کی صورت پر کھی کھی ہو رہی تھی۔ ضیاء تو الگ مسئلوں میں الجھا ہوا تھا یہ شادی کا گھڑا اک پھیلا دیا تھا۔  
 ”امی رشتے کروانے والی سے بھی رجوع کر لیں۔“ حمزہ نے پھر شرارت سے لقمہ دیا۔  
 ”اپنی شادی کے لیے کر لینا رجوع۔“ وہ اس کے سر پر چپت لگا کے غصے میں اٹھ گیا۔  
 ”ثیا الگ پریشان تھیں نکیل احمد کی سرگرمیاں بڑھتی ہی جا رہی تھیں زیادہ تر وقت ان کا باہر گزرنے لگا تھا۔  
 ”امی مجھے پتا ہے آپ کیا سوچ رہی ہیں۔“  
 ”کچھ نہیں سوچ رہی، تم اٹھو اور زہرہ کا نمبر ملا کے دو۔“  
 ”کیوں پھو پھو کیوں۔“ اس نے حیرانگی سے استفسار کیا۔  
 ”خیر خیریت لوں گی بہت دن سے وہ آئی بھی نہیں ہے اور میں ضیاء کے لیے بھی بات کر لوں گی۔“  
 حمزہ نے پی ٹی وی ایل سے نمبر ملا دیا تھا۔ ثیا زہرہ سے باتوں میں لگ گئی تھیں اور حمزہ ضیاء کو تنگ کرنے اس کے روم میں جا رہا تھا۔ ابو کا کریڈٹ کارڈ نیل پر پڑا نظر آیا وہ رک گیا۔  
 ثیا نے اشارے سے اس سے لے لیا۔  
 ”کنول سے کہنا ضیاء کے لیے بھی کوئی لڑکی دیکھ لے۔“  
 ”ہاں ہاں ارادہ کر لیا ہے۔“ ثیا انہیں بتا رہی تھیں۔

”امی لڑکی کی خوبیاں بھی تو بتائیے۔“ حمزہ نے بغیر شرارت سے کہا۔  
 ”تم اپنے روم میں جاؤ مجھے بات کرنے دو۔“ انہوں نے اسے گھمبوروہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ ثریا کافی دیر تک زہرہ سے باتوں میں لگی رہیں۔

”تم فہر کے لیے بھی تو کوئی لڑکی دیکھ رہی تھیں؟“  
 ”کنول سے کہا تھا کہ بے گلی کہ ابھی رک جائیں۔“ زہرہ نے بتایا۔  
 ”زہرہ میں تو اکیلی رہتی ہوں سارا دن ان کے ابو نے کہا ضیاء کی شادی کرو۔“  
 ”ضیاء سے پوچھی کوئی لڑکی تو پسند نہیں ہے؟“

”اسے میں جانتی ہوں بالکل اچھے لڑکے کی طرح ہے صرف آفس، آفس اور کچھ نہیں۔“ ثریا نے انہیں بتایا۔  
 حمزہ مسلسل درمیان میں انہیں لگے دیئے جا رہا تھا۔  
 ”اچھا زہرہ میں تم سے بعد میں تفصیلی کسی دن گھر آ کے بات کروں گی یہ حمزہ بہت تنگ کر رہا ہے۔“ انہوں نے پھر ان سے اجازت لی تھی۔

”ذرا تیز چھو کے نہیں گزری۔ بات بھی نہیں کرنے دی۔“ انہوں نے حمزہ کو سرزنش کی۔  
 ”میں یہ بتانے آ رہا تھا بھائی جان کو دیکھیں جا کے گم صم سے بیٹھے ہیں لاؤنچ میں۔ پوچھیے ان سے جا کے۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا!“ وہ انہیں اور ضیاء کے پاس چلی آئی تھیں۔  
 ”امی پلینز شادی پر کوئی بھی ڈسکس نہیں کیجیے گا۔“ وہ چڑا ہوا تو پہلے ہی تھا۔  
 ثریا کو ہنسی آ گئی۔

”اچھا نہیں کر رہی مگر صورت ٹھیک کر دو تمہاری پسند کا خاص خیال رکھوں گی۔“ انہوں نے اس کی پشت پر تھپکی دے کر شرارتی انداز میں یقین دلایا وہ جھینپ گیا حمزہ کو دیکھ کر وہ اٹھا کیونکہ مسلسل تنگ جو کیے جا رہا تھا۔

☆.....☆

آریکے کی مانی گئی تھی حنین نے بھی چپکی سادہ لی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کسی طرح تو اس سے بات ہو جائے۔ مگر وہ تو رانداری اور سیریزوں کی صفائی تک کرتی نظر نہیں آتی تھی یا پھر اس نے جان بوجھ کر کرنی چھوڑ دی تھی۔ کبھی شمرہ تو کبھی تابید آئی صفائی کرتی تھیں۔

شادی کے دن اس تیزی سے گزر رہے تھے کچھ وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ حنین کی جاب بھی بہت اچھی تھی۔ ماسٹرف گاڑی ملی تھی بلکہ اس کی سیلری میں بھی معقول اضافہ ہوا تھا۔ انیسہ تو بہت خوش تھیں کیونکہ آریکے ان کے گھر میں آنے سے پہلے ہی خوشی میں اضافہ کا باعث تھی۔

”بھائی اپنے روم کے پردے تو چھین کر والیں۔“ حرا نے کہا۔

”مجھے کیا پتا تم لوگ جانو پردے چھین کرنے میں یا نہیں۔“ وہ انبار کے مطالعے میں منہمک تھا۔

”میں آریکے کو ساتھ لے لوں گی وہ اپنی پسند سے لے لے گی۔“ انیسہ نے ڈانٹنگ نیبل پر روئی کا ہات

پاٹ رکھا۔

”امی آپ ہر معاملے میں اس سے کیوں پوچھتی ہیں۔“ وہ خوانخواہ ہی چڑ کے بولا تھا۔  
 ”ارے ابھی تک میں نے اس سے پوچھا ہے اور اس نے ابھی تک بھی نہ تو اپنی کوئی پسند بتائی اور نہ ہی  
 شاپنگ کرنے گئی ہے۔ تم کیوں اتنا چڑ رہے ہو۔“ انہوں نے تاسف اور حیرانگی سے کہا۔  
 اتنے میں حسن بھی کھانے کے لیے آگیا۔ حرا گلاس اور جگ رکھ رہی تھی۔  
 ”ظاہر ہے مجھے تو چڑ ہوگی آپ اتنا سر چڑھا رہی ہیں۔ اپنی مرضی اور پسند سے کریں شاپنگ۔“  
 ”بھائی جان کول کول۔“ حسن بھی اس کے غصے سے بولتے انداز پر گویا ہوا۔  
 ”ارے میں تو اس لیے پوچھ رہی ہوں اچھا ہے اپنی پسند سے لے تو میری ذمہ داری ختم ہو۔“ وہ خاصی تھکی  
 تھکی لگ رہی تھیں۔

وہ تینوں کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ انیسہ کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ انہوں نے حنین کے سامنے اپنی  
 طبیعت ظاہر نہیں کی تھی مگر حسن نے انہیں بغور دیکھا۔  
 ”امی..... امی کیا ہو رہا ہے آپ کو۔“ وہ چیئر سے اٹھا۔ حنین بھی چونکا حرا نے تو ہاتھ میں پکڑی روٹی پلیٹ  
 میں رکھی۔

”امی امی کیا ہو رہا ہے۔“ حرا تو رونے لگی تھی۔ اتنے میں انیسہ بے ہوش ہو گئیں حنین بھی گھبرا گیا۔ اچانک  
 سے ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔

وہ دوڑ کے قریبی کلینک سے ڈاکٹر کو لے آیا۔ رات تھی، ڈاکٹر بھی آنے میں نخرے کر رہا تھا۔  
 ”بی بی ہائی ہے۔ کوئی ٹیبلٹ تو لینی ہوگی۔“  
 ”روزانہ ناشتے کے بعد کھاتی ہیں۔“ حنین نے بتایا۔

”لگتا ہے آج نہیں کھائی ہے انہوں نے فوراً ٹیبلٹ کھلائیں اور انہیں جوس وغیرہ دیں آرام کروائیں کچھ  
 ٹینشن بھی لگ رہی ہے۔“ ڈاکٹر نے تفصیلی چیک اپ کرنے کے بعد کہا تھا۔  
 حرا تو اوپر سے ناہید آئی کو بھی بلا کے لے آئی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنے سامنے ہی ٹیبلٹ کھلوائی تھی۔  
 ”امی آپ ذرا خیال نہیں رکھتی ہیں۔“ وہ ڈاکٹر کے جانے کے بعد ان پر ناراض ہونے لگا۔  
 ”بیٹا آج ہی بھول گئی تھی ٹیبلٹ کھاتی۔“

”تم دونوں تو کم از کم ان سے پوچھ لیا کرو یہ دوائی کھاتی بھی ہے یا نہیں۔“ وہ انیسہ کا سر دوبار ہاتھ ناہید کو  
 دیکھ کر وہ ذرا سنبھل گیا۔

”باجی کیسی طبیعت ہے۔“

”ٹھیک ہوں۔“ انیسہ نے کہا۔

”ناہید میں تو جلدی کی ہی شادی کی تاریخ رکھ رہی ہوں کافی دن لگ رہے ہیں شادی میں۔“  
 حنین کو ان کی جلد بازی پر ذرا غصہ بھی آیا۔

”امی..... امی آپ کیا کر رہی ہیں؟“

”تم چپ کرو۔“ انہوں نے حنین کو ڈانٹ دیا۔

”انیسہ باقی آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں تین مہینے تو رہ گئے ہیں۔“  
 ”ناہید مجھ سے صبر نہیں ہو رہا۔“ انیسہ نے نظر زدہ لہجے میں کہا۔ حنین وہاں سے اٹھ گیا جب کہ حرا تو اور  
 جلدی شادی کا سن کے خوش ہو گئی۔

”باجی آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔“  
 ”میں جانتی ہوں آرکے جلدی آجائے۔“ وہ ان کا ہاتھ تھام کے گویا ہوئیں۔“  
 ناہید تذبذب کا شکار ہو گئی تھیں انیسہ اتنی پریشان ہو رہی تھیں ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دیں۔  
 ”میں آرکے کے ابو سے بات کروں گی ویسے بھی ہال بک کر دوائے جانے والے ہیں آج کل میں۔“  
 ”تم ایسا کرو اگلے مہینے کی میں تاریخ کارکھ لو۔“  
 ”اچھا اچھا آپ اتنی پریشان نہیں ہوں۔“ وہ انہیں تسلی دینے لگیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ ان سے  
 اجازت لے کے چلی گئی تھیں۔

حنین نے تو اپنا سر ہی تھام لیا تھا۔  
 ”حنین مجھے تمہاری طرف سے فکر ہے۔ تمہارے موڈ کی کوئی خبر نہیں ہے کسی کی بچی کو میں نے بڑی چاہو  
 سے مانگا ہے۔“ انہیں تو اندیشے ستانے لگے تھے۔  
 ”جب میں نے آپ سے کہہ دیا کہ میں آپ کو شرمندہ نہیں کرواؤں گا پھر کیوں آپ نے ان سے اتنی  
 جلدی کا کہا۔“ وہ خاصا سنجیدہ لگ رہا تھا۔  
 ”جانے کیوں دن مجھے پہاڑ کی طرح کٹنے لگے ہیں مجھ سے تو بازار بھی نہیں جایا جا رہا آرکے چلتی نہیں  
 ہے۔“

”کیوں آپ جا رہی ہیں اسے جو کچھ لینا ہو گا آکے لے لے گی خود۔“ اس نے انیسہ کا کمر اور نحیف چہرہ  
 خاصی فکر مندی سے دیکھا۔  
 ”بیٹا دلہن کے جوڑے اور چیزیں ضروری ہوتی ہیں پھر دلہن کے رشتے دار وغیرہ بھی تو پوچھتے ہیں بری میں  
 کیا آیا۔“

”اف امی ایک تو آپ عورتوں کی سمجھ نہیں آتی بری چیز پتا نہیں کیا کیا رسیں بنائی ہوئی ہیں کوئی ضرورت نہیں  
 ہے آپ کو بازار جانے کی جو ہو گئی شاپنگ بہت ہو گئی ہے۔“ اس نے بھی قطعیت بھرے لہجے میں انہیں کہا۔  
 ”بیٹا تھوڑی بہت رہ گئی ہے۔“

”میں سمجھ گیا آپ نے شادی کی تیاری کی ٹینشن لے لی ہے۔“ وہ بولا۔  
 ”میرے پہلے بیٹے کی شادی ہے کسی قسم کی کوئی کمی نہیں رہنے دینا چاہتی۔“  
 ”بس امی رہنے دیں جو کچھ آپ کو چاہیے مجھے بتادیں میں حرا کو ساتھ لے کے آؤں گا۔“ اس نے پھر اپنی  
 خدمات پیش کیں۔

”شادی ولیمرہ کا سوٹ رہ گیا ہے میں نے کہا وقت کے وقت لوں گی تو زیادہ اچھا ہے۔“

(جاری ہے)



ہماری ضرورت پوری ہو رہی ہے اللہ تعالیٰ نے ہمارا کام چلا رکھا ہے اور ہمارے لئے ہمارا اللہ کافی ہے۔ وہ مطمئن انداز میں بولے۔

”لیکن گھر میں جائے کی پتی کافی، چینی نہیں ہے رمضان تو جیسے تیسے گزر رہی گیا ہے تقریباً اور اس مہینے نے ہمارے قانون کا بھرم رکھ لیا کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں بچا تو روزے رکھ لئے عبادت بھی ہو گئی اور عزت بھی بچ گئی، لیکن دو تین روز میں عید الفطر ہے تب کیا کریں گے؟ پہلی بار ایسا ہوگا کہ ہم عید ملنے کے لئے آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارات نہیں کر سکیں گے، کھجور اور شربت پر ہی عید مبارک کہنا پڑے گا اور تو اور اس بار ہم چوڑیاں جھمکے نیاز پر بھی نہیں خرید سکیں گے بھلا ایسی ہوتی ہے عید آپ ہمیشہ ہمیں عیدی دیا کرتے ہیں تحفہ دیا کرتے ہیں وہ بھی اس بار ملتا دکھائی نہیں دے رہا۔“ عفت آراء کا دکھ اور غم کسی طور پر کم نہیں ہو رہا تھا بولتی چلی گئیں نواب زیب الحسن نرمی سے سمجھانے لگے۔

”اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھئے وہ ضرور کوئی نہ کوئی سبب پیدا فرما دے گا اور آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں عفت آراء ہنگم کے بچپن سے لے کر آج تک آپ ہر عید بہت شان اور اہتمام سے منائی ہے ان شاندار اور خوشگوار عیدوں کا شکریہ ادا کیا آپ نے؟ نہیں نا؟“ سینکڑوں خوشگوار عیدوں کا شکریہ ادا نہیں کیا آج تک اور ایک عید ذرا سی مفلسی میں آ رہی ہے تو آپ نے شکوے شکایتوں کی زبان کھول لی ہے بلکہ دکان کھول لی ہے یہ تو بہت غلط بات ہے ہنگم صابہ

”عفت آراء! آپ کیوں منہ بنائے بیٹھی ہیں؟“ نواب زیب الحسن نے انہیں منہ بسورے بیٹھے دیکھ کر پوچھا تو وہ ساٹ لہجے میں بولیں۔

”ہمارا منہ تو پہلے سے بنانا یا ہے ہم کیوں بنانے لگے؟ ہم سے تو عید کے لئے شیر خرمنہ بھی نہ بن سکے گا اب کے۔“

”کیوں بھی عفت آراء! ایسا کیا ہو گیا؟“

”جیسے آپ تو کچھ جانتے ہی نہیں ہیں؟ نام کی نوابی میں صرف چار دن کی عزت ملا کرتی ہے پیٹ نہیں بھرا کرتا نواب صاحب ساری عمر جس دپور کو ہم نے یاں اور جس بھائی کو آپ نے باپ بن کر پالا پوسا، اعلیٰ تعلیم دلوائی شادی کرائی وہی ہماری پیٹھ میں پھرا گھونپ کر چلے گئے ساری دولت ہتھیالی ہمیں پیسے کو محتاج کر دیا اور آپ چاہتے ہیں کہ ہم اب بھی چین کی بانسری بجائیں۔“ عفت آراء نے آزر دگی سے کہا تو وہ کل حراجی سے بولے۔

”نہیں لیکن رمضان کی رحمتوں برکتوں والے ماہ مبارک میں نا امید ہونا دل برا کرتا تو اچھی بات نہیں ہے نا، ہمیں یقین ہے کہ چھوٹے بھائی صاحب کو جلد احساس ہو جائے گا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ غلط کیا نا انصافی کی وہ خود واپس بھی لوٹے تو بھی ہمارے حصے کی جائیداد ہمیں ضرور لوٹا دیں گے۔“ نواب زیب الحسن نے خوش فہم اور پرامید لہجے میں کہا تو وہ سلگ کر بولیں۔

”بھول ہے آپ کی کوئی واپس لوٹانے کے لئے تو نہیں لوٹا نواب صاحب۔“

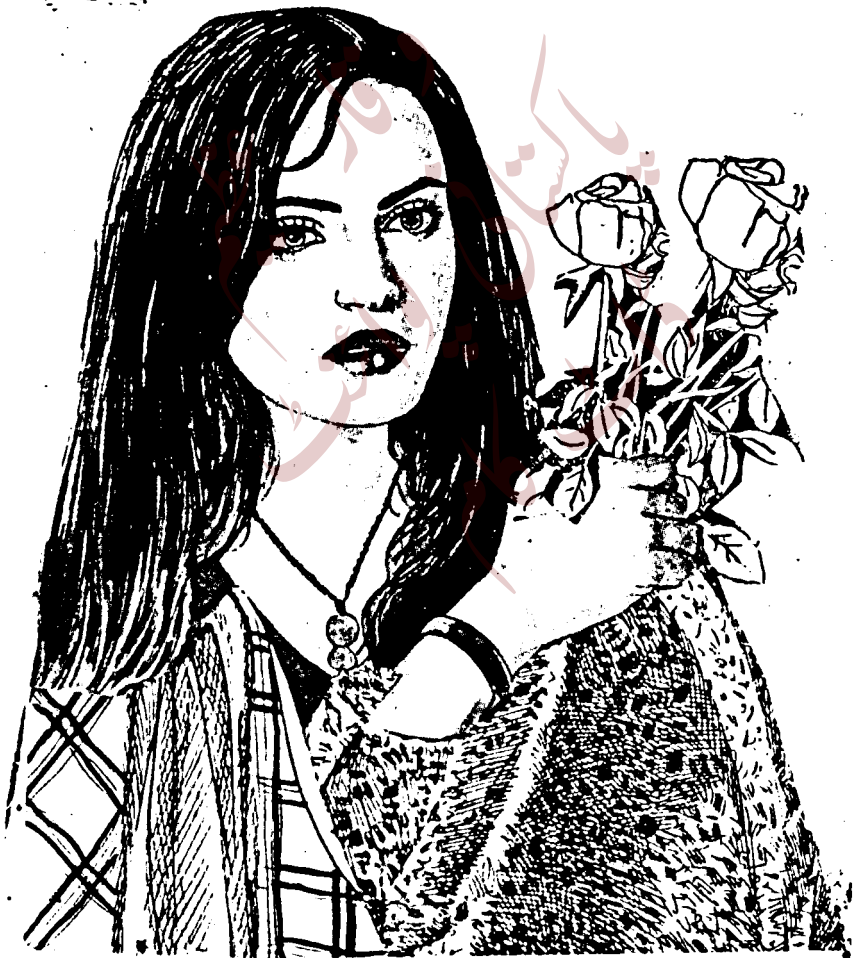
”چلیں خیر ہے وہ خوش ہیں ہمیں کوئی غم نہیں ہے

انسان اگر شکر ادا کرتا رہے تو زبان کو شکوہ کرنے کی عادت نہیں پڑتی۔“

”ہاں درست فرمایا آپ نے ہم نے تو یہ سوچا ہی نہیں کہ آج تک ہم ساری عیدیں ہنسی خوشی اپنی ہر خواہش کو پورا کرتے ہوئے بڑے اہتمام سے مناتے رہے ہیں کیا ہوا اگر ایک عید پر ہاتھ تنگ ہو گیا تو عید تو جگہوں میں رہنے والے بھی مناتے ہیں پھر ہم کیوں نہیں ہم تو اپنے گھر میں رہتے ہیں ہاتھ تنگ ہے سوچ اور دل کیوں تنگ کریں ہم۔“ عفت آراء نے ان کی بات کو سمجھتے ہوئے شرمندہ ہو کر کہا تو وہ

مسکراتے ہوئے بولے۔

”ہاتھ تنگ ہو تو ہاتھ پھیلا دیں اللہ کے سامنے پھر دیکھیں کیسے آپ کے ہاتھ اپنی نعمتوں سے اور جھولی اپنی رمتوں سے بھر رہا ہے۔“ نواب فیب الحسن مسکرا کر نرم دھیسے لہجے میں بولے تو وہ پر غم آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا دیں نواب فیب الحسن اور یکدم فردوس نواب مزید الحسن کے دو بیٹے تھے بڑے بیٹے نواب فیب الحسن اور ان سے دس برس چھوٹے نواب ارباب الحسن تھے نواب مزید الحسن ریاست بہاولپور کے نواب تھے رحم دل



الحسن کے بیٹا، بیٹی شادی کے بعد کینیڈا شفٹ ہو گئے تھے انہیں ماں باپ کی پریشانی کی فکر ہی نہیں تھی النادہ سب کچھ گنوانے پر ماں باپ کو ہی مورد الزام ٹھہرا چکے تھے کہ ان کی بے ذوقی اور اندھے اعتبار نے انہیں یہ دن دکھائے ہیں اولاد کے اس رویے نے الگ انہیں دیکر کیا تھا مگر وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں سرخرو رہے تھے اس بات کا اطمینان تھا انہیں۔

☆☆☆☆

”بیچے بیگم صاحبہ! شیر خر مے بتانے کا سارا سامان لے آئے ہیں ہم اور مٹھائی، نمکو بھی“۔ نواب نیب الحسن ہاتھوں میں شاہراہ اٹھائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تھے۔

”اتنا کچھ بیچ بتائے پیسوں کا بندوبست کس نے کیا؟“ رفت آرام سینتالیس برس کی عمر میں پینتیس برس کی خوبصورت خاتون لگتی تھیں تو نواب نیب الحسن سینتالیس برس کی عمر میں بہت باوقار اور شاندار شخصیت کے مالک تھے دونوں کی جوڑی خاندان بھر کی سربراہی نظروں کا مرکز رہی تھی ہمیشہ سے۔

”اللہ تعالیٰ نے“۔ نواب نیب الحسن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ تو ہے ہی مگر سب وسیلہ تو بتائیں؟“

”ارے بیگم صاحبہ! ہم نے ایک انگلش ناول کا ترجمہ کیا تھا آج اسی کی رائٹنگ ملی تھی سو ہم یہ سامان خرید لائے ہیں کچھ اور ضروری سامان بھی آجائے گا ہم نے کریانے والے کو پیسے اور سامان راشن کی لسٹ بچھادی تھی وہ شام تک سب سامان دے جائے گا۔“

”یا اللہ شکر ہے پروردگار تو واقعی بڑا مہربان ہے رحیم و کریم ہے تیرا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔“ عفت آرام نے ہاتھ پھیلا کر رب کا شکر ادا کیا تو نواب نیب الحسن خوشی سے مسکرا دیے۔

”اریب میاں خوش نہیں ہیں بیوی سے بھی ناراضی چل رہی ہے اور اپنے کئے پر نادم بھی بہت

تھے جدی پشتی نواب ہونے کے باعث سب ان کا احترام کرتے تھے عفت آرام میں برس کی تھیں جب وہ لیکن بن کر نواب حویلی آئی تھیں اور نواب نیب الحسن اس وقت بائیس برس کے تھے بیگم فردوس نواب مزید الحسن کو نمونہ بنا ہوا اور جانبر نہ ہو سکیں ایسے میں بارہ سالہ اریب الحسن کو عفت آرام اور نواب نیب الحسن نے خاص توجہ دی ماں اور باپ دونوں بن کر بالآخر وقت گزر رہا تھا نواب نیب الحسن اور عفت آرام کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا تھا دونوں کی شادی کے بعد وہ عمرہ کر کے لوٹے، نواب اریب الحسن کی شادی ان کی پسند سے کرائی گئی تھی ان کی بیوی نائلہ چونکہ نواب خاندان سے نہیں تھیں لہذا وہ ”نواب حویلی“ میں رہ کر ا کے طور طریقے اپنانے میں بالکل بھی انٹرسٹڈ نہیں تھیں انہوں نے نواب اریب الحسن کو شہر میں اچھا سا بنگلہ خریدنے پر رضامند کر لیا اور ان کے بچہ کا دے میں آ کر بیوی وہ اپنے ماں باپ جیسے شفیق بھائی بھائی کو دھوکا دے گئے ساری جائیداد بہت ہوشیاری سے اپنے نام کرائی تھی یہ بھی غنیمت تھا کہ ”نواب حویلی“ انہوں نے رہنے دی تھی یا پوں کہہ لیں کہ ”نواب حویلی“ چونکہ عفت آرام کے نام کر دی گئی تھی اس لئے نواب اریب الحسن ”حویلی“ اپنے نام کرانے میں ناکام رہے تھے اور اپنی بیوی کو لے کر رحیم یار خان شفٹ ہو گئے تھے نواب نیب الحسن نے ایک اشاعتی ادارے میں کتابوں کے ترجمے کر کے دینے کا کام شروع کر دیا تھا جو معاوضہ ملا اس سے گھر کے اخراجات پورے ہو جاتے اور کچھ عفت آرام کو اپنے ذاتی زیورات فردخت کر کے اپنی نوابی شان کو قائم رکھنا پڑا تھا ایک سال ہونے کو آیا تھا پچھلے سال عید الفطر کے روز چھوٹے نواب ”نواب اریب الحسن اور ان کی بیگم نائلہ انہیں اور حویلی کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اور پلٹ کر خبر تک نہ لی تھی کہ بڑے بھائی بھائی کس حال میں ہیں عفت آرام اور نواب نیب

ہیں۔ اگلے روز نماز ظہر کے بعد مسجد سے گھر آ کر نواب فیب الحسن نے عفت آراء کو بتایا۔  
”آپ سے یہ سب کس نے کہا؟“

”حنیف احمد ہیں ناں وکیل وہ جو رحیم یار خان میں پریکٹس کرتے ہیں عید کی چھٹیوں پر زرات ہی یہاں پہنچے ہیں گھر والوں کے ساتھ عید منانے کے لئے وہی بتا رہے تھے ان کی ملاقات ہوئی تھی اریب میاں سے بیوی کو طلاق دینے کا سوچ رہے ہیں اسی مسئلے میں وکیل صاحب سے ملاقات ہوئی تھی ان کی۔“ انہوں نے تفصیل سے بتایا عفت آراء کو زیادہ حیرت نہ ہوئی۔

”وہ لڑکی ہمارے اریب کی دولت نوابی شان اور ٹیک حاصل کرنا چاہتی تھی اس کو محبت اریب سے نہیں تھی ان کے ساتھ جڑے حسب نسب سے تھی جو اس نے حاصل کر لیا اب اریب میاں کو وہ کس حد تک لوٹ چکی ہیں اللہ جانے مگر معاف کیجئے گا نواب صاحب اس لڑکی کے چھن گھر بسانے والے ہرگز نہیں تھے اللہ اسے ہدایت دے ہمارے اریب میاں کے ساتھ بسنے کا احساس ان کی محبت نائلہ کے دل میں ڈال دے۔“ عفت آراء نے دل سے دعا کی۔  
”آمین۔“ نواب فیب الحسن نے دل سے کہا۔

☆☆☆☆

آج عید کا دن تھا عفت آراء نے گھر کو تو ملازمہ کے ساتھ مل کر سناٹا کر لیا تھا شیر خرمہ اور منمن تو رمہ بھی صبح نکالیا تھا نواب فیب الحسن عید کی نماز ادا کرنے مسجد گئے ہوئے تھے ان کی واپسی تک عفت آراء ہرے رنگ کی گولڈن ٹیئس تار کے کام والی ساڑھی پہن کر تیار ہو گئی تھیں ہلکا سا لاکٹ سیٹ پہنا مناسب میک اپ کیا اپنے پسندیدہ گولڈن جوتے پہنے اور خوش خوشی نواب صاحب کی آمد کا انتظار کرنے لگیں۔

”عفت آراء بیگم! دیکھئے تو ہمارے ساتھ کون

آیا ہے؟“ نواب فیب الحسن کی خوشی سے چبکتی آواز پر وہ اپنے کمرے سے دوڑی چلی آئیں اور شوہر کے ہمراہ پور کو دیکھ کر انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔

”یہ ہے آپ کا عید کا تحفہ پسند آیا؟“ نواب فیب الحسن پوچھنے لگے۔

”نواب اریب الحسن آپ.....“ عفت آراء نے خوشی اور حیرت میں ڈوبے لہجے میں کہا تو وہ شرمندہ سے ان کے پاس چلے آئے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے۔

”بھائی بیگم! آپ ہماری ماں جیسی ہیں اور ہم نے اپنی ماں کو دکھ دیا گناہ گار ہوئے اس کی سزا بھی مل گئی ہے ہمیں آپ پلیز ہمیں معاف کر دیں ہم لوٹ آئے ہیں آپ کے اور بھائی جان کے پاس ہماری جنت ہمارے ماں باپ تو آپ دونوں ہیں ہماری ہر خوشی آپ کی دعاؤں کی مرہون منت ہے پلیز ہمیں معاف کر دیں ہم نے آپ دونوں کو بہت دکھ دیا ہے بہت برے حالات سے دوچار کیا ہے ہم نے۔“

”آپ کو احساس ہو گیا آپ نادم ہیں تو ہم نے بھی آپ کو معاف کر دیا ہے عید کے دن تو دشمن بھی گھر آ کر معافی مانگتے تو اسے معاف کر دینا چاہئے جبکہ آپ تو ہمارے اپنے ہیں ہماری اولاد کی طرح ہیں اللہ بھی آپ کو معاف کر دیں۔“ عفت آراء نے ان کے بندھے ہاتھ پکڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہت بہت شکریہ بھائی بیگم! آپ اور بھائی جان بہت عظیم ہیں بہت اعلیٰ ظرف اور کشادہ دل کے مالک ہیں اور میں بہت ہی۔“ نواب اریب الحسن ایمانداری سے ہر لہجے میں ان کی عظمت اور اپنی کم ظرفی کا اعتراف کر رہے تھے۔

”آپ بھی بہت اچھے ہیں چلے اب مسکرا دیجئے صبح کا بھولا شام کو بلکہ عید کی صبح کو گھر لوٹ آیا ہے ہمیں اور کیا چاہئے۔“ نواب فیب الحسن نے ان کی بات کاٹتے ہوئے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر



خوشگوار لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیئے۔  
 ”ایک منٹ“۔ نواب اریب الحسن یہ کہہ کر باہر  
 گئے اور چند لمحوں میں واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں  
 ایک سفید رنگ کی فائل تھی۔  
 ”بھائی بیگم! یہ لیجئے۔“ فائل انہوں نے عفت  
 آراء کی طرف بڑھادی۔  
 ”یہ کیا ہے؟“ وہ فائل پکڑتے ہوئے حیرانگی  
 سے گویا ہوئیں۔  
 ”آپ کی عیدی۔“

”عیدی“۔ عفت آراء نے تھیر آ میز نظروں سے نواب  
 فیب الحسن کو دیکھا تھا وہ بھی حیران دکھائی دے رہے تھے۔  
 ”جی بھائی بیگم! یہ اس پراپرٹی کے کاغذات ہیں  
 جس کے لئے ہم نے اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیا تھا اس  
 ساری جائیداد کے اصل حقدار آپ دونوں ہیں ہم  
 نہیں ہم یہ سب کچھ آپ دونوں کو واپس لوٹا رہے  
 ہیں اس پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے بس ہمیں خود سے  
 الگ مت کیجئے گا۔“

”ارے میاں! بھلا کبھی گوشت بھی ناخن سے جدا  
 ہوا ہے آپ ہمارے بھائی ہیں بیٹے ہیں آپ کو ہم  
 کبھی الگ کر سکتے ہیں کیا؟ ہرگز نہیں اور وہ آپ کی  
 زوجہ محترمہ کہاں ہیں۔“ نواب فیب الحسن نے سنجیدگی  
 سے کہا تو وہ بولے۔  
 ”جہاں انہیں ہونا چاہئے تھا۔“

”مطلب؟“  
 ”مطلب یہ بھائی جان کہ ناملہ کو ہم سے نہیں  
 ہماری دولت سے پیار تھا وہ ہم سے جتنی دولت ہتھیا  
 سکتی تھیں ہتھیلی ہمیں جلد ہی ان کی حقیقت کا علم ہو گیا  
 اور ہم نے انہیں طلاق دے دی ہے اب ہم وہاں  
 شادی کریں گے جہاں آپ دونوں کی مرضی اور خوشی  
 ہوگی ہم نے یہ جان لیا ہے کہ جو رشتے بڑوں کی مرضی  
 کے خلاف ان کی نافرمانی کر کے بنائے جائیں وہ  
 زیادہ دیر نہیں چلتے ہم آپ کی دعاؤں میں اپنی آسندہ

”جی جناب بالکل طے گا“ آپ دونوں تشریف  
 رکھیے ہم ابھی شیر خرمہ لے کر آتے ہیں۔“ عفت  
 آراء نے خوشگوار موڈ میں مسکراتے ہوئے کہا اور کچن کا  
 رخ کیا وہ دونوں بھائی ایک دوسرے کو عید مبارک  
 کہتے ہوئے بغل گیر ہو گئے۔“

”رنگ خوشی کے لائی ہے  
 صبح عید آئی ہے  
 ہر شے مسکرائی ہے  
 صبح عید آئی ہے“  
 ☆.....☆.....☆

ایقان علی



”نہیں ارجم!“ فلک نے دو ٹوک لہجے میں کہا تھا، کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی تھی۔  
”آخری دفعہ ریکویسٹ کر رہا ہوں جان“۔ فلک اس کے لہجے پر ہنسنے لگی تھی۔  
”مطلب ورنہ کیا کرو گے.....؟“ جواباً وہ ہنسا تھا۔



”وہ ویڈیو لیک کر دوں گا جس میں تم میرے گلے لگی بکھر جانے کی بات کر رہی ہو اور وہ والی جس میں تم واقعی بکھر بھی چکی ہو“۔ فلک اندر تک لرز کر رہ گئی وہ کیا کہہ رہا تھا اسے سانس لینے میں بھی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

”ارحم.....“ وہ کچھ اور نہیں بول پائی تھی۔  
 ”سندے یاد رکھنا! میں انتظار کروں گا“۔ وہ زمین پر ڈھسے گی تھی ساڑھتی شروع ہو چکی تھی بد قسمتی کا منوس دور۔

☆☆☆☆

وہ بھابی کے ساتھ شاپنگ پر آئی ہوئی تھی ابھی کچھ دیر پہلے ان کو کوئی دوست مل گئی تھی تو وہ دونوں اب ساتھ تھیں۔ خدا ان دونوں کے ساس بھی کبھی بہو بھی ناپ فضول ٹاپک سے بور ہونے لگی تو الگ ہو کر مال کے اوپری حصے میں آگئی اور وہیں اسے وہ دکھائی دیا تھا۔

ذہنی قسط



”پرنس چارمنگ“۔ وہ جینٹلس جسے میں کپڑے دیکھ رہا تھا وہ کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی تھی وہ دو ماہ بعد اسے دیکھ رہی تھی اس رات جب گڈ نائٹ کے ایس ایم ایس کے جواب میں ”کون“ کا جوابی پیغام آیا تھا تو ندانے دوبارہ کوئی بھی ایس ایم ایس نہیں کیا تھا۔

”السلام علیکم!“ وہ کسی ان دیکھی ڈور سے بندھی اس کے پاس آئی اس نے چونک کر دیکھا اور لمحوں میں پہچان گیا۔

”ندا..... ٹاس ٹومیٹ یو!“ ندا کے دل میں لڈو پھوٹنے لگی وہ اب تک اسے جانتا تھا۔

”کافی.....“ اس نے ندا کو آفر دی۔

”شیور“۔ کچھ دیر بعد وہ زرد کی کافی شاپ میں تھے۔

”میں نے آپ کا نمبر اسی دن ڈیلیٹ کر دیا تھا ندا یونو دوست وغیرہ ایسے لڑکی کے نمبر سے آئے پیغامات دیکھیں تو بے تکلف بناتے ہیں، سچی گدیاں پیدا ہو جاتی ہیں“۔ کافی کے سب لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”آئی ہوپ آپ نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا“ مطلب یہ بھی تو ٹھیک نہیں ہے ناں کہ کسی رشتے کے بغیر رات تک ایس ایم ایس، ایس ایم ایس کھیلوں“۔ وہ مرعوب ہو رہی تھی۔

”نہیں، نہیں آئی ڈونٹ مائنڈ! میں سمجھ رہی ہوں“۔ بھی بھائی آگئیں۔

”ارے ارحم! کیسے ہو ٹھیک ہو تم پھر آئے ہی نہیں.....؟ ہم انتظار کرتے رہ گئے تمہارا“ آنٹی کے ساتھ آؤ ناں۔ سوال پر سوال۔

”جی بھائی جلد آؤں گا“۔ وہ مسکرایا۔

☆☆☆☆

فلک نے جھر جھری لی! سامنے اسکرین پر وہ ویڈیو چل رہی تھی جس میں وہ انتہائی شرمناک حالت میں ارحم کے ساتھ تھی اس نے بے یقینی سے پاس بیٹھے ارحم کو دیکھا جو اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرایا اور آنکھ ماری۔

”تم مجھ سے محبت کرتے ہو ارحم! تم نے کہا تھا“۔ اس کی آواز رندہ لگی تھی۔

”یقیناً کرتا ہوں میری جان! اور یہی چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ میرے پاس رہو بہت پاس“۔ اس کی کمر کے گرد بازو جمائل کرتے ہوئے وہ بولا۔

”میں مرجاؤں گی ارحم!“ وہ رو پڑی اور دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے۔

”مجھے معاف کر دو! اس ویڈیو کو ضائع کر دو پلیز“۔

”ریلیکس جان! اتنی خوبصورت لڑکی میری وجہ سے روئے مجھ نے یہ ہرگز برداشت نہیں ہوگا“۔ وہ اسے گلے لگا کر بولا۔

”مجھے رسوا مت کرو ارحم! تمہیں محبت کا واسطہ“۔

”نہیں کرتا! بس تم میری پیاس بجھاتی رہو“۔ ایک سروی لہر فلک کے وجود سے گزر گئی۔

”ٹھیک ہے مجھ سے شادی کرلو“۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور ہنستا چلا گیا۔

”جب شادی کے بغیر تم مجھے مل رہی ہو میرے پاس ہو تو پھر میں یہ طوق کیوں پہنوں! آئندہ ایسا مذاق مت کرنا“۔ وہ مشدد رہ گئی وہ فلک ایسا اس کو ایک کھلونا سمجھ رہا تھا ایک ٹشو پیپر۔

”خدا کے لئے مجھ پر رحم کر دو“۔

”اور تم مجھ پر رحم کرو۔“ وہ اس کے پیروں میں پڑنا چاہتی تھی وہ اسے اپنے اندر کہیں سمولینا چاہتا تھا اس کے دیکھتے لمس اب فلک الیاس کو دوزخ کے شعلوں جیسے محسوس ہو رہے تھے۔

☆☆☆☆

”ایک لقمہ اور.....“ حمزہ نے لقمہ اس کے منہ میں دیا تھا۔  
 ”بس حمزہ! بہت کھالیا میں نے اب مزید میں الٹ جاؤں گی۔“  
 ”چلو ٹھیک ہے اب یہ جوس لے لو۔“ جوس کا گلاس اسے دے کر اب وہ برتن سینے لگا تھا۔  
 ”میری عادتیں بگاڑ رہے ہو تم۔“

”سو تو ہے پر خیر ہے مجھے بگڑی ہوئی عادتوں والی بیوی بھی قبول ہے۔“ وہ مسکرایا اور برتن لئے کمرے سے نکلا اور باورچی خانے میں آیا برتن دھو کر ریک میں لگائے بچا ہوا کھانا فریزر میں رکھا اور واپس کمرے میں آیا۔  
 ”نہیب۔“ جوس کا گلاس فریش پر پڑا تھا وہ بے سدھ تھی اس نے آگے بڑھ کر اس کا گال تپتہ تپتا یا تھا۔  
 ”نہیب ہوش کرو!“ اس کے پیروں تلے سے زمین کھکنے لگی تھی۔

☆☆☆☆

وہ بخار میں پھنس چکا تھا سر میں شدید درد تھا ایسے میں ابواسے بائیو کا میٹ یاد کرنے کو دے گئے تھے وہ بشکل بیٹھا پڑھ رہا تھا آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا سردرد سے بوجھل تھا اور آنکھوں کے سامنے لفظ بھاگے دوڑے پھر رہے تھے۔

”احمد! امی کہہ رہی ہیں کھانا کھا لو آ کر۔“ احمد اندر آیا تو وہ بے سدھ پڑا تھا۔  
 ”احمد!“ وہ پریشانی سے بولا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے نزدیکی اسپتال لے آیا تھا اسی اسپتال کے دوسرے فلور پر حمزہ ڈاکٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔

☆☆☆☆

نئے سیمسٹر کی فیس جمع کروانی تھی اس کے پاس کل 32 روپے تھے ماموں کے روز روز کے اصرار پر اس نے 40 ہزار نہیں ادا کر دیئے تھے اب وہ خالی ہاتھ تھا اب وہ سر جھکا پائے گلوں کی طرح یہی سوچ رہا تھا کہ فیس کی رقم کہاں سے لائے؟

”ہائے عثمان۔“ حمزہ پاس آ بیٹھا تھا۔  
 ”کیا سوچ رہے ہو.....؟“  
 ”اپنا کڈنی پیچھے کے بارے میں سوچ رہا ہوں اندازاً کتنے کا بکے گا.....؟“ حمزہ سمجھا شاید وہ مذاق کر رہا ہے لیکن وہ سنجیدہ تھا۔

”کیا ہو گیا اتنا مایوس کیوں ہے.....؟“ اس نے حمزہ کو ساری پریشانی بتادی تھی۔  
 ”نوپر بلیم میں اسٹینج کر دیتا ہوں تو اپنا گردہ رکھ سنبھال کر۔“ عثمان طنزیہ ہنسا۔  
 ”دوستی بیچ دوں گردہ رکھ لوں.....؟“ حمزہ خاموش رہ گیا۔  
 ”اتنی سی بات پر دوستی بک جائے گی تیرے خیال میں؟“  
 ”ہاں۔“ عثمان اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”پاکل ہے تو۔“ حمزہ بھی اس کے برابر میں چلنے لگا تھا۔

”کیوں بتاتے ہیں ہم دوست عثمان! تا کہ دکھ سکھ میں کوئی ہو جو ہمارے ساتھ ہو جب ہمیں مدد چاہئے ہو تو وہ کہنے سے پہلے اپنی جان حاضر کر دے اور جب اسے مدد چاہئے ہو تو ہم دیر تا کریں۔“ عثمان خاموش رہ گیا۔

”آئندہ اگر تو نے مجھ سے مدد مانگنے سے پہلے گروہ پیچنے کا سوچا تو میں گولی مار دوں گا تجھے۔“ اعلیٰ صبح اس نے پچاس ہزار کا وہ چیک عثمان کو دیا تھا۔

”مجھے اچھا لگتا اگر یہ قرض نا ہوتا خیر اسے اتارنے میں جلدی نہ کر تا کم از کم سو سال بعد ادا کرنا۔“ عثمان ممنونیت سے مسکرایا۔

”تھینک یو کے علاوہ کوئی اور لفظ ہوتا تو میں ضرور کہتا۔“

”بھائی پلیز! ابو کو روکیں انہیں مجھے مزید ری پیٹ نہیں کرنی میں مر جاؤں گا بھائی پلیز۔“ وہ احمر سے لپٹ کر رو رہا تھا ابو فیصلہ نہ کیجئے تھے ایک اور سال اسے FSC کے مارکس امپروو کرنے ہوں گے۔

”میں نہیں کروں گا بھائی پلیز انہیں روکیں۔“ احمر نے بے بسی سے اسے دیکھا اور اس کے بال سہلائے۔

”بس ممبر کر یا ریو چٹکیوں میں گزر جائے گا یہ سال بھی محنت اور زیادہ کرنا میں تمہیں نئے نوٹس لا دوں گا۔“

”نہیں بھائی۔“ آسان ہے بھلا.....؟ قطرہ قطرہ کامیابی چٹنا اور پھر سے مٹھی کھول دینا دوبارہ چٹنے لگتا۔ وہ لاہریری میں بھی جب کتاب لئے حزرہ سامنے آ بیٹھا۔

”ہیلو۔“ فلک نے سراٹھایا اور ناسی جواب دیا۔

”میرے بیٹے کو آپ پسند آئیں پوچھ رہا تھا کہ آپ کو وہ اچھا لگا کر نہیں.....؟“ فلک نے سراٹھایا۔

”کسی کو یہ بتانے کا کہ وہ بہت اچھا ہے سب سے اچھا طریقہ ہے۔“ حزرہ نے کندھے اچکا دیئے وہ پھر سے پڑھنے لگی۔

”اور مسز کیسی ہیں آپ کی.....؟“ اس کے سوال پر وہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہ گیا اس کی یادوں سے وعدہ لیا تھا کہ اس کے ذکر پر غمزہ نہیں ہوا کرے گا اس کے نام پر اس کی بات پر مسکرا دیا کرے گا قسم کھائی تھی سو اب بھی مسکرا دیا۔

”وہ مر چکی ہے۔“

☆☆☆☆

ٹی وی نیٹ، جیمز پہلے ہی بند ہو چکی تھی اب کمرے سے نکلتا بھی بند ہو گیا تھا اکیڈمی بھی بند بس وہ اس کی کتابیں اور اس کا کمر آنا شیشہ دو پہر کا کھانا اور رات کا کھانا اس کے کمرے میں ابو خود اس سے ٹیبلٹ لیتے تھے۔ قید تہائی بھی ایسے ہی دیتے ہیں ناں سونے کے پیچھے میں مقید پرندے کو اس سونے سے کیا لینا دینا جس سے پیچھے بنایا گیا ہے دوسری طرف احمر کے فلیٹ میں خاموشی تھی نہ اسونے کے لئے لیٹ چکی تھی احمر پاس ہی کتابیں لئے بیٹھا تھا۔

”اب بھی اسے یاد کرتی ہو.....؟“ نجمانے کیوں سوال کیا تھا وہ خاموشی سے لپٹی رہی تھی وہ اس کی بہت ساری باتوں کے جواب نہیں دیتی تھی، مینوں تک وہ بنا کوئی بات کہنے رہتے تھے۔ ان سے دور حزرہ اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا تھا سامنے شہر روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا جب بھی کوئی اس کا ذکر کرتا تھا تو وہ اور زیادہ شدت سے یاد آئے لگتی تھی۔

”زینب! تم نے بہت جلدی کی یا۔“ وہ ہولے سے بولا وقت ہولے ہو لے سر کر رہا تھا وقت وہ بھی بیت

گیا تھا وقت یہ بھی گزر جاتا تھا۔  
 ”ہمت کرنا یا وقت جلدی گزر جائے گا۔“ احمد کے کانوں میں بھائی کے الفاظ گونج رہے تھے وہ ہاتھ میں پکڑے مار کر سے کتاب پر لکیریں لگاتا رہا۔  
 ”ناک کٹاوی ذلیل نے“۔ لکیریں لگاتے لگاتے اس نے مار کر پر زور ڈالا ورق اب پھٹنے لگا تھا اس کے ہونٹ کے زخموں پر اب کھر ٹھجم چکی تھی۔  
 ”یہ مر جاتا تو بہتر تھا۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اشتعال میں آ کر اس نے وہ صفحہ پھاڑ ڈالا تھا۔

☆☆☆☆

نذا خاموشی سے بیڈ پر بیٹھی تھی سامنے چلتے ٹی وی کی اسکرین پر بے توجہی سے نظر ڈال لیتی تھی پھر اس نے پاس پڑا جڑ اٹھایا اور اچانک بنانے لگی۔ ایک ادھورا سا چہرہ مسکرائی آنکھیں بکھرے بال وہ اسے دیکھتی رہ گئی وہ نجانے کہاں تھا اس نے سیل اٹھایا اور وہ نمبر ملایا ہمیشہ کی طرح وہ نمبر آج بھی بند تھا۔  
 ”ارسل“۔ وہ سسکی۔

☆☆☆☆

ویک اینڈ پر وہ زین کو لے کر گاؤں آیا تھا سب تیاک سے ملے تھے جیسے ہمیشہ ملتے تھے وہ اپنے خاندان کے لئے ایک مثال تھا اس کے رشتے دار زبان سے نہیں کہتے تھے لیکن ان کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ اس سے مرعوب ہیں وہ اسے مان گئے تھے وہ اس کے فیصلے کو مان چکے تھے زین اگر گاؤں میں پلتا تو یقیناً ویسا نہ ہوتا جیسا آج تھا وہ اس بات کو مان چکے تھے اس دن ناشتے کے بعد اماں نے اس سے کہا تھا۔  
 ”حزہ پتر! شادی کر لے“۔ اس نے کھیلے ہوئے زین کو دیکھا۔  
 ”نہیں اماں! میری زندگی مکمل ہے۔“  
 ”ساری حیاتی زینب کے سوگ میں گزر ارنے کا.....؟“  
 ”ہاں اماں“۔ وہ ہولے سے بولا۔  
 ”اس کے بعد میں نے اپنے دل کے دروازے کس کے بند کر دیئے ہیں اب کوئی آنا بھی چاہے تو نہیں آسکے گا۔“ وہ خاموش رہ گئیں۔  
 ”یہ وقت میں نے اپنے بیٹے کے ساتھ گزرا لیا۔ آنے والا وقت بھی گزرا لوں گا۔“۔ زینب پہلی محبت تھی اور پہلی محبت یونہی تھوڑی بھلا دی جاتی ہے۔

☆☆☆☆

دور تک سبزہ تھا پہاڑی ڈھلوانیں سبزے سے بھری پڑی تھیں ان گنت رنگوں کے پھول جا بجا کھلے ہوئے تھے وہ دونوں وہیں تھے ہاتھوں میں ہاتھ لئے آس پاس..... ساتھ ساتھ..... پھر اچانک سے وہ پھسلی اور ہاتھ چھوٹ گئے..... ساتھ ٹوٹ گئے..... وہ اسے پکارنے لگی۔  
 ”ارسل..... ارسل.....“

”نہ! خود کو سننا“۔ احمد اس کے کال تھپتھار ہاتھ وہ یکدم اٹھ بیٹھی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی! احمد نے گلاس میں پانی اٹھایا اور اسے دیکھتا رہ گیا۔  
 ”اسے یاد کر رہی ہو جو خوابوں میں بھی تمہیں چھوڑ جاتا ہے.....؟“ وہ ششدر رہ گئی۔

وہ طنز نہیں تھا، حقیقت تھی، وہ واقعی ہر دفعہ کھوجا تا تھا، خوابوں میں بھی اور حقیقت میں بھی۔

☆☆☆☆

پہلے کیوں نا ملے ہم۔

آج پونی سے آف تھا، اسی لئے زین کو اسکول بھیجنے کے بعد وہ فارغ تھا، پہلے تو سارے گھر کی صفائی کی پھر چنچ کر کے گردوسری وغیرہ خریدنے اسٹور آگیا، وہ دالوں کے پیکٹ ٹرالی میں رکھ رہا تھا، جب پیچھے سے شاسا کی آواز آئی۔

”خزہ کریم! ایک قابل اسٹوڈنٹ، ایک اچھے فادر اور اب ایک سکھڑ باورچی بھی..... جان کر اچھا لگا۔“ وہ چونکا اور مڑا، سامنے فلک کھڑی مسکراہٹ دباتے کہہ رہی تھی۔

”ایک الیہ ہمارے معاشرے کا یہ بھی ہے، بس فلک بیوی کی قدر اس کے مرنے کے بعد آتی ہے۔“ وہ ٹرالی گھسٹتا ہوا کاؤنٹر تک آیا، وہ ساتھ میں چل رہی تھی، کاؤنٹر پر کھڑے وہ کسی بات پر ہنس رہی تھی جب کسی نے پکارا۔

”فلک۔“ وہ کرنٹ کھا کر پٹی اور پھر جیسے حرکت کرنا بھول گئی وہ بوڑھا آدمی بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”فلک.....؟ تم فلک ہونا.....؟“ فلک کے ہاتھ سے شاپر، بیک سب جھوٹ گیا، وہ تیر کی طرح اس بوڑھے آدمی کی طرف بڑھی تھی۔

”ابو.....“ خزہ تعجب سے سارا معاملہ سمجھنے میں مصروف تھا، فلک ہچکچاں لے رہی تھی۔

”فلک! میری بیٹی۔“ اسٹور میں کئی لوگ حیرت سے مڑ مڑ کر انہیں دیکھ رہے تھے وہ دونوں سب سے بے نیاز آنسو بہا رہے تھے خزہ نے فرش پر کھڑے شاپرزا کٹھنے کئے اور اس کے پاس آیا۔

”فلک! سب دیکھ رہے ہیں۔“ گھر چلے۔ فلک چونکی وہ بوڑھا آدمی اب فلک سے نظریں ہٹا کر خزہ کو دیکھنے لگا تھا، پھر سے فلک کو دیکھا سوالیہ نظروں سے۔

”یہ ہے وہ فلک.....؟ اس کے ساتھ آئیں تمہیں گھر سے.....؟“ فلک اندر تک لڑ گئی وہ کیا سوچ رہے تھے.....؟ وہ کیا سمجھ رہے تھے.....؟ کاش وہ کسی کے ساتھ گھر سے آئی ہوتی تو آج کوئی ”گھر“ ہوتا کاش! خزہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا، فلک اسے ہی دیکھ رہی تھی کیا تھا ان نظروں میں.....؟ صرف التجا..... صرف اور صرف ایک التجا! التجا کر کے وہ نظریں جھک گئیں خزہ ہولے سے بولا تھا۔

”چلیں انکل! گھر چلتے ہیں۔“ کاؤنٹر پر آ کر اس نے ٹل کلیر کے شاپریٹے اور ان دونوں کو لئے باہر نکل آیا۔

☆☆☆☆

اس کے سامنے کتاب کھلی پڑی تھی وہ بے توجہی سے بیٹھا دور کسی غیر مرئی نکتے کو گھور رہا تھا، مسلسل بغیر جھٹکنے کئی گھنٹے ہوئی بے مقصد بیٹھے بیٹھے اس کی گردن جھٹکنے لگی تو اس نے نظروں کا زاویہ موڑا، کتاب کے صفحے پر لکھا ہوا حرف ہی اسے سمجھ نہیں آیا، عجیب سی شکل یہ کیا لکھا ہوا ہے بھلا.....؟ اس نے سوچتے سوچتے سوچا، آدمے جھٹکنے سوچنے کے بعد اسے یاد آیا، وہ انگلش کا پہلا حرف A تھا اب وہ انک انک کر جوڑ توڑ کرنے لگا۔

...C...E...L... یہ کیا بنا CELL اس کا کیا مطلب ہے بھلا.....؟ وہ پھر سے سوچنے لگا۔

☆☆☆☆

وہ انہیں اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا، چھوٹا سا گھر شکر ہے صبح ہی صاف کیا تھا، اس کے برابر میں فلک چل رہی تھی جیسے خواب کے عالم میں وہ کن اکھیوں سے خزہ کو دیکھ رہی تھی جو ان دونوں باپ بیٹی کو



ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر بچن میں چلا گیا تھا۔ اب ڈرائنگ روم میں وہ دونوں تھے وہ باپ کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی وہ بھی خاموش بیٹھے تھے لفظ جیسے ختم ہو گئے تھے پانچ سال پہلے کا منظر الیاس صاحب کے ذہن کے پردے پر تھا وہ اپنی چھوٹی بیٹی نمرہ کے ساتھ شادی سے واپس لوٹے تو گھر میں ایک نیا ہی فساد برپا تھا 'تج' یا سا فرقان۔

"آپ کی بیٹی نے عزت رول دی ہماری! خدا جانے کس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے" کل مجھے کسی نے اس کی ویڈیو بھیجی ہے اس میں وہ انتہائی شرمناک حالت میں بچانے کس کے ساتھ۔" الیاس صاحب نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے اس کے منہ پر پھڑوے مارا تھا۔

"میری بیٹی کسے بارے میں بکو اس مت کر"۔ وہ جلدی سے موبائل میں سے وہ ویڈیو نکالنے لگا لیکن..... رات کی وقت اس کا موبائل فارمیٹ ہو چکا تھا موبائل کا سارا ڈیٹا ڈیلیٹ ہو چکا تھا وہ پاگلوں کی طرح موبائل کھنا ل رہا تھا وہ ویڈیو نہیں تھی۔ الیاس صاحب فتح سے مسکراتے ہوئے اِد پر آئے فلک کو پکارا فلک نہیں تھی ان کے کمرے میں ایک پرچہ پڑا تھا۔

"مجھے معاف کر دیجئے گا ابو! جس سے محبت کرنے کا گناہ ہوا اسی کے ساتھ گھر سے بھاگنے کا جرم کر رہی ہوں" سمجھ لیجئے گا کہ فلک مرگئی۔" وہ پاگلوں کی طرح سارے گھر میں فلک فلک چلاتے پھرتے رہے تھے فلک ہوتی تو جواب دیتی ناں۔

منظر بدل گیا۔

ان کے سامنے بیٹھی فلک بے آواز آنسو بہا رہی تھی خدا نے کیسی لاج رکھی تھی اسے پتہ تھا وہ معافی مانگ لے گی، ابھی تو ایک سال بعد کی جانے والی تو باس نے ایک سال پہلے قبول کر لی تھی۔ وہ کیسا رحیم ہے ناں.....؟ وہ کیسا مغفور ہے ناں! اور وہ کیسا پردہ پوشی کرنے والا ہے ناں۔

"چھوٹی..... نمرہ کیسی ہے.....؟" ابو نے گیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"گھر سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کی چھوٹی بہنیں کن حالوں میں ہوتی ہیں" فلک ان کی تعلیم چھڑوا دی جاتی ہے گھر میں قید کر دی جاتی ہیں کسی بھی لوے لنگڑے سے بیاہ دی جاتی ہیں۔" وہ دھک سے رو گئی۔

"لیکن اس کا خدا بھی وہی تھا فلک جو تمہارا جب تم قصور وار ہوتے ہوئے خوش ہو سکوں سے ہو تو وہ بے گناہ کیوں رل جاتی BA کر رہی ہے میری بیٹی۔" فلک کے سینے سے ایک اور بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اتنے میں حمزہ کو لڈو ٹکس لے آیا تھا وہ پاس ہی بیٹھ گیا ابو حمزہ سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگے تھے۔

"میں نے تمہیں کہیں تلاش نہیں کیا فلک! کہیں بھی نہیں" تم نے کہہ دیا تھا کہ سمجھ لوں کہ تم مر گئیں میں نے سمجھ لیا دل پر پتھر رکھ کر مان بھی لیا اور آج تک اپنی بات پر قائم ہوں کہ میری صرف ایک بیٹی ہے۔" فلک نے سر جھکا لیا۔

"آپ رکیں گے ناں.....؟ میں کھانا تیار کرتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی حمزہ نے گھڑی دیکھی زین کے اسکول کی چھٹی ہونے میں ایک گھنٹہ تھا وہ آ جاتا تو اُلے سیدھے سوال کرتا۔

"نہیں میں بس اب چلوں گا۔" فلک نے رکنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔

☆☆☆☆

وہ یونی سے گھر آیا تو حسب معمول خاموشی تھی اس نے کمرے میں جھانکائی وہی بند اور وہ لحاف لے

لینی تھی۔

”اس وقت سو رہی ہے مہارانی خیر ہے۔“ وہ سر ہانے کے پاس آیا۔

”نندا! آریو آل رائنٹ؟“ وہ جواب دینے بنا بیٹھی رہی مگر اصرار کرنے ہوئے سے لحاف سر کا یا اس کی رنگت نماثر جیسی لال ہو رہی تھی اور سارا وجود پسینے میں بھیگا ہوا تھا وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔

”اودہ مائی کا ڈاکٹر ہمیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوگا۔“ اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے پھر اچانک رکا۔

”اودہ میں بھی تو ڈاکٹر ہی ہوں..... ہا ہا ہا۔“ جلدی سے کٹ کھولی تھرما میٹر چند ادا دیا، بخار وغیرہ چیک کیا اور دوا دی لحاف اوڑھا کر جب وہ کمرے سے نکل رہا تھا تب وہ ہولے سے بولی تھی۔

”کھانا ڈاکٹر کھا ہے۔“

”اف.....“ وہ فکر مندی سے پلٹا۔

”کیا ضرورت تھی اتنے بخار کے ساتھ چولہا چوکی کرنے کی میں خود کر لیتا یا! ملازمہ نہیں ہوتی۔“ لائٹ آف کر کے وہ کمرے سے نکل آیا۔

☆☆☆☆

کتاب گود میں دھرے ہوئے ہوئے سرگوشی میں بول رہا تھا۔

”پاپا! مجھے مارتے ہیں میرے ٹیٹ میں غلطیاں ہوتی ہیں ناں تمہیں نہیں مارتے ہوں گے تمہارے ڈیڈ یو لکی تم فرسٹ آتے ہو میں جتنی مرضی محنت کر لوں فرسٹ نہیں آ پاتا“ تم مجھے اپنے جیسا بتالو گے ناں دوست.....

ہاں ہاں۔“ ای دوپہر کا کھانا دینے آئیں تو وہ لیٹا کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو.....؟“ انہوں نے پوچھا بھی لیکن وہ سنی ان کی نہ کر گیا۔

☆☆☆☆

حزہ نے بانیٹ کی چابی اٹھا لی وہ ابوکوس اسٹینڈنگ چھوڑنے جا رہا تھا وہ اس کے پیچھے پیچھے باہر آئے بیڈ روم کے کھلے دروازے سے اندر لگی زین کی بڑی تصویر دیکھ کر وہ مڑے اور مسکرا کر فلک کو دیکھا۔

”یہ تمہارا بیٹا ہے ناں.....؟“ فلک گنگ رہ گئی اس کا بیٹا اس کا بچہ اس کی اولاد۔

”آئی ایم سوری ابارشن کی وجہ سے آپ کو بہت نقصان ہوا ہے، ٹیکسٹ پر ٹینسی کا کوئی چانس نہیں ہے آپ کبھی ماں نہیں بن سکیں گی۔“ وہ لب کاٹنے لگی۔

”جی..... یہ ہمارا بیٹا ہے۔“ حزہ نے بتایا تھا وہ اب آخری دفعہ اس سے ملنے کے بعد حزہ کو گلے لگا رہے تھے۔

”میری بیٹی کا خیال رکھنا۔“ وہ انہیں لئے باہر نکل گیا اور وہ ساکت سی بیٹھی رہ گئی تپتے صحرا میں وہ جس شجر کے نیچے بھی آج وہ بھی کٹ گیا تھا وہ ہمیشہ کے لئے بے سہارا ہو گئی تھی سامنے دیوار پر لگی زین کی تصویر دیکھ کر وہ بلک بلک کر رو دی تھی۔

”مجھے یہ بچہ نہیں چاہئے، مجھے ابارشن کروانا ہے۔“ اس کے کانوں میں اس کے اپنے الفاظ گونج رہے تھے وہ کسی کی موت کا حکم دے رہی تھی اور ایک حکم اوپر والے نے بھی دیا تھا اس سے ہمیشہ کے لئے زندگی دینے کا شرف چھین لیا گیا تھا وہ جنت کو ٹھوک مار کر گھر سے نکلی تھی اس کے قدموں تلے سے جنت کھینچی گئی تھی وہ رحمان اور رحیم سے لیکن ظالموں کے لئے وہ جہار اور قہار بھی ہے فلک الیاس زندگی میں جہاں جہاں ظالم بنی تھی اس کا رحیم رب قہار بن گیا تھا۔ وہ کارپٹ پر بیٹھی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے گناہوں

کے کنارے آسان تھوڑی ہوتے ہیں کفاروں میں یونہی زندگیاں دان کرنا پڑتی ہیں۔

☆☆☆☆

رات کے ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا وہ لیٹ شفٹ سے فارغ ہو چکا تھا ڈھیر سارے برتن دھونے اور کچرا سینے کے بعد اسے اپنے آپ سے آنے والی بدبو سے نفرت ہو رہی تھی وہ شاور لے کر سو جانا چاہتا تھا گھر کی طرف جاتے ہوئے اس سنان سڑک پر کسی نے راستہ روک لیا تھا۔

”موہا! اور والٹ.....“ کسی نے کپٹی پر پستول رکھ دی اس نے جیسیں خالی کر دیں چند ہزار دیکھ کر اس راہزن کو طیش آ گیا اس چور نے مکوں اور لاتوں سے مار مار کر عثمان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا حواسوں کی دنیا سے رابطہ ٹوٹنے سے پہلے اس نے مدد کے لئے آوازیں بلند کی تھیں۔ اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا ارم! اموں! خالہ اور خالو۔

”خطرے کی کوئی بات نہیں بینڈیج کر دی ہے ابھی تھوڑی دیر میں ان کو ڈسچارج کر دیں گے۔“ اس نے تھکان سے آنکھیں موند لیں نجانے کیوں سارا زمانہ آزمائش لینے پر تلا ہوا تھا مصیبت در مصیبت..... ابھی اسے ہاتھ پر زری کا سا احساس ہوا ارم نگر مندی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کاش ارم! میں تم سے ان سب مشکلات کے بعد ملتا تو تمہیں میری وجہ سے یہ سب نا سہنا پڑتا۔“ اس نے کرب سے سوچا تھا۔

☆☆☆☆

الیاس صاحب کو چھوڑ کر وہ واپس آیا تو وہ وہیں کارپنٹ پر بیٹھی رو رہی تھی وہ پاس آ بیٹھا وہ روتے روتے اس کے کندھے سے آگئی تھی۔

”مجھے معاف کر دو حمزہ۔“ روتے روتے وہ اسے اپنا ہر گناہ بتاتی چلی گئی ارم سے دوستی سے لے کر بارش تک وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر زری سے اس کے آنسو صاف کئے۔

”جو ہو چکا ہے فلک! اسے بھول جاؤ ان چند گھنٹوں کو اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لئے ڈیلیٹ کر دو اینڈ ٹرسٹ می میرے دل میں اب بھی تمہارے لئے وہی عزت ہے جو ازل روز بھی میرے حوالے سے کچھ بھی سوچ کر پریشان مت ہونا۔“ اسے وہ ہاسٹل چھوڑ آیا تھا اس رات زین کے سو جانے کے بعد اس کے پاس سوچنے کے لئے بہت کچھ تھا وہ کمزوری لڑکی جو اندر تک کچی کرجی اور خود کو چٹان جیسا بنائے رکھتی تھی۔

”میری بیٹی کا خیال رکھنا۔“ اس نے آنکھیں موند لیں۔

”کاش..... فلک! میں تم سے بہت پہلے ملا ہوتا بہت پہلے جب ناں ارحم ہوتا اور ناں کوئی زینب! تب شاید تم آج کے دن کی طرح محرومی سے روند رہی ہوتیں“ کاش بہت پہلے ہم مل جاتے تو میں آج تمہارے باپ کے حکم کی تکمیل کے قابل ہوتا۔“

☆☆☆☆

وہ یونی جانے کے لئے کمرے سے نکلا تو انداکرے میں نہیں تھی وہ کچن میں آیا وہ ناشتہ بنا رہی تھی وہ جلدی سے اندر آیا چوبلیا بند کیا اور اس کو ہاتھ سے پکڑ کر کمرے میں بستر تک لایا۔

”پاگل ہو تم! تمہیں جاؤں گا میں اگر ناشتہ نہیں کروں گا تو۔“ وہ چکراتے سر سے دیے ہی بیٹھی رہ گئی دس منٹ بعد وہ کمرے میں آیا اور ایک ٹرے پاس رکھ دی۔

”دو توں آسٹریلیا کے نقشے جیسا پراٹھا اور آلیٹ‘ دودھ کا گلاس۔ ناشتے کے بعد میڈیسن لے لینا اور کھانا پکانے مت کھڑی ہو جانا وہ ہدایات دے کر نکل گیا۔ وہ ایک ٹک ناشتے کی ٹرے کو دیکھتی رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆☆

اس نے روٹی کے دو حصے کئے اور کلڑا برابر میں رکھ دیا۔  
 ”کھاؤ ناں یہ نہیں تم میرے دوست ہو کچھ نہیں ہوتا تم جلدی سے کھاؤ پھر ہم نے پڑھنا بھی ہے۔“ سانسے لگے شیشے میں زمین پر بچھا میٹر لیں دکھائی دے رہا تھا جس میں وہ اکیلا بیٹھا کھا رہا تھا۔  
 ”کاش..... تم پہلے مجھ سے ملے یا زہم دوست بن جاتے میں بھی تمہاری طرح فرسٹ آیا کرتا۔“ امی کچھ دیر بعد برتن لینے آئیں تو وہ کتابوں پر سو رہا تھا بستر پر آدمی روٹی پڑی بھی کل کی طرح۔

☆☆☆☆

وہ یونی سے لوٹا تو وہ کمرے میں سو رہی تھی وہ کچھ دیر کھڑا خاموشی سے اس کا پرسکون چہرہ دیکھتا رہ گیا تھا وہ معصوم سی کزن احمر صدیقی کو ہمیشہ سے بہت عزیز بھی وہ اس کے لئے بہت خاص بھی۔  
 ”کاش..... نما، ہم ایسے ناٹے ہوتے۔“ وہ کمرے سے باہر نکل آیا ہوٹل سے لائی ہوئی بد مزہ روٹی چباتے ہوئے وہ ندا کے ہاتھ کی روٹی کو کس کر رہا تھا وہ ذائقہ جس کا وہ عادی ہو چکا تھا محبت ایسا ہی کرتی ہے عادت کا لبادہ اوڑھ کر آتی ہے اور پھر ہمیشہ کے لئے ڈیرے ڈال لیتی ہے۔

☆☆☆☆

ابو نے ٹیبلٹ پر کراس کا نشان ڈالا اور رجسٹرڈ سے دے مارا۔  
 ”کیا پڑھتے ہو سارا دن اسپینگ کی غلطیاں ہی ختم نہیں ہو رہی تمہاری..... یہ سب کیا ہے؟“ وہ خاموش کھڑا رہا۔  
 ”کل میں یہ ٹیبلٹ پھر لوں گا اور اب اگر غلطیاں ہوئیں تو چیزی اور چیز دوں گا۔“ وہ زور سے دروازہ بند کر کے چلے گئے تھے وہ اکیلا میٹر لیں پر سر جھکائے بیٹھا رہ گیا تھا رجسٹر سانسے پڑا تھا جس پر ان گنت بار کس تھے لال لال..... غلطیاں ہی غلطیاں.....  
 ”تم مجھے یہ سمجھا دو گے.....؟ مجھے یاد نہیں ہو رہا۔“ وہ ہولے سے بولا۔

☆☆☆☆

وہ رہکوز کبھی جو منزل کی ابتداء تھی۔

وہ یونی کے لان میں بھی اسائنمنٹ بنارہی تھی جب وہ دو ڈسپوزبل کپ لئے پاس آ بیٹھا۔  
 ”ہیلو۔“ عرصہ ہوا فلک کو اس لفظ سے نفرت ہو چکی تھی۔  
 ”آئی ہیٹ ورڈ ہیلو.....“ حمزہ نے منہ بتایا۔  
 ”کیا کر رہی ہو.....؟“ حمزہ نے سوال کیا۔  
 ”فٹ بال کھیل رہی ہوں۔“ وہ ہنس پڑا اور ایک کپ اس کے سامنے کیا۔  
 ”کانی لایا ہوں تمہارے لئے۔“  
 ”آئی ہیٹ کانی!“ حمزہ جی بھر کر بد مزہ ہوا تھا۔

”تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ مجھے ایک فہرست بنا دو ان سب چیزوں کی جو تمہیں پسند ہیں ویسے اس لسٹ میں صرف تمہارا نام ہوگا۔“

”آئی آسو بیٹ مائی سیلف!“

”اچھی بات ہے۔“ حمزہ نے کافی کا کپ منہ سے لگایا وہ سمجھ نہیں سکا کہ کافی زیادہ کڑوی ہے یا وہ۔

”یاری لواب تو لے آیا ہوں“ قسم سے 80 روپے کا کر دیا ہے ایک کپ اس ننھو قصائی کی اولاد نے۔“ فلک نے پرس سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا تھا۔

”میری طرف سے بی لود دوسرا کپ بھی 20 روپے واپس کر دو۔“ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

”خلوص ہمدردی“ تشکر..... یہ سب کتے بلیوں کے نام نہیں ہیں مس فلک!“

”خلوص ہمدردی“ تشکر..... ان سب نے جانوروں سے برا سلوک کیا ہے میرے ساتھ سر حمزہ!“ وہ کچھ لمحے کے لئے خاموش رہ گیا تھا۔

”آئی ایم سوری حمزہ! میں تمہاری بات نہیں کر رہی تھی۔“

”مجھے پتہ ہے۔“ حمزہ نے سب لیا اور دوسرا کپ اس کی طرف بڑھایا۔

”تمہیں کسی نے بتایا بھی کہ تم بہت بڑی چپک ہو.....؟“ وہ ہنس پڑا۔

”تعریف کے لئے شکر یہ میڈم!“

”اچھا سنو میری اسائنمنٹ بھی بنا دو گی.....؟“

”کس خوشی میں.....؟“

”کسی بھی خوشی میں۔“

”No.....“ فلک کا ٹریڈ مارک۔

”میرا دل توڑ دیا تم نے ظالم!“ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر پیچھے کو ہوا۔

”میرے جو 20 روپے تم نے واپس کرنے ہیں ان سے سی پلاسٹ لے کر لگالینا“ جڑ جائے گا۔“ حمزہ نے

قبضہ لگایا۔

”تمہیں کبھی کسی نے بتایا تم انجائی خود سڑکی ہو.....؟“ وہ ہنسی۔

”تعریف کے لئے شکر یہ سرائے۔“

☆☆☆☆

ابھی ابھی اس کی ابو کے ہاتھوں پٹائی ہوئی تھی وہ پیٹ کے بل میٹر لیس پر بے خس و حرکت لیٹا ہوا تھا بابا ہرامی ابو سے جھگڑ رہی تھیں۔

”میرے بیٹے کو ایسے جانوروں کی طرح مارنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”اور حمہ دو اے! ABC تک لکھنا بھول گیا ہے تمہارا بیٹا“ ایک اسپینگ تک ٹھیک نہیں لکھ پاتا۔“ وہ

خاموش لیٹا اپنے آپ سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔

☆☆☆☆

ندا کی حالت اب قدرے بہتر تھی بخارا ترچکا تھا صحت بھی اب بہتر ہو رہی تھی اس دن چھٹی تھی جب احمر نے اسے تیار ہونے کو کہا تھا۔

(جاری ہے)

رواڈ انجسٹ 201 جولائی 2017ء

# روحانی ڈائری

شہلاگل مھر صالح کی ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

چلو چل کے سارے

دکھ کے سیپ سے

سکھ کے موتی چننے ہیں

چلو چل کے سارے

مصرفیات کے جنگل سے

فراغت کے گوہر تلاش کرتے ہیں

چلو چل کے

اداسیوں کے بادل سے

خوشی کی بارشیں، برساتے ہیں

چلو چل کے

رمضان کی نیک ساعتوں میں

اپنے رب کا قرب تلاش کرتے ہیں

چلو چل کے

عید کی خوشی میں

اپنے لمحات اپنے محسوسات

اور اپنی نیک خواہشات

ایک دوسرے کے نام کرتے ہیں

شہر بانو شہزاد کی ڈائری سے

پروین نور کی غزل

پونہی دوریوں میں گزر گئی

بکھی وہ جدا بکھی میں جدا

ان چاہتوں کے موڑ پر

بکھی وہ رکا بکھی میں رکا

وہی راستے، وہی منزلیں

نہ اسے مبر نہ مجھے پتہ

اپنی اپنی انا کی آگ میں

بکھی وہ جلا بکھی میں جلا

یہ قدرت کا عجیب سا کھیل تھا

نہ وہ بے وفائے میں بے وفا

پھر یہ کیا انصاف ہے

نہ وہ مجھے ملا نہ میں اسے ملا

مہ جیس بلال کی ڈائری سے

ایک غزل

ہمیں دریافت کرنے سے ہمیں تغیر کرنے تک

بہت ہیں مرحلے باقی ہیں زنجیر کرنے تک

ہمارے ہجر کے فے سیٹھو گے تو لکھو گے

ہزاروں بار سوچو گے ہمیں تحریر کرنے تک

ہمارا دل ہے پیمانہ سو پیمانہ تو جھٹکے گا

چلو دو گھونٹ نم بھرو ہمیں تاثیر کرنے تک

پرانے رنگ چھوڑ دو آنکھ کے اک یہی رنگ کافی ہے

محبت سے چشم بھرو ہمیں تصویر کرنے تک

ہنر تکمیل سے پہلے مصور بھی چھپاتا ہے

ذرا تم بھی چھپا کر رکھو ہمیں تغیر کرنے تک

وہ ہم کو روز لونتے ہیں اداؤں سے بہانوں سے

خدا رکھے لیرے کو سلامت ہمیں فقیر کرنے تک

ایم جے قریشی کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی غزل

شام کو یوں تیری پلکوں کو لرزاتے رہنا  
ذوب جائے جو یہ منظر تو برستے رہنا  
میں اگر ٹوٹ بھی جاؤں تو آئینہ ہوں  
تم میرے بعد بھی ہر روز سنو رتے رہنا  
اُس کی عادت وہی ہر بات ادھوری کرنا  
اور پھر بات کا مفہوم بدلتے رہنا  
آج سے سیکھ لیا ہے یہ قرینہ ہم نے  
بجھ بھی جانا تو بڑی دیر سلگتے رہنا  
جانے کس عمر میں جائے گی یہ عادت اپنی  
روحنا اس سے تو اوروں سے الجھتے رہنا

شبانہ عزیز میرانی کی ڈائری سے

پروین شاکر کی نظم

پھر وہی بستر سنجاف یہ کانٹوں کی بہار  
پھر سے شب خوابی کے ملبوسِ حریری میں  
تن زار کی آگ  
پھر تری یاد میں جلتے دل کو  
کسی پہلو نہیں آتا ہے قرار  
اے مرے خواب چراغ

تیرا پیراہن آبی بھی اسی طرح شرابا رہے کیا  
اور ترچشم سبک خواب سے بھی  
نیند بزار ہے کیا  
یا ہمیشہ کی طرح  
تیرے لیے رقصِ دل آرام ہے رات  
نیند کے شانوں پر سر رکھے ہوئے سوتا ہے  
مے کے اور ساقیِ محفل کے اثر سے تیری  
آنکھ میں ہلکی گلابی ڈوری  
مسکراتا ہوا تنہائی پر

تومری یاد غلط کرنے کو جانتا ہے

مصباح مکانِ رؤف کی ڈائری سے

ایک خوبصورت نظم

خوشیوں کے رقص  
اب تو دل کو یہ اعتبار ہے کہ  
بہار جب بھی حیاتِ چمن کی چھائی خزاں میں اترے گی  
میرے دل آنگن سے بھی گزرے گی  
اگرچہ بات یہ بھی ہے کہ  
خوشیوں کے مسافر کو گزرنا پڑے گا  
بہت ہی پریشوار رستوں سے  
مگر ان پریشوار رستوں کی منزل خوشیوں کا مگر ہوگی  
خوشیوں کا مگر ہوگا جو میرے دل آنگن کا حصہ ہوگا  
اب تو دل کو یہ اعتبار ہے کہ حیاتِ چمن پہ چھایا اداں موسم  
چند لمحوں میں ہی خوشیوں کے رقص میں گم ہوگا  
اب تو دل کو یہ اعتبار ہے کہ  
خوشیوں کے مسافر کو میرے چمن تک  
پہنچنے کو  
محض چند لمحوں کی ساعت باقی ہے

فوزیہ کریم کی ڈائری سے

ایک غزل

ادھورے پن کی یہ رفتہ رفتہ پھیل کرتی تھی  
محبتِ زندگی کو حسن میں تبدیل کرتی تھی  
کبھی سوچا بھی ہے تو نے کہ وہ مغرور سی لڑکی  
نہ جانے کیوں تیرے ہر حکم کی تعمیل کرتی تھی  
نہیں روتی ہے اب وہ بند کمرے میں گھٹ کر  
وہ اپنے آنسوؤں کو شہر میں منہیل کرتی تھی  
ساغرِ ذوب جاتے تھے بنا سوچے بنا سمجھے  
وہ اپنی آنکھ کو جب خاموشی سے جھیل کرتی تھی

☆.....

# انشعار

مسنز نگہت غفار ————— کراچی  
 کبھی چاندراہوں میں کھو گیا کہیں چاندنی بھنگ گئی  
 میں چراغ وہ بھی بجھا ہوا میری رات کیسے چمک گئی  
 میری داستاں کا عروج تھا تیری زم پلوں کی چھاؤں میں  
 میرے ساتھ تھا تجھے جاگنا تیری آنکھ کیسے جھپک گئی  
 حنا علی ————— ملتان  
 میں بھی ہوں اگر خاموش آج ہنسنا تو بھی نہیں  
 مجھ سے پھڑکے کسی سے ملا تو بھی نہیں  
 امبرین ————— اسلام آباد  
 کوئی حرف وفا نہ حرف سادہ  
 میں خاموشی کو سننا چاہتی ہوں  
 میں بچپن کے کسی لمحے میں رک کر  
 کوئی جگنو پکڑنا چاہتی ہوں  
 نگہت تو قیر ————— چیچہ وطنی  
 چند دن تو اگر میرے ساتھ رہے  
 کسی قدر جیسے پھر سفر حیات رہے  
 جہاں چاہے تو چلا جا اے ہمسفر  
 کوئی منتظر ہے اتنا مگر یاد رہے  
 ثناء حیات ————— کراچی  
 کوشش کے باوجود بھی تو بھولتا نہیں  
 تیرے بغیر کیا کروں کچھ سوچتا نہیں  
 ہوئی ہے صبح و شام مگر اس کے باوجود  
 ہے چاند تیری یاد کا جو ڈوبتا نہیں

فرزانہ شوکت ————— کراچی  
 رات سر پر ہے پرندوں مستقر مت بھولنا  
 آسمانوں میں اڑو لیکن شجر مت بھولنا  
 اک نئی رُت کے سفر پر جانے والے قافلو  
 اپنی مٹی اپنے موسم اپنے گھر مت بھولنا  
 سباس گل ————— رحیم یار خان  
 عید کے رنگ دیکھنے کے لیے  
 چاند اُترا ہے میرے آنگن میں  
 سعدیہ عابد ————— کراچی  
 خمارِ غم ہے مہکتی فضا میں جیتے ہیں  
 ترے خیال کی آب و ہوا میں جیتے ہیں  
 فراقِ یار میں سانسوں کو روکے رکھتے ہیں  
 ہر ایک لمحہ گزرتی فضا میں جیتے ہیں  
 سیدہ فرزانہ حبیب فرزین ————— کراچی  
 ماں کی آغوش اور اس کی دعائیں  
 خوش قسمت ہے وہ جس کو مل جائیں  
 پاؤں گے عزت اور جنت کی ہوائیں  
 چوم لو ماں کے قدم لو اس کی بلائیں  
 سیدہ عروج فاطمہ ————— ملتان  
 آگ محبت کی خود ہی سلگ اٹھتی ہے  
 بہا کر دیکھ لو آنسو نہیں بجھتی نہیں بجھتی



دھنک ناز—کراچی  
اک ناتمام خواب مکمل نہ ہو سکا  
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے  
رابعہ منیر—سرگودھا

وہ جذبوں کی تجارت تھی دل کچھ اور سمجھا تھا  
اسے ہنسنے کی عادت تھی دل کچھ اور سمجھا تھا  
مجھے اس نے کہا آؤ نئی دنیا بساتے ہیں  
اُسے سوچھی شرارت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا  
نوشین مدر—لاہور

مل ہی جائے گا کبھی دل کو یقین رہتا ہے  
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے  
روز ملنے پر بھی لگتا تھا کہ جگ بیت گئے  
عشق میں وقت کا احساس نہیں رہتا ہے  
مریم نواز—فیصل آباد

تمہارے ساتھ ہی موسم بھی رُخ بدلنے لگے  
ہوا خسی ہے تو بارش کے تیر چلنے لگے  
رو حیات میں یوں تم نے میرا ساتھ دیا  
کہ جیسے چاند مسافر کے ساتھ چلنے لگے  
حمزہ علی—سالکوٹ

کچھ دنوں کی یہ ملاقاتیں بہت اچھی لگیں  
اس سے جو کچھ ہو سکیں باتیں بہت اچھی لگیں  
بعد مدت اس کی دعوت پر جو اس کے گھر گیا  
پھر اسی گھر میں مداراتیں بہت اچھی لگیں  
ریمل تنویر—اوکاڑہ

رسم خجہ بھی اٹھا دی ہم نے  
عظمت عشق بڑھا دی ہم نے  
دل کو آنے لگا بسنے کا خیال  
آگ جب گھر کو لگا دی ہم نے

فرح قیصر—گجرات  
زرد موسم کے اجال لحوں میں  
ہم رو پڑے یونہی ہنسنے ہنسنے  
یارب اب تو کوئی تعبیر بخش دے  
کہ تھک گئیں آنکھیں خواب ہنسنے بننے  
شازیہ تبسم—کراچی

دل اس قدر اداس بھی پہلے کبھی نہ تھا  
غم میرا اک رفیق تو تھا زندگی نہ تھا  
کبھری ہوئی تھی شہر میں چہرہ کی بازگشت  
جس شخص کی تلاش تھی بس اک وہی نہ تھا  
طیبہ نسیم—وہاڑی

اتنا آساں بھی نہیں اپنی ہستی سے گزر جانا  
اترا جو سمندر میں تو دریا بہت رویا  
جو شخص نہ رویا تھا پتی ہوئی راہوں میں  
سایہ دیوار میں بیٹھا تو بہت رویا  
نسب بلال—کوئٹہ

ملا تھا ہجر کے رتے میں صبح کی مانند  
پھٹ گیا تھا مسافر سے رات ہونے تک  
میں اس کو بھولنا چاہوں تو کیا کروں آخر  
وہ مجھ میں زندہ ہے میری ذات ہونے تک  
صباحر—ہارون آباد

کیا خبر کون سی خوشی کے لیے  
دل یونہی گنوائے جاتا ہے  
رنگ پیلا ہے تیرا کیوں ناصر  
تجھے کیا رنگ کھائے جاتا ہے  
نوربانو—کوئٹہ

ہجر کی تمازت سے وصل کے الاؤ تک  
لوکیوں کے چلنے میں دیر کتنی لگتی ہے  
بات جیسی بے معنی بات اور کیا ہوگی  
بات سے مکر نے میں دیر کتنی لگتی ہے

# اس ماہ میں

مشکل ہو جائے۔

☆ محبت ایسا جذبہ ہے سخت سے سخت دل کو نرم کر دیتا ہے۔  
☆ دھوکا دینے سے پہلے ہزار بار سوچو کہ اس میں ہمارا نقصان تو نہیں۔  
سمیرا یوسف۔ کراچی

## اس ماہ کا یقین

کبھی بھی کسی انسان کی طرف سے اپنی ناقدری پر نہ کڑھنا، کیونکہ قدر و قیمت کا تعین ہمیشہ وقت کرتا ہے اور درجات اور متعین ہوتے ہیں۔ اگر انسانی رویوں میں الجھوٹے تو زندگی بھر الجھ کر رہ جاؤ گے۔ بس عیب اور غیب کے جاننے والے کے ساتھ اپنے معاملات سلجھائے رکھو۔  
ساری الجھنیں اور مسائل دور ہو جائیں گے۔  
فرزانہ شوکت۔ کراچی

## اس ماہ کی شوخ سطریں

☆ ڈاکٹر..... وہ ہے جو آپ کی بیماری کو دواؤں سے مارتا ہے اور آپ کو دواؤں کے بل سے۔  
☆ شادی..... وہ سلسلہ ہے جس میں مرد اپنی بچلر کی ڈگری کو کھو دیتا ہے اور عورت ماسٹر کی ڈگری حاصل کرتی ہے۔  
☆ طلاق..... شادی کا زمانہ مستقبل کہلاتا ہے۔

## اس ماہ کا شاعر

دینہ (جہلم) میں جنم لینے والے سپورن سنگھ گلزار شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں، فلمی ہدایت کار اور اسکرپٹ رائٹر ہیں۔ مکالمے لکھتے ہیں اور بچوں کا ادب بھی تخلیق کرتے ہیں۔ کئی ہندوستانی زبانوں کی شاعری کے اعلیٰ پائے کے اردو تراجم کر چکے ہیں۔ پدم بھوشن ایوارڈ، ساہتیہ ادا کا می ایوارڈ، گریبی ایوارڈ، آسکر ایوارڈ کے علاوہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز، شملہ لائف ٹائم اچیومنٹ فیلوشپ کے ساتھ بیس بار فلم فیئر ایوارڈ اور سات بار نیشنل ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ گلزار کا ٹیلی ڈراما ”مرزا غالب“ ایک کلاسیک کی حیثیت رکھتا ہے۔

سعدیہ عابد۔ کراچی

## اس ماہ کا شعر

اُنے بھی کھڑکیاں کھولے زمانہ بیت گیا  
مجھے بھی شام و سحر کا پتا نہیں چلتا  
سباس گل۔ رحیم یار خان

## اس ماہ کے اقوال زریں

☆ علم حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے۔  
☆ محنت کرنے والا اللہ کا دوست ہے۔  
☆ کسی سے اتنا پیار مت کرو کہ جدائی سہنا

☆ ڈکٹری..... جہاں ڈائی ورس پہلے آتا ہے اور میرج بعد میں۔

☆ کانفرنس..... جہاں ہر کوئی بولتا ہے اور کوئی نہیں سنتا اور بعد میں کوئی بھی متفق نہیں ہوتا۔

☆ معاری کتابیں..... جن کی لوگ تعریف تو کرتے ہیں مگر پڑھتا کوئی نہیں۔

☆ آفس..... جہاں آپ زیادہ آرام سے رہ سکتے ہیں اپنی سخت گھریلو زندگی سے۔

☆ جمائی..... یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جہاں پر ایک شادی شدہ آدمی کو منہ کھولنے کی اجازت ہوتی ہے۔

☆ اینیم بم..... وہ ایجاد ہے جس سے تمام ایجادات ختم کی جاسکیں۔

☆ کنجوس..... وہ آدمی جو ساری زندگی غربت میں گزارتا ہے تاکہ امیر ہو کر مر سکے۔

☆ باپ..... قدرت کا دیا ہوا خزانہ کچی۔ ایس امتیاز احمد۔ کراچی

☆ اس ماہ کے اقوال زریں

☆ بھوکے کو کھانا کھانا، حاجت مند کی حاجت روائی کرنا اور دشمن کے ساتھ اچھا سلوک کرنا نفس کی زینت ہے۔

☆ حاسد تمہاری خوشی سے غمگین ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے کافی ہے تمہیں انتقام کی ضرورت نہیں وہ خود ہی اپنی آگ میں جل رہا ہے۔

☆ سستی اور عدم دونوں لفظوں کے معنی گویا

☆ ایک ہی ہیں۔ انسان کی زندگی دنیا میں اس شمع کی مانند ہے جو ہوا میں رکھ دی گئی ہو۔

☆ دیو کی طرح طاقت ور ہونا بڑی اچھی بات ہے لیکن طاقت کو دیو کی طرح استعمال کرنا ظلم ہے۔

☆ مجھے ہر اس چیز سے لگاؤ ہے جو پرانی ہو، پرانے دوست، پرانی کتاب، پرانے زمانے، پرانی بیوی۔

☆ اونچے پہاڑ پر جانے کے لیے آہستہ آہستہ چڑھنا پڑتا ہے۔

☆ احمق کا دل منہ میں اور عقلمند کی زبان دل میں ہوتی ہے۔

☆ لباس اس طرح کا پہنو کہ کوئی شخص یہ تمیز نہ کر سکے کہ تم دولت مند ہو یا گنگال۔

☆ دانا وہ ہے جو دنیا کی چمک دمک سے دھوکا نہ کھائے اور دولت مند وہ جو خدا کی تقسیم پر راضی ہو۔

☆ جس کا انجام موت ہو اس کے لیے خوشی کا کون سا مقام ہے دشمن کو نیک مشوروں سے شکست دو۔

☆ دولت کی کمی آسانی سے پوری کی جاسکتی ہے مگر روح کا افلاس ناقابل تلافی ہے۔

☆ پھول نے وقت سحر آسمان سے فریاد کی مجھ سے میری شبنم چھنی جا رہی ہے اسے کیا معلوم کہ آسمان ستارے کھورہا ہے۔

☆ دنیا کی ہر خوشی والدین کے دم سے ہے جس گھر میں والدین نہیں وہ قبرستان سے بھی بدتر کھنڈر ہے۔

☆ راستوں کی ویرانی اور چلیاقتی دھوپ سے ڈرنے والے منزل پر نہیں پہنچتے۔

☆ مسرت بخت غفار۔ کراچی

☆ اس ماہ سچی بات

☆ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ مرد عورت پر ظلم کرتا ہے یا مرد نے عورت پر ظلم کرنا سیکھا ہے میں تو اس بات سے بھی انکار کرتا ہوں

آپ کو تیار کرلو۔“

☆

چور کی بیوی۔ ”گھر میں راشن ختم ہو گیا ہے۔“  
چور غصے سے بولا۔ ”لے آؤں گا پہلے دکانیں  
تو بند ہونے دو۔“

☆

مجسٹریٹ نے چور لڑکے کے باپ کو ڈانٹتے  
ہوئے کہا۔ ”آخر تم اپنے لڑکے کی اصلاح کیوں نہیں  
کرتے اسے کیوں نہیں بتاتے کہ درست راستہ کیا  
ہے چور لڑکے کے باپ نے جواب دیا۔ ”جناب  
میں نے اس کو بہت دفعہ سمجھایا اور تربیت دی لیکن ایسا  
بے وقوف ہے کہ ہر دفعہ ہی پکڑا جاتا ہے۔“

☆

ایک وکیل دوسرے سے۔ ”تم نے دیکھا میں  
نے ایک شخص کو جعلی کرنسی کے مقدمے سے بری  
کر دیا لیکن اس نے میرے ساتھ کیا کیا۔“  
دوسرے وکیل صاحب نے پوچھا۔ ”کیا کیا؟“  
پہلے وکیل نے جواب دیا۔ ”وہ مجھے قس میں  
جعلی کرنسی ہی دے گیا۔“

نمرہ احسن۔ کراچی

### اس ماہ کی پیاری بات

دل میں محبت اور چہرے پر ناراضی دوسروں کو  
بہت اذیت میں مبتلا کرتی ہے۔ اکثر ناراضی  
بھانپ کر رخ بدل کر چھوڑ جاتے ہیں اور زندگی بھر  
دیکھنا تبھی نصیب نہیں ہوتا اگر محبت ہو تو دل میں  
بھی اور چہرے پر بھی محبت کے آثار رکھو جو  
دوسروں کی خوشی کا باعث بنے اور وہ ہزاروں  
سال آپ کو بھول نہ پائیں۔

ایم یعقوب مدنی۔ حیدر آباد

☆.....

کہ مرد ظالم ہوتے ہیں اگر مرد ظالم ہوتے اور مرد  
نے عورت پر ظلم کرنا سیکھا ہے تو دنیا کی ہر ایک  
عورت مظلوم ہوتی۔ ہر عورت پر ظلم ہوتا ہے شک  
انسانی تاریخ کے ساتھ عورت پر ظلم کی داستان ملتی  
ہیں لیکن کیا ہر عورت کے ساتھ ظلم ہوا؟ یقیناً نہیں  
کیونکہ ظلم صرف اور صرف ان پر ہوا ہے جو ظلم کے  
خلاف خاموش رہی ہیں۔

خولجہ حسین جاوید۔ منجن آباد

### اس ماہ میری بیٹی

میری سوچ کی مجھ میرے پیار کا سبب اٹا  
میری ننھی بڑی تجھ سے منسوب ہے  
تو میرے دل کی وہ کلی ہے  
جودل کے ہر گوشے میں آباد ہے  
میرا سارا پیار صرف تم سے ہے  
تو میری ہر پوری آرزو ہو  
میں اپنی زندگی کا تصور تیرے بنا کر ہی نہیں سکتا  
میری ہر خواہش تیرے روپ میں پوری ہوئی  
اک عجب احساس

سوچ کے دل شاد ہو جاتا ہے

تیرے صدقے میرا جہان آباد ہے

میری مالک دو جہاں سے دعا ہے

ایسی خوشی کا ثبات میں سب کو ملے

وفا صدام حسین غازی تنیو۔ حیدر آباد

### اس ماہ کے شگونی

امتحان میں فیل ہونے کے بعد ایک لڑکے  
نے گھر جانے سے پہلے بہن کو فون پر کہا۔ ”میں  
فیل ہو گیا ہوں میرے آنے سے پہلے ابا کو تیار  
کرلو۔“

بہن نے کہا۔ ”ابا کو اطلاع مل چکی ہے اپنے



## قرآن کی باتیں

کرتے ہیں۔

- 1- اول یہ کہ جو لوگ اذان کی آواز سن کر جواب دیں ان کے تمام گناہ خدا بخش دیتا ہے۔
- 2- دوسرے یہ کہ جو لوگ نعرہ بکیر بلند کر کے میدان جہاد میں کود جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو اور ان کے گھوڑوں تک کو بخش دیتا ہے۔
- 3- تیسرا یہ کہ وہ لوگ جو رزق حلال کماتے ہیں اور کھاتے ہیں۔

4- چوتھے وہ جو فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد آفتاب طلوع ہو جانے تک اپنی جائے نماز پر بیٹھے ذکر الہی کرتے رہتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان پر ان کے عزیزوں اور رشتے داروں تک پر اپنی رحمتوں کا اتنا نزول کرتا ہے، کچھ شمار نہیں۔

### انمول موتی

- ☆ ڈرو۔ صرف خدا سے۔
- ☆ لڑو۔ صرف برائی سے۔
- ☆ مرو۔ صرف اللہ کی راہ میں۔
- ☆ کرو۔ صرف نیک کام۔
- ☆ چلو۔ صرف سیدھے راستے پر۔
- ☆ ہسو۔ صرف اچھے کام پر۔
- ☆ برو۔ صرف نیکی کی طرف۔
- ☆ آؤ۔ صرف اللہ کے گھر میں۔
- ☆ بتاؤ۔ صرف سچی بات۔

مسز نگہت غفار۔ کراچی

- ☆ بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ (سورہ آل عمران: 19)
- ☆ ہر قوم کے لیے ہادی ہے۔ (سورہ العنکبوت: 7)
- ☆ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور چلوں کے ساتھ رہو۔ (سورہ التوبہ: 119)
- ☆ اے ایمان والو! اللہ کا ذکر بہت زیادہ کرو۔ (سورہ الاحزاب: 41)
- ☆ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ (سورہ التوبہ: 111)
- ☆ کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو۔ (سورہ فاطر: 24)
- ☆ سجدہ عابد۔ کراچی

### نعتیہ قطعہ

اُن کے عشاق میں ہو گیا ہوں  
کیا بتاؤں تمہیں میں کہ کیا ہوں؟  
میری اوقات کیا پوچھتے ہو  
میں گدائے درِ مصطفیٰ ہوں  
راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خان  
چار اعمال

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابلیس کو افسردہ اور محکمین دیکھا۔ وجہ دریافت کی تو بولا۔ آپ کی امت کے چار اعمال بہت عملیں

## مسلم کی حاجت روائی کرنا

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ کون سی ان دو نعمتوں میں سے میرے لیے زیادہ قابلِ عظمت ہے یہ کہ ایک آدمی نے اپنے چہرے کا سچ رخ اس لیے میری طرف کیا کہ مجھے اپنی حاجت روائی کے لیے خیال کیا اور اللہ پاک نے اس کی حاجت کو پورا کر دیا یا اس آدمی کے لیے میرے ہاتھوں آسانی ہو گئی اور اگر میں کسی مسلمان کی حاجت روائی کروں یہ بات مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میرے پاس زمین بھر کر سونا اور چاندی ہوئی۔

سیدہ عروج فاطمہ۔ ملتان

## اقوال زریں

☆ اپنے اعمال کو دعا کے سہارے سے محروم نہ ہونے دیا کرو۔  
☆ سال وہ کچھ سکھاتے ہیں جن سے دن واقف نہیں ہوتے۔  
☆ صوفی وہ ہے جس کا کردار موافق گفتار ہو۔

☆ دوسروں کو عزت دینا بھی سخاوت ہے۔  
☆ مشکل ترین کام بے کار رہتا ہے۔

سمیرا گل ناز شہر دہ۔ کراچی

## چاند ادھورا تھا!

دن کے اجالوں کی سانسیں ٹوٹنے لگیں تو وہ بے جان ہو کر رات کی آغوش میں لیٹنے لگے۔ اجالوں کی موت پر ماتم کرتی ہوا کا شور بڑھا تو بچے بھی عالم دل گیری میں نوحہ خواں بن گئے۔ اداس شام میں سفر کرتے قافلوں کے قدم بھی ڈمگمانے لگے۔ شام کے پھیلتے دھندلکوں میں

انجانی منزل کی جانب رواں ستارے بھی کھوئے کھوئے سے تھے۔

درختوں کی اوٹ سے نکلتے چاند میں آج وہ بات نہیں تھی۔ آج اس کی چمک میں بے رونگی تھی۔ آج کہیں کچھ کمی تھی، جو چاند کا حسن ماند کیے جا رہی تھی۔ شاید اس کے دامن میں دکھ کی کک اور کسی درد کی جھین تھی، تب ہی تو رات کے ماتھے پر چمکتا چاند ایک بدنما دھبہ لگ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں آج اپنے دکھ کا عکس مجھے چاند میں نظر آیا، جہاں شاید آج چاند ادھورا تھا..... میری طرح!

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

## قابلِ غور

☆ ہر گندہ چیز وہاں سے ملتی ہے جہاں وہ کھوتی ہے۔  
☆ خاموشی عظیم نعمت ہے، بالخصوص اس مقام پر جہاں اختلاف زیادہ، آواز بلند، علم کی شدید کمی اور دلیل کی کوئی اوقات نہ ہو۔  
زندگی کیا ہے؟

ایک قہقہہ، خوبصورت خواب ہے۔ پانی کا بلبہ ہے۔ کبھی یہ پھولوں کی طرح نرم ہے اور کبھی اس قدر تلخ کہ سانس لینا بھی سزا ہو جاتا ہے۔ بے شک یہ ایک نعمت ہے مگر کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ یہ نعمت کانٹوں کی سیج بن جاتی ہے۔

## آخری پیار

کسی کا پہلا پیار بننا کوئی خاص بات نہیں، بننا ہے تو کسی کا آخری پیار بنو، اس لیے کبھی یہ مت سوچو کہ تم سے پہلے وہ کسی اور سے پیار کرتا تھا، کوشش یہ کرو کہ تمہارے بعد اسے کسی اور کے

پیار کی ضرورت نہ رہے۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

میں نے کہا:

”یہ تو بڑی لاجواب غزل ہے۔ ذرا پڑھیے تو۔“

پیار

پیار وہ ہے جب ماں سر جوئے۔

پیار وہ ہے کہ ابو ہر گلی پر نہیں اب نہ کرنا۔  
پیار وہ ہے جب بہن کام کرنے کے بعد کہے  
کہ بس میں (تم ہی تو ہو) نہ تو زونگ جیسا ہے کہ  
سب کہہ دو۔

ہمارا رشتہ تو اسٹیت لائف انشورنس جیسا ہے

یعنی

زندگی کے ساتھ بھی

زندگی کے بعد بھی

کیا سوچا تھا

کیا ہو گیا

قدیل شازیہ۔ لیہ

دل کے گلہ ان میں پھول

خلیل جبران:

ہم اپنی خواہشوں کو دل میں اس طرح سجاتے  
ہیں جیسے گل دان میں پھول کی طرح ہوتی ہے۔  
ہم لمحہ لمحہ اس کے حسن سے آنکھوں کو سیراب  
کرتے ہیں۔

نمن مروت۔ ڈپرہ غازی خان

وصال یار

”محترمہ! میری دلچسپی فقط ایک لڑکی میں  
ہے۔ فرمائیں آپ کا سبق کس غزل پر ہے؟“

جواب میں رضیہ نے ایک غزل کے پہلے  
مصرعے پر انگلی رکھ دی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔  
میں نے دیکھا تو غالب کی مشہور غزل تھی۔

”یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا“

رضیہ نے دوبارہ مصرعہ پڑھا۔ پہلے سے ذرا  
بہتر تھا۔ لیکن وصال اور یار کو اضافت کے بغیر  
الگ الگ پڑھا۔ اس پر ہم نے ٹوکا۔

”یہ وصال، یار نہیں وصال یار ہے۔ درمیان

میں اضافت ہے۔“

”اضافت کیا ہوتی ہے؟ کہاں ہوتی ہے؟“

اور پھر بولا۔

”میں ہر روز یہیں اپنے برش صاف کرتا ہوں۔“  
خرم علی۔ کوئٹہ

### کیا ملا محبت سے

کیا ملا محبت سے  
خواب کی مسافت سے  
وصل کی تمنائت سے  
روز و شب ریاضت سے  
کیا ملا محبت سے؟  
ایک ہجر کا صحرا  
اک شام یادوں کی  
اک تھکا ہوا آنسو.....

شاعرہ: نوشی گیلانی  
شرہ شہباز۔ پشاور

### عورت اور عشق

عورت صرف شادی کرتی ہے یا شادی کی  
غرض سے عشق کو اپنے اوپر طاری کر لیتی ہے۔  
اپنے اوپر کسی مرد کا بھوت سوار کر لیتی ہے۔  
عورت سامنے کی چیزوں سے پیار کرتی ہے جب  
کہ عشق تو دل کی گہرائیوں میں ڈوب جانے کا  
نام ہے۔ عشق کی کوئی چار دیواری نہیں ہوتی۔  
جب کہ عورت چار دیواری ڈھونڈتی ہے۔ عشق کا  
افزائش نسل سے بھی کوئی تعلق نہیں، اس میں فنا  
ہے۔ جب کہ عورت بقا ڈھونڈتی ہے۔ عورت  
ایک چھت ڈھونڈتی ہے جب کہ عشق کی چھت  
آسمان ہے۔

محبت مردہ پھولوں کی سمفنی از مظہر الاسلام  
غزل خان۔ شورکوٹ

☆.....

”یہ چھوٹا سا زیر نظر آرہا ہے آپ کو! اس کو  
اضافت کہتے ہیں۔“  
”تو سیدھا دصالے یار کیوں نہیں لکھ  
دیتے؟“

”اس لیے کہ وہ علماء کے نزدیک غلط ہے۔“  
یہ ہم نے کسی قدر عجب سے کہا۔  
”علماء کا دصال سے کیا تعلق ہے! اچھا جانے  
دیں علماء کو مطلب کیا ہوا؟“  
”شاعر نے کہا ہے کہ یہ میری قسمت میں ہی  
نہ تھا کہ یار سے دصال ہوتا۔“  
”قسمت کو تو غالب صاحب درمیان میں  
یوں ہی گھسیٹ لائے ہیں۔ مطلب یہ کہ بے  
چارے کو دصال نصیب ہی نہیں ہوا۔“  
”جی ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات تھی۔“  
”کیا وہ؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں؟“  
”کیوں نہیں کہہ سکتے؟ آپ ٹیوٹر ہیں۔“  
”شاعر خود خاموش ہے۔“  
”تو شاعر نے وجہ نہیں بتائی مگر یہ خوش خبری  
سنادی کہ دصال میں قیل ہو گئے۔“  
(کرتل محمد خان کی بزم آرائیاں سے اقتباس)  
حصہ رحمن۔ فیصل آباد۔

### ماڈرن آرٹ

نئے نئے ایک آرٹ کے دلدادہ ناقد نے  
بڑے جوش سے کہا۔  
”واہ صاحب کیا تصویر ہے۔ کیا رنگوں کی  
آمیزش ہے۔ خطوں کی کھاوٹ تو بس انتہا ہے۔  
صاحب میں تو بس ایسے ہی آرٹ کا قائل ہوں۔“  
آرٹسٹ نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا



# فدا فی سب کھنا

عید کی خوشیاں صرف ساجن کے سنگ

عید کے لمحات ہیں ساجن  
دل میں لاکھ خواہشات ہیں ساجن  
ہونٹوں پر زیر لب ہر دم  
تیرے نام کی شہیہات ہیں ساجن  
یادوں کا ساون کن من بر سے  
پل پل تیرے خیالات ہیں ساجن  
ہجر کا سورج آگ بر سائے  
دل کے عجب حالات ہیں ساجن  
ہر خوشی جیسے روٹھ گئی ہم سے  
پریم کے عجب معاملات ہیں ساجن  
پائل چوڑی تنگنا پہنوں  
دل کی راکھ مناجات ہیں ساجن  
عید کے لمحات ہیں ساجن  
دل میں لاکھ خواہشات ہیں ساجن  
شہلا گل سحر صالح

میں جا رہی ہوں

میں جا رہی ہوں  
مجھے اب تم سے کبھی بھی ملنے کی چاہ  
نہیں ہے  
میرے حوالے سے سارے وعدے  
تمہارے دعوے فریب تھے بس  
مجھے محبت کی سرد بھٹی میں جھونک کر تم

اپنے کاموں میں لگ گئے تھے  
تمہیں خبر بھی نہیں ہو سکی کہ  
تمہارے لہجے کی سرد مہری  
تمہارے رویے کی بے نیازی و بے حسی نے  
کیسے میرے دل و روح کو بے بار ڈالا  
تمہیں محبت ایک مشغلہ اور کھیل لگتی ہے  
سو تم نے کھیلایا یہ کھیل مجھ سے  
اور

بدل لیا ہے یہ مشغلہ اب  
سو مگرئی ہوں میں جاناں!  
تمہاری دنیا سے جا رہی ہوں  
تمہارے رستے سے  
ہٹ رہی ہوں  
مجھے اب واپس پلٹ کے آنا نہیں ہے ممکن  
تمہیں تمہاری محبتوں کے سبھی وعدے  
بخش دیئے ہیں۔

وہ اٹک جو تم نے مجھ سے دیئے ہیں  
وہ سب بہا کے  
وہ معاف کر کے میں جا رہی ہوں  
تمہیں بھی آزاد کر رہی ہوں  
خود بھی دنیا سے جا رہی ہوں  
تمہاری دنیا سے جا رہی ہوں

سبا گل

نظم

میرا مجھ میں تو  
کچھ بھی نہیں رہا باقی  
آنکھیں میری ہیں مگر  
ان میں خواب تمہارے ہیں  
میری شاعری کے سب  
خیال تمہارے ہیں  
مجھے جانتے ہیں سب  
میرے الفاظ سے مگر  
میں سب کو کیسے بتاؤں  
یہ محبت کی کہانی ہے  
سب ہی بھید  
میرے دل کے  
یہ شاعری کھول دیتی ہے  
تمہارا نام میں اکثر  
لکھ کر کاغذ پر  
مناٹا بھول جاتی ہوں  
جلانا بھول جاتی ہوں  
مگر یہ بھولی نہیں ہوں میں  
ہوں میں مشرقی لڑکی  
ردا جوں میں قید رہتا ہے  
کسی سے یہ نہیں ہے کہنا  
مجھے تم سے محبت ہے  
تمہارا نام پھر مجھ کو  
مناٹا پڑتا ہے  
جلانا پڑتا ہے  
مگر یہ بھی حقیقت ہے  
میں یہ سب دل سے نہیں کرتی

سیدہ عروج فاطمہ

نظم

تیرے بن پئی نہیں تھی  
میری شاعری  
سوئی، سوئی  
ریت کی خوشبو  
دے رہی ہے مہملی روپ  
تپش ہوتی نہیں  
اب سورج کی محسوس  
چھین دیتی نہیں اب  
سورج کی کرنیں  
آنکھوں کو بھلی لگتی ہیں  
اب سرد راتیں  
پوری نہیں ہو پاتی  
اب اکثر ہر باتیں  
وقت کی کمی بھی  
ہوتی ہے اب  
شدت سے محسوس

زردہ و صمان

نظم

بہت سے عام لوگوں میں  
بہت ہی عام سے ہیں ہم  
کہ بالکل شام سے ہیں ہم  
کہ جیسے شام ہوتی ہے  
بہت چپ چاپ اور خاموش  
بہت ہی پرسکون لیکن  
کسی پہ مہربان جیسے  
مگر بے چین ہوتی ہے  
کوئی ہو راز داں جیسے  
خفا صبح کی کرنوں سے

کہ جیسے شام ہوتی ہے  
یوں بالکل شام سے ہیں ہم  
بہت ہی عام سے ہیں ہم  
مکران عام لوگوں میں  
دل حساس رکھتے ہیں  
بہت کچھ خاص رکھتے ہیں  
اگرچہ عام سے ہیں ہم

فرزانہ شوکت

### خوابیدگی

کوئی تم کو چھپ کے دیکھے  
تو پلک نہ جھپکے  
دیر تک دیکھتا ہی رہے  
اور تو بے خبر اپنے خدو خال سے  
ظریف احسن وہ باخبر  
تیرے حسن جمال سے  
انگڑائی کے کمال سے  
سرتاپا وصال سے  
خلوت کے پاتال سے  
مرمر میں مثال سے  
حسن لازوال سے  
نازنین کے حال سے

ظریف احسن

### غزل

راتوں کو خواب دیکھتے ہیں  
دن کو عذاب دیکھتے ہیں  
ہو گئے ہیں ہم بدنام سے  
پھر بھی سراب دیکھتے ہیں  
کون جنے گا تیرے انتظار میں  
پھول پھر زیر آب دیکھتے ہیں

مسکراتا ہے کوئی کوئی جہاں میں  
کسی کے گھر اترتا آفتاب دیکھتے ہیں  
وہ رہتا ہے شہر کے کونے میں جاوید  
ہزار اس میں عیب دیکھتے ہیں  
محمد اسلم جاوید

### غزل

عین وصل کی رت میں جب وہ کچھ کہتا نہیں  
میں ہجر کی آہٹ سنتا ہوں اور رو دیتا ہوں  
وصل امید جب کرتی ہے بین میرے اندر  
میں ہجر پاراں سے کچھ نہیں کہتا اور رو دیتا ہوں  
جنون عشق کی روغی رت لگاتی ہے جب گلے  
حسین رت کی آس میں بکھرتا ہوں اور رو دیتا ہوں  
رت ہو بہار کی، پیار کی، کسی کے انتظار کی  
گزرے عشق کو کرتا ہوں یاد اور رو دیتا ہوں  
کچھ بھی نہ بچا پاس میرے مٹ گئے احساس میرے  
ہجر کی دلیز پر جلاتا ہوں دیا عشق کا اور رو دیتا ہوں  
سعدیہ عابد

### نظم

وہ حسین راتیں رم جھم کی برساتیں  
تیری پیار بھری بائیں سادون کی ملاقاتیں  
میں کیسے بھلا دوں؟  
وہ بہاروں کی منزل وہ پیار کا نشین  
وہ حسین نغمے اور موسم کا بانگین  
میں کیسے بھلا دوں؟  
وہ تیری شرارتیں اور مجھ کو ستانا  
اچانک آکر مجھے گدگدانا  
میں کیسے بھلا دوں؟  
کبھی آنکھوں پر رکھ کر ہاتھ مجھے ڈرانا  
اور پھر پیار سے مجھ کو گلے سے لگانا

کسی کو بھی ہم نے تو چاہا نہیں  
ایس امتیاز احمد

### ہلال عید

ہلال عید دیکھ کر  
میری آنکھوں میں  
تمہاری یادوں کے چراغ  
جل اٹھتے ہیں

اور میں  
تمہیں بہت مس کرتی ہوں

نگہت اکرم

### غزل

کوئی وعدہ کوئی امید دلاتے جاتے  
دل دھڑکنے کا سبب مجھ کو بتاتے جاتے  
میری نظروں نے کیا اس کا تعاقب لیکن  
اس نے دیکھا نہ پلٹ کر مجھے جاتے جاتے  
کچھ تو رہ جاتا بھرم میری محبت کا بھی  
چند آنسو ہی وہ آنکھوں سے بہاتے جاتے  
میرے جذبات میں بھر جاتے محبت اپنی  
میرے ہر خواب کو تعبیر دلاتے جاتے  
آہی جائے گا کسی روز وہ راہ پر اپنی  
کٹ گئی عمر اسی آس میں آتے جاتے  
سامنے بیٹھا تھا چپ چاپ وہ پتھر کی طرح  
اور ہم تھے کہ اسے شعر سناتے جاتے  
میری تربت پر کبھی پھول چڑھائے نہ مگر  
یہی کافی تھا کہ مرقد پہ وہ آتے جاتے  
ساتی بزم تھا مصروف پلانے میں حکیم  
اور ہم تھے کہ تہی جام اٹھاتے جاتے

حکیم خان خان

میں کیسے بھلا دوں؟

ہاں میں کیسے بھلا دوں؟

وہ دسمبر کی سرد راتیں وہ جلتا آتش دان

وہ ساون کا مہینا اور باغوں کی مہکتی فضا

موسم بہار کی رعنائیاں وہ شام کا منظر

وہ چودھویں کے چاند کا منظر وہ نگشتانی فضا میں

میں کیسے بھلا دوں؟

ہاں میں کیسے بھلا دوں؟

مزن نگہت غفار

### نظم

تمہاری طرح

دل کی گہرائیوں سے

کسی کو بھی

ہم نے تو چاہا نہیں

اور تمہارے علاوہ

کسی کو بھی

کیونکر یہ حق دیں؟

کہ ہم اس کو چاہا کریں اس طرح

جس طرح میری جاں!

ہم نے چاہا تجھے

ہاں!

ہمارے علاوہ

جسے چاہو تم

اس کو چاہا کرو

اور اپنی محبت کی کلیاں بھی اس پہ

نچھاور کرو

دم اسی کا بھرو

پر ہمیں جان جاں!

غیر ہے ناز ہے کہ

تمہاری طرح دل کی گہرائیوں سے

## غزل

وہ ادھر پڑھتا رہا اور میں ادھر لکھتا رہا  
کچھ جواب خط نہ آیا میں مگر لکھتا رہا  
اک اک حرف قلم کو تول کر لکھتا رہا  
مختصر تھا خط مگر میں رات بھر لکھتا رہا  
ہر نئی تحریر کا اندازہ رکھنا تھا جدا  
سوچ کر انجام کو آغاز پر لکھتا رہا  
تا کہ ممکن کر سکے مجھ کو نہ دریا کا سکوت  
پھینک کر دریا میں کنکر آب پر لکھتا رہا  
اک اسیر جاں کو یاد آشیاں آتی رہی  
اور وہ اپنے آپ کو بے یال و پر لکھتا رہا  
اشک میرے گر پڑے امتیاز سر قرطاس پر  
حال سے اپنے میں ہو کر بے خبر لکھتا رہا

ایس امتیاز احمد

## غزل

تیری چاہت سنبھال رکھی ہے  
جان حزیں میں و بال رکھی ہے  
آنکھ کے دائرے میں رہتے ہو  
جان تم پر کمال رکھی ہے  
دھڑ بجانے کو ہر معزز نے  
اپنی پگڑی اچھال رکھی ہے  
سردستا میں بھلا نہیں سکتا  
یاد نے تیری شال رکھی ہے  
خس دعا کا اثر ہے یہ ابرار  
ہر مصیبت جو ٹال رکھی ہے

ڈاکٹر ایم ابرار

## نظم

دن ڈھلتا نہیں  
دن گزرتا نہیں  
کچھ بھی اب نہیں  
بھاتا ہے مجھ کو  
سب کچھ ادھورا ادھورا  
سا  
لگتا ہے  
نہ بھوک لگتی ہے  
نہ ہی پیاس لگتی ہے  
نہ آنکھ لگتی ہے  
نہ ہی نیند آتی ہے  
نہ سکون ملتا ہے  
نہ ہی چین ملتا ہے  
جاناں، جب تم مجھ سے  
روٹھ جاتے ہو

افسانہ آفتاب کاوش

☆.....

## نظم

کبھی میں ایک خوب صورت درخت تھا  
پرندے مجھ پر کھونسلے بناتے تھے  
میں بھی خوش تھا کہ اب اکیلا نہیں ہوں  
مگر یہ ظالم انسان جو  
پیوں کے لیے، مجھے ختم کر رہا ہے  
اور میرے دوست پرندے بھی مجھے  
تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں  
اے معلوم نہیں  
کہ مجھ جیسے بے جان درخت پر بھی  
جب آرا چلتا ہے تو کتنی  
تکلیف ہوتی ہے  
آہ! ظالم نے مجھے قتل کر دیا اور  
میرے دوست پرندے بے گھر ہو گئے

فیضان احمد فیضی

# دوستوں کے لئے بیٹے

## شازیہ مصطفیٰ کے نام

بھی ایسا ہے؟) ویسے یہ تو تھا مذاق اور تھوڑا سا سچ بھی دل میں بڑی خواہش تھی کہ کبھی تم سے فرصت سے باتیں کر لوں تو بس پھر آج قلم کا سہارا لے لیا ہے۔ شاید تم میرا یہ پڑھ کر مسکرا رہی ہو تو پلیز اس وقت دعا کرو کہ میں جو چاہتی ہوں وہ بس مجھے مل جائے آمین دعا کا اس لیے کہا ہے کہ شاید اوپر والا تمہاری سن لے۔ میں تم سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتی ہوں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں اگر قسمت مجھے پنجاب سے کراچی دوبارہ لے گئی تو سچ میں تمہارا گھر ضرور دیکھوں گی خدا تمہیں ایک اچھا اور نیک ہمسفر عطا کرے۔ سنو اس دوستی کو کبھی مت توڑنا سمجھی۔

میری نظم صرف تمہارے نام

میرا اور تمہارا اک رشتہ ہے جاناں

اور یہ رشتہ ہر رشتے سے سچا ہے جاناں

سنو جاناں! اس رشتے کو مت توڑنا

پلیز میرے دل کو مت توڑنا تم وہ لڑکی ہو

جس سے دوستی کرنے کو

دل چاہا ہے تو سنو لڑکی

اس دل کی خطا بڑی سہی پر تم اسے مت توڑنا

اس رشتے کو مت توڑنا افشاں علی

ثناء کنول اللہ دتہ۔ لودھراں

ہماری بہت ہی پیاری اور ہر دل عزیز رائٹر شازیہ مصطفیٰ کی والدہ کا انتقال پر ملال 13 رمضان کو ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ شازیہ کی والدہ ایک نہایت شفیق اور مہربان خاتون تھیں ان سے جب بھی ملاقات ہوتی ان کے حسن اخلاق نے ہمیشہ بے حد متاثر کیا۔ میرے کانوں میں اب تک ان کی آواز کی نرمی گھل رہی ہے۔ بہت ہی نفیس اور شائستہ خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ شازیہ کو صبر عطا فرمائے، آمین۔

آپی

## دوستوں کے نام

السلام علیکم! میری بہنوں دوستوں اور شاگردوں سب سے پہلے صالحہ آپی ہاؤ آر یو؟ نورین آپی تسی کیسے ہو جناب امید ہے فٹ فٹ ہی ہوں گے۔ افشاں علی عرف فوزیہ علی میری پیاری دوست بہن ہمراز کیسی ہو اور آج کل کیا ہو رہا ہے۔ میری طرح صرف کہانیاں لکھ رہی ہو یا پھر پڑھ بھی رہی ہو۔ سچ یا میرے گھر میں رائٹر کی تو کوئی قدر ہی نہیں ہے کام کام اور بس کام ہی کرتے رہو۔ (کیا تمہارے ساتھ

ایسے میں  
ہم سفر جی تمہاری یاد بہت آتی ہے  
نینا خان - حیدر آباد

ردا کے قارئین و رائٹرز کے نام  
دل و جان سے عزیز صالحہ اپیا جی السلام  
علیکم! آپ تو چچ میں منفرد ہیں۔ میں آپ کی  
دل سے Respect کرتی ہوں۔ اینڈ آل  
اشاف نورین آپ کی سب کو دل کی اتھاہ  
گہرائیوں سے عید مبارک ہو۔ تمام سینئر اینڈ  
جونیئر نئے لکھنے والے جو کسی مصروفیت کی وجہ  
سے اس ماہ نہیں شامل ہو سکے جو خاموش قاری  
ہیں سب کو عید مبارک ہو۔ امید واثق تعالیٰ ہے  
کہ دن اور رات امن و سلامتی صحت و تندرستی نئی  
امنگوں، نئے سپنوں کو چمکاتے گزریں۔ نئے  
پھولوں کی کھلاہٹ ساہر منظر جگمگائے ہمارے  
گھروں میں۔ (آمین)۔ جو مجھے پڑھتے ہیں  
پسند کرتے ہیں میں سچ میں دل کی اتھاہ  
گہرائیوں سے ان کی شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ  
سب کو کامیابی عطا کرے۔ خصوصاً (ریمانور)  
آپی کی میں دل سے شکر گزار ہوں انہوں نے  
سینئر اعلیٰ لکھنے والوں میں مجھ جیسی ادنیٰ رائٹر کو  
بھی یاد رکھا۔ (سچ میں ریما باجی)

I Love you and thank  
you so much.

Allah bleuse u.

ہماری سینئر رائٹر بہت ہیں۔ شازیہ آپ کی تو  
ٹاپ آف دی لسٹ ہی رہتی ہے ماشاء اللہ زور  
قلم اور زیادہ۔ روشانہ عبدالقیوم، ربیعانہ تخیلیق  
کار ہیں آفتاب جی بہترین نقلی ہے آپ کو۔  
ایک خاموش قاری ہے۔

جیون ساتھی کے نام

میرے جیون ساتھی ساتھ نبھائیں گے  
ہماری روحوں کو سہرا بکرجائیں گے  
جب بھی خودی ستائے چندہ کشمش نظر آئے  
دھیرے سے گداز لہوں۔  
پیار کی مٹھاس جگائیں گے  
مانا نا پرست ہوں پر ہوں وفادار  
گرفت میں تیری سما کے  
چھاتی پہ تیری سر اپنا نکائیں گے  
میرے نام کے لگا کر بوئے مہندی کے  
اس پر کشن نام  
کے تیرے چڑھائیں گے  
کشتنا بھرے ہاتھ  
کانوں کی لوسک لے جائیں گے  
پھر احساس محبت دلائیں گے  
برکھاتی شام کی یون رت کی بدلیاں  
میرے جیون ساتھی جب بھی روٹھ جاؤ  
محض اک فریاد کرنا  
ہر انداز سے منائیں گے  
ہم اپنی محبت کو ہم

Happy Birthday R.G

مہکان علی - کراچی

اپنی زندگی کے نام

جب بادل خوب صورت ہو  
جب ہوا کے سنگ خوشبو آتی ہے  
جب رات کے آخری پہر چاندنی  
چاند کے سنگ شرماتی ہے  
بادلوں کے اوٹ میں چھپ چھپ کر  
نکل آتی ہے

میں عاجزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لہٰذا غزل آبی میزی بہنوں جیسی ہیں۔ ان سے بات کر کے دل کو بہت سکون ملتا ہے اور ماشاء اللہ سے اب تک لہٰذا غزل آبی کی متعدد دھریں منظر عام پر آچکی ہیں۔ میری دوست آیت آصف کو جب سے ڈاکٹروں نے جواب دیا ہے تب سے میں اس کے لیے بے حد فکر مند ہوں۔ پٹانٹس سی اور آخری ایچ! اس خبر نے مجھے بہت حساس کر دیا ہے۔ آپ سب پڑھنے والوں سے دعاؤں کی درخواست ہے۔ صبا جلال بھی بہت خوب لکھتی ہے اور مجھے اچھا لگتا ہے کہ جب وہ ہر روز صبح مجھے صبح بخیر کا پیارا سامیج بھیجتی ہے۔ اب ذکر کروں گی اس معزز ہستی کا جس نے مجھے شاعری پیش کروانے کا مشورہ دیا تھا اور وہ پیارا سا نام ہے رائٹرز ہت جیسں ضیاء آبی۔ ان کی لکھائی بہت خوب صورت ہے اور زہت آبی کا حسین سا آٹو گراف میرے پاس موجود ہے۔ سباس گل آبی کے قلم میں جو جادو ہے وہی جادو ان کے اخلاق میں بھی ہے جو ایک بار ان سے بات کر لے ان کا گردیدہ ہو جاتا ہے۔ اب میں مزید جو خاص نام لکھنے جارہی ہوں وہ سب بھی بہت خاص ہیں اور مجھے آخری سانس تک یاد رہیں گے۔ نادیہ احمد، سارہ خان، سحرش فاطمہ، ریمانور رضوان، شاعرہ کنول خان، جیاز بیری، صدف آصف، آمنہ حسن، مایین خان، دانیا آفرین امتیاز، سعدیہ عابد، ناہید اختر بلوچ، کشف بلوچ، انعم عباس، بشری ایوب خان، صائمہ قریشی، جہانہ آفتاب، طیبہ عنصر، منہا آرائیں، ماہ نور شاہ اور ان کے علاوہ بھی بہت سے نام ہیں اگر کوئی نام رہ گیا تو

پیارے ردا کی تمام پیاری رائٹرز اور پیاری قارئین سہیلیوں کے نام اگر کسی کے پاس کچھ ہو تو دینا جلتی ہے اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو دینا ہستی ہے ہمارے پاس آپ کے لیے دعا ہے جس کے لیے دنیا ترستی ہے اللہ تعالیٰ آپ سب کو نام میں، کام میں، گھر میں، عزت میں، صحت میں، زندگی میں، حلال مال میں ہمیشہ خیر و برکت عطا فرمائے اور آپ سب پیاریوں کو ہمیشہ تندرست اور سلامت رکھے، اس عید پر (آمین)۔

اینہ رؤف، مصباح مسکان رؤف۔ جہلم

دوستوں کے نام

السلام علیکم! امید ہے ردا فیلی سے منسلک تمام افراد خیریت سے ہوں گے۔ اللہ پاک سب کی عبادات قبول فرمائے اور رمضان کریم کے بابرکت مہینے کے صدقے ہماری تمام خطائیں معاف کر دے، آمین۔ بخارہ، فلو اور کھانسی کے باعث میری طبیعت کافی نامساں ہے لیکن جس طریقے سے تمام دوست احباب نے میری خیریت پوچھی اور بے شمار دعاؤں کے تحفے دیئے مجھے یقین واثق ہے کہ میں انشاء اللہ بہت جلد صحت یاب ہو جاؤں گی۔ میں دوستوں کی محبتوں کی ہمیشہ مقروض رہوں گی۔ میری بہترین دوست اما نیہ سردار خان جو کہ ایک بہت اچھی رائٹر بھی ہے۔ میری خاموشیوں کو بھی سن لیتی ہے۔ میں کب اداس ہوتی ہوں اسے معلوم ہو جاتا ہے۔ رائٹرز عشنا کوثر سردار کی بھی جتنی تعریف کی کم ہے۔ بے پناہ مقبولیت کے باوجود ان کی طبیعت



معذرت کیونکہ پیغام کافی طویل ہو رہا ہے۔  
سیدہ عروج فاطمہ۔ ملتان

### ردا کے رائٹرز کے نام

عید کے اس پر مسرت موقع پر میری جانب سے ردا کی تمام رائٹرز و قارئین کو عید کی خوشیوں بھری ساعتیں مبارک ہوں اور میری دعا ہے کہ یہ عید سب کے لیے بہت سی خوشیاں لے کر آئے، آمین۔

حناعلیٰ۔ ملتان

### قمر و ش اور شاز یہ مصطفیٰ کے نام

قمر و ش آپ کی اور شاز یہ آپ کی آپ دونوں میری فیورٹ رائٹرز ہیں۔ آپ کے سلسلے وار تمام ناولز میں نے پڑھ رکھے ہیں اور بہت سے کرداروں سے مجھے دلی وابستگی اور محبت ہے۔ آپ دونوں بہت خوب صورت لکھتی ہیں میری جانب سے عید مبارک ہو۔

دھنک ناز۔ کراچی

### رائٹرز و قارئین کے نام

تمام ردا رائٹرز و قارئین کو میرا پیارا بھرا سلام الفت اور عید کی ڈھیروں مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ عید آپ سب کے لیے بہت سی خوشیاں اور برکتیں لائی ہو اور آپ سب سدا ہنسی مسکراتی اور خوش رہیں، آمین۔  
نور بانو۔ کوئٹہ

### گھر والوں کے نام

امی، ابو اور اربیبہ علی کو میری جانب سے عمرے کی سعادت حاصل کرنے کی بہت بہت مبارک باد۔ اللہ سے دعا ہے کہ جلد ہی آپ

لوگ حج پر بھی جائیں، آمین۔ میں نے آپ سب کو بہت مس کیا اور ریان بھی نانو، نانو کرتا رہا ہر وقت۔ انشاء اللہ عید کے بعد میں چکر لگاؤں گی۔ آپ سب کو عید کی بھی بے حد مبارک باد۔ اللہ پاک میرے میکے کی خوشیوں کو ہمیشہ سلامت رکھے، آمین۔

فریحہ شہروز۔ ملتان

### ردا کے دوستوں کے نام

میں ہمیشہ ردا کے پیغام کے سلسلے کو بہت دلچسپی اور شوق سے پڑھتی ہوں۔ بہت دل چاہتا ہے آپ سے دل کی باتیں کرنے اور ملنے کا۔ سب رائٹرز اور قارئین نے جس طرح ردا کو سجایا سنوارا ہے یہ ایک بہت ہی قابل تحسین بات ہے مگر اس میں سب سے اہم شخصیت صالحہ آپ کی ہے جنہوں نے ہم سب کو یہ خوب صورت پلیٹ فارم دیا۔ جہاں ہم سب اپنی اپنی بولیاں بولیں۔ (ہالیا)۔ خیر جی بنڈل آف ٹھیکس۔ افشاں علی، گیتی آراء، فریدہ فرید، رابعہ افضل، ریمانور، فرح ناز، ثناء کنول کے آپ سب لوگ نہ صرف مجھے یاد رکھتی ہیں بلکہ میری آراء کو اہم بھی جانتی ہیں ورنہ مجھ ناچیز میں کچھ بھی خاص نہیں یہ سب آپ لوگوں کی محبت اور خلوص ہے۔ آپ سب خود اتنی پیاری ہیں کہ میرے دل سے بے ساختہ آپ سب کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ خوش رہیے اور سدا مسکراتی رہیے۔

عانہ نیازی۔ ربوہ

☆.....



## شاعی کلڑے رنگین سویوں کے ساتھ

اجزاء

|                    |             |
|--------------------|-------------|
| رنگین سویاں        | : ڈیڑھ کپ   |
| دودھ               | : ایک لیٹر  |
| چینی               | : آدھا کپ   |
| بادام، پستہ (کترے) | : حسب ضرورت |

ڈبل روٹی کے سلائس : آٹھ عدد

تیل یا مکی : تلنے کے لیے

چینی : آدھا کپ

پانی : آدھا کپ

ترکیب: دودھ کو ابال لیں اور چینی اور سویاں ڈال کر پکائیں۔ سویاں نرم ہو جائیں تو چولہا بند کر دیں اور ڈش میں نکال لیں۔ ڈبل روٹی کو حسب پسند ہیپ میں کاٹ کر تل لیں۔ چینی میں پانی ڈال کر پکائیں کہ چینی گھل جائے۔ اب تلے ہوئے سلائس تیرے میں ڈال رک نکال کر سویوں پر رکھیں۔ سلائس پر گھویا، بادام، پستہ رکھ کر پیش کریں۔

## سویوں کا زعفرانی زردہ

اجزاء

|                    |            |
|--------------------|------------|
| سویاں              | : ایک پیکٹ |
| مکی                | : آدھا کپ  |
| الاجچی (پکلی ہوئی) | : چھ عدد   |
| چینی               | : ایک کپ   |

دودھ : ایک کلو

(پکا کر گاڑھا کر لیں)

کھویا : ایک پاؤ

زعفران : ایک چائے کا چمچ

زعفرانی پسنس : آدھا چائے کا چمچ

زعفرانی رنگ : ایک چٹلی

ترکیب: ایک کڑاہی میں مکی گرم کریں۔ الاجچی ڈالیں پھر سویوں کو ڈال کر ہلکی آگ پر بھجھیں۔ اب چینی، زعفران، زعفرانی پسنس، دودھ ڈال کر مکس کریں اور پانچ منٹ پکائیں۔ اب کھویا مکس کر دیں اور دم پر رکھ دیں۔ سویاں الگ الگ ہو جائیں تو زعفرانی پسنس، ناریل، کشش مکس کر دیں اور ڈش میں نکال لیں۔ کھوئے، پستہ، بادام، ناریل، کشش سے سجاوٹ کر دیں۔

## کشمش ڈنڈ کریم ہافس

اجزاء:

|                   |                        |
|-------------------|------------------------|
| ہاف پیسٹری کا آٹا | : ایک پاؤ              |
| کشمش ڈنڈ کریم     | : آدھی پیالی           |
| تازہ دودھ         | : آدھا کلو + ایک پیالی |

چینی : آدھی پیالی

تازہ کریم : ایک پیالی

بادام، پستہ (باریک) : آدھی پیالی

(کٹے ہوئے)

ترکیب: آٹے کو بیلنس اور اسے کون کے سانچے پر پٹینیں۔ اس عمل کو دہراتے ہوئے 6 کوئیں تیار کریں۔ انہیں بیکنگ ٹرے میں رکھیں اور پہلے سے گرم اودن میں 180 سینٹی گریڈ پر 15 منٹ پکا کر نکال لیں۔ تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے تو کون کو سانچے سے علیحدہ کر لیں۔ ایک پیالی دودھ میں کسٹرڈ پاؤڈر گھولیں۔ باقی دودھ دیہتی میں ڈال کر ابالیں، اس میں چینی شامل کریں، چینی حل ہو جائے تو چھچھلاتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کسٹرڈ پیسٹ ملائیں، آمیزہ گاڑھا ہونے لگے تو کریم ملا کر پھینٹیں، پھر ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ کسٹرڈ کے آمیزے کو پیچھے کی مدد سے کونوں میں بھریں اور بادام اور پستے چھڑک کر پیش کریں۔

### دودھ سویاں

اجزاء

سویا : ایک کلو کا پیکٹ

دودھ

: دو گلو

چینی

: حسب ذائقہ

کھی

: آدھا پاؤ

سبز الائچی کے دانے : چائے کا ایک چمچ

بادام

: دس بارہ عدد

کھویا

: ایک پاؤ

ترکیب: دودھ کو ابالیں، کھویا بھون لیں، چینی کا قوام تیار کر لیں۔ کھی میں الائچی ڈال کر کڑکرائیں اور اس میں سویاں ڈال کر سرخ کر لیں، پھر اس میں چینی کا قوام ڈالیں، ساتھ دودھ اور کھویا بھی ڈال دیں۔ دودھ خشک ہو جائے تو بادام کاٹ کر ڈال دیں۔ گرم گرم نوش فرمائیں۔

### بیف دم بریانی

اجزاء

: ایک کلو

بیف

اجزاء

چکن

: ایک کلو (درمیانے نکلے

کاٹ لیں)

چاول (بھگولیں) : تین پاؤ  
آئل : حسب ضرورت  
نمک : حسب ذائقہ  
میرینیشن کے لیے :

دہی : ایک پاؤ  
خشخاش : ایک کھانے کا چمچ  
لیموں کا رس : ایک کھانے کا چمچ  
نمک : ایک کھانے کا چمچ

ہر ادھیا (چوڑی) : ایک کھانے کا چمچ  
پودینہ (چوڑی) : ایک کھانے کا چمچ  
کچا پیٹا پیسٹ : دو کھانے کے چمچ  
سرخ مرچ پاؤڈر : دو کھانے کے چمچ

سفید مرچ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ  
ادرک بسن پیسٹ : دو چائے کے چمچ  
جائفل : پون چائے کا چمچ  
آئل : حسب ضرورت

ہری مرچ (کٹی ہوئی) : چار عدد

پیاز (فرائیڈ) : ایک عدد

ترکیب: میرینیشن کے تمام اجزاء ایف پر لگا کر کم از کم 6 گھنٹے تک میرینٹ کریں۔ پھر پانی ڈال کر ہلکی آگ پر گھلا لیں۔ چاولوں کو ابلتے ہوئے پانی میں نمک اور 1 کھانے کا چمچ آئل شامل کر کے تھوڑا گل جانے تک ابالیں پھر جھان کر الگ کر لیں۔ ایک بڑی دیہی میں آئل لگا کر گوشت پھیلائیں اور اوپر ابلے ہوئے چاول ڈال کر ہری مرچ، ہر ادھیا، پودینہ اور فرائیڈ پیاز چھڑک کر 10 منٹ کے لیے ہلکی آگ پر پکے دیں۔ تیار ہونے پر گرم گرم سرور کریں۔

### گرہی چکن

انڈے

: دو عدد (نمک مرچ ملا کر

پھینٹ لیں)

میدہ

: ایک کپ

نمک

: حسب ذائقہ

پھیریکا

: ایک چائے کا چمچ

خنگ سانچ

: آدھا چائے کا چمچ

سرخ مرچ کٹی ہوئی

: آدھا چائے کا چمچ

لہسن، اورک پیسٹ

: ایک چائے کا چمچ

آئل

: فرائی کے لیے

سرکہ

: دو کھانے کے چمچ

ہلدی پاؤڈر

: ایک چائے کا چمچ

ترکیب: چکن کو دھو کر ایک پیالے میں ڈالیں اس

میں نمک، سرخ مرچ، لہسن، اورک پیسٹ، سرکہ،

ہلدی پاؤڈر ڈال کر خوب اچھی طرح مکس کر کے دس

پندرہ منٹ تک ایک طرف رکھ دیں۔ اس کے بعد

گوشت کو چاول چھاننے والی چھتی میں ڈال کر بیس

بیس منٹ کے لیے رکھ دیں تاکہ گوشت کا سارا پانی

نظر جائے۔ ایک پلاسٹک بیگ میں سیاہ مرچ پاؤڈر،

پھیریکا، خنگ سانچ ڈال کر مکس کریں۔ گوشت کے

فلٹروں کو ایک ایک کر کے پہلے سے گرم آئل میں ڈال

کر ڈیپ فرائی کریں اور گولڈن براؤن ہونے پر نکال کر

چکن پیپر پر رکھ کر اضافی تیل جذب کر لیں اسی طرح

ایک ایک کر کے گوشت کے تمام فلٹروں کو کوٹ کرتے

ہوئے ڈیپ فرائی کر لیں۔

### کباب بریانی

اجزاء

گائے کا قیمہ

: آدھا کلو

پسا ہوا گرم مصالحہ سفید

: ایک، ایک چائے کا چمچ

زیرہ

پسا ہوا لہسن اورک

: ایک کھانے کا چمچ

پياز (پسی ہوئی)

: ایک عدد

اجزاء

: آدھا کلو

پياز (تلی ہوئی)

: دو کھانے کے چمچ

خشخاش، بجھے ہوئے پننے

: دودھ چائے کے چمچ

پسی ہوئی لال مرچ نمک

: ایک، ایک چائے کا چمچ

چاول (ابلے ہوئے)

: آدھا کلو

مصالحے کے اجزاء:

پسا ہوا لہسن اورک

: ایک کھانے کا چمچ

پسی ہوئی لال مرچ سفید زیرہ

: ڈیڑھ ڈیڑھ چائے کا چمچ

دہی، پياز (تلی ہوئی)

: ایک، ایک پیالی

ناریل کا دودھ، ہر ادھیا

: دو کھانے کے چمچ

جاوڑی، جائفٹل، جھوٹی

: پون پون چائے کا چمچ

الاچھی (پسی ہوئی)

زردے کا رنگ

: ایک چمکی

ہری مرچیں (بادیک کٹی ہوئی)

: چار عدد

نمک

: ایک چائے کا چمچ

تیل

: آدھی پیالی

ترکیب: چو پر میں قیمہ، کچی اور تلی ہوئی پياز،

لہسن اورک، گرم مصالحہ، زیرہ، خشخاش، پننے، لال

مرچ اور نمک ملا کر یکجان کر لیں۔ پس آمیزے کے

چھوٹے چھوٹے کباب بنالیں۔ دہی میں تیل گرم

کریں، اس میں پياز، لہسن اورک اور تھوڑا سا پانی

ملا کر بھونیں۔ مسلسل چمچ چلاتے ہوئے لال مرچ،

دہی، جائفٹل جاوڑی، الاچھی، پياز، ادھیا، ناریل کا

دودھ اور نمک ملائیں۔ ابال آگے لگے کباب تہہ کی

طرح سے رکھ دیں۔ ایک دہی میں پون پیالی

پانی، پون پیالی تیل، آدھا کلو چاول، کباب کا

مصالحہ، ہر ادھیا، ہری مرچیں، پانی چاول، زردے

کا رنگ اور کیوڑے کی تہہ لگا میں اور دم پر رکھ

دیں۔ اسے احتیاط سے ڈش میں نکالیں اور گرم گرم

پیش کریں۔

پانی، پون پیالی تیل، آدھا کلو چاول، کباب کا

# منگیار

ہے جب موسم تبدیل ہوتا ہے تو ایسے میں ہاتھوں اور ناخنوں کو معمول سے زیادہ نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ موسم سردی کا ہو یا گرمی کا دوسروں کی نظر آپ کے ہاتھوں اور ناخنوں پر ضرور پڑتی ہے۔ ہاتھوں اور پیروں کی خوب صورتی کو بڑھانے کے لیے ہاتھوں کو دھونے سے پہلے ہمیشہ کولڈ کریم یا ماسچر انزرا استعمال کریں۔ ہفتے میں دو بار ہاتھوں پر کیمریوں کا رس ملیں۔ دس منٹ سادہ پانی سے ہاتھ دھوئیں اور ہینڈ لوشن لگائیں اس سے ہاتھوں کی جلد صاف اور ملائم ہو جاتی ہے۔ جب بھی آپ کو فرصت کے اوقات ملیں اپنی انگلیوں کو اس طرح حرکت دیں جیسے آپ ٹائپ کر رہی ہیں یہ ورزش ہاتھوں کی لچک برقرار رکھنے کے لیے بہترین ہے۔

## بالوں کو خشکی سے بچائیں

بال خشک ہوں تو نہ صرف روکھے پھیکے اور بے جان لگتے ہیں بلکہ کمزور ہو کر گرنا اور ٹوٹنا بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ سر کی جلد میں ایسے گلینڈز ہوتے ہیں جو جلد اور بالوں کو قدرتی نمی فراہم کرتے ہیں جس سے بال چمکدار اور صحت مندرہتے ہیں اگر کسی وجہ سے یہ گلینڈز ٹھیک کام کرنا چھوڑ دیں تو خشکی پیدا ہونے لگتی ہے۔ سرد موسم میں عام طور پر خشکی کی شکایت زیادہ ہو جاتی ہے جس کی بہت سی وجوہات ہیں تاہم ٹھوڑی محنت اور احتیاط سے بالوں کو خشکی سے بچایا جاسکتا ہے۔ زیادہ گرم پانی سے سر دھونا خشکی کی ایک بڑی وجہ گلینڈز ٹھیک کام کرنا چھوڑ دیں تو خشکی پیدا ہونے لگتی

## ہلدی اور لیموں سے جلد کی حفاظت

آج کل خواتین ہلدی اور لیموں کے مساج سے اپنی جلد کو بہترین غذا نیت مہیا کرتی ہیں جس سے ان کی جلد چمک دار اور نرم و ملائم ہو جاتی ہے۔ ایسی جلد ہر قسم کے دانوں سے محفوظ رہتی ہے۔ ہلدی سے چہرے پر مساج کرنے سے چہرے کا رواں ختم ہو جاتا ہے اور تھریڈنگ کی ضرورت نہیں پڑتی اس کے علاوہ رنگت الگ نکھر آتی ہے۔ جلد سے بالوں کا خاتمہ کرنے کے لیے ویکس بھی چینی اور لیموں کو ایک خاص مقدار میں مکس کر کے تیار کی جاتی ہے۔ بیسن کا بھوسا اور آٹا بھی جلد کی گلینڈز تک میں بے حد کارآمد ثابت ہو رہے ہیں۔ ان قدرتی اشیا کو استعمال کرنے سے جلد کی کم عمری اور صحت و کشش میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب کہ صابن اور دیگر مصنوعی اشیاء کی پروڈکشن مارکیٹ میں ملتی ہیں اور انہیں گھر پر بھی مختلف طریقوں سے تیار کیا جاسکتا ہے۔ شہد کے مساج سے چہرے کی رنگت ایسی نکھرتی ہے کہ آپ کو بیوی پارلر جانے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

## ہاتھوں اور پیروں کی حفاظت

خوب صورت ہاتھ اور پاؤں آپ کی شخصیت کو پرکشش بناتے ہیں۔ چہرے کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں کی خوب صورتی بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ہاتھوں کی جلد بہت حساس ہوتی

## ہاتھوں اور پیروں کی حفاظت

نہ کرنا، زائد البعد کا سیمینکس کا استعمال اور مناسب حفاظت نہ کرنا شامل ہے۔ آنکھوں کی حفاظت کے لیے دامن اے، بی اور سی کا استعمال بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ دودھ، مکھن، مچھلی، انڈے کی زردی، گاجر، ٹماٹر، آم اور پیتا بھی آنکھوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ خوامین اپنی آنکھوں کی دیکھ بھال کس طرح کرتی ہیں اس کا اندازہ ارد گرد کی جلد آنکھوں کی چمک دھوبو صوری اور عمومی صحت سے ہو جاتا ہے اگر آپ اپنی آنکھوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں یعنی انہیں نہ صرف دھوئیں بلکہ گرد و غبار سے بھی بچا کر رکھیں تاکہ آنکھوں کی چمک اور خوب صوری برقرار رہے۔ آنکھوں کے ارد گرد کی جلد پورے پیرے کی جلد سے زیادہ پتلی اور نازک ہوتی ہے اور اس میں آئل گلیٹنڈ پھیلے ہوتے ہیں ان کی صحت کے لیے اچھی کریم استعمال کی جاسکتی ہے جس کے استعمال سے اس حصے کی جھریاں خاصی حد تک ختم ہو جاتی ہیں۔

### جھانپائیاں ختم کرنے کا گھریلو نسخہ

سیپوں کا سفوف ایک چائے کا چمچ، عرق گلاب ایک چائے کا چمچ، لمبوں کا رس آدھا چائے کا چمچ، ہلدی پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ۔ سیپوں کو گرم پانی سے دھو کر صاف کر لیں۔ پھر انہیں گرائنڈر میں ڈال کر اچھی طرح پین کر سفوف بنالیں۔

طریقہ استعمال: تمام اشیاء کو اچھی طرح ملا کر آمیزہ تیار کر لیں۔ رات کو سوتے وقت اسے اپنے چہرے پر لگائیں اور صبح اٹھ کر اچھی طرح دھو لیں اگر دن میں استعمال کرنا چاہیں تو کر لیں۔ ہر دفعہ دس منٹ کے لیے لگائیں۔ یہ نسخہ نہ صرف جھانپائیوں کے لیے ہے بلکہ اس سے داغ دھبے بھی دور ہو جائیں گے۔ ☆

ہے، کوشش کریں کہ نیم گرم پانی سے نہائیں، زیادہ گرم پانی بالوں کے لیے مناسب نہیں۔ سردیوں میں کم پانی کا استعمال اور پسینہ نہ آنا بھی بالوں میں خشکی کی بڑی وجہ ہے۔ اس مسئلے پر بھی قابو پانا چاہیے اس کے علاوہ ہفتے میں دو بار کسی اچھے آئل کے ساتھ سر کا مساج ضرور کریں۔ شیمپو ہفتے میں صرف دو بار استعمال کریں اور شیمپو کرنے کے بعد کنڈیشنر ضرور لگائیں۔ سرسوں کا تیل، دہی اور انڈے بالوں کے لیے مفید ہے۔ ایک برتن میں دو چمچ سرسوں کا تیل، تین چمچ دہی اور ایک انڈے کی زردی اچھی طرح مکس کر لیں اور اس آمیزے کو بالوں کی جڑوں میں لگائیں، گھنٹے بعد سر دھو لیں۔ ہر ہفتے میں ایک بار ایسا کریں تو ایک ماہ کے بعد خشکی سے مکمل نجات مل جائے گی۔ اس کے علاوہ بالوں میں کبھی کریم بھی انہیں خشکی سے محفوظ رکھتا ہے۔ بالوں میں کبھی کرنے سے جلد میں دوران خون بڑھ جاتا ہے جس سے چکنائی پیدا کرنے والے گلیٹنڈ بھی حرکت میں آجاتے ہیں اور یوں بالوں تک مناسب مقدار میں چکنائی پہنچتی رہتی ہے۔ کبھی کرنے کے لیے موٹے دندانون والی کبھی استعمال کرنی چاہیے اور اسے سر میں کچھ دیر کے لیے تیز تیز رگڑنے کی بجائے پندرہ منٹ تک بلکہ ہاتھ سے کرنا چاہیے، روزانہ ایسا کرنے سے بال جلد ہی صحت مند لگنے لگیں گے۔

### آنکھوں کی صحت اور دلکشی

آنکھوں کی صحت اور دلکشی حسن کو نکھار دیتی ہے۔ آنکھوں کی خوب صوری کے بارے میں شعراء نے بہت کچھ کہا ہے تاہم تھوڑی سی توجہ سے آنکھوں میں نکھار پیدا کیا جاسکتا ہے۔ خواتین کو آنکھوں سے متعلق کئی مسائل درپیش ہوتے ہیں جن کی بنیادی وجوہات میں درست طریقے سے میک اپ صاف